THE REAL WEALTH OF NATIONS

BY RIANE EISLER

قوموں کی اصل دولت

نئے معاشی نظام کی تشکیل کی طرف ایک قدم

ریان آئسلر

ترجمہ: پروفیسر حنیف کھوکھر

مشعل

فہرست

	توجہ کی ضرورت	5
باب اول	معاشی نظام میں تبدیلی کیوں ضروری ہے؟	13
باب دوم	معاشیات ایک وسیع تناظر میں	36
باب سوم	توجہ ونگہداشت کے فائدے............ڈالروں میں	61
باب چہارم	دہرا معیار	90
باب پنجم	نقطوں کا اتصال	116
باب ششم	تسلطی معاشیات	147
باب ہفتم	شراکتی معاشیات	176
باب ہشتم	ٹیکنالوجی، محنت اور بعد الصنعتی دُنیا	207
باب نہم	ہم کون ہیں اور کہاں کھڑے ہیں	234
باب دہم	ہم تبدیلی کیسے لا سکتے ہیں؟	267
	حرف تشکر	269
	مصنفہ کا تعارف	298
	مرکز برائے مطالعات مشارکت	301

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

توجہ کی ضرورت

میری پوری زندگی ایک جستجو سے عبارت ہے۔ اس جستجو کا آغاز اس وقت ہوا جب ہمیں نازیوں کے خوف سے اپنے آبائی وطن ویانا سے ہجرت کرنا پڑی۔ یہ جستجو ہوانا کی ان مفلوک الحال مہاجر بستیوں میں رہتے ہوئے بھی میرے ذہن و قلب پر چھائی رہی جہاں ہم پناہ گزینوں کی حیثیت سے پہنچے اور پھر امریکہ میں بھی جہاں میں پلی بڑھی۔ آپ پوچھیں گے کہ یہ جستجو آخر تھی کس چیز کی؟ میری روح کو صرف اس بات کی جستجو تھی کہ آخر کیا وجہ ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے معاشرے میں کہ جس کے خمیر میں خدمت، محبت، آگہی اور اختراع کے گُن اس قدر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں، اس قدر ظلم و جبر، بے حسی اور تخریب و فساد کیسے در آتے ہیں؟

میری اس جستجو نے مجھے سارے جہاں کی سیر کرا دی۔ میری روح نے کیا کیا دشت نوردیاں نہ کیں۔ کبھی میں نے تاریخ و نفسیات و اثریات کا دروازہ کھٹکھٹایا تو کبھی ادب و سیاست اور معاشیات کے پانیوں میں غوطہ زن ہوئی لیکن میں جہاں بھی گئی، لوٹی تو معاشیات کے پاس ہی آئی۔ انجام کار میرا ذہن اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر ہمیں اپنی، اپنے بچوں اور آنے والی نسلوں کی بقا و بہبود مطلوب ہے تو ہمیں موجودہ معاشی نظام کو بدلنا ہوگا۔

پھر یوں ہوا کہ وقت کا دھارا مجھے جوانی کی دہلیز تک لے آیا۔ میری شادی ہوئی، میرے ہاں بچے ہوئے، میرے بچوں کے بچے ہوئے اور میں دادی بن گئی لیکن اس سارے عرصے کے دوران میری جستجو بھی آگے سے آگے بڑھتی رہی اور معاشیات کے ساتھ میرے عشق میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

جب میں اپنے پوتوں کی جانب دیکھتی تھی تو میرے ذہن میں ہمارے اس کرہ ارض پر

بسنے والی لاکھوں وہ معصوم صورتیں بھی در آتی تھیں جو اس دنیا میں زندگی' شفقت اور خوشی کی آس لے کر آتی ہیں مگر پھر دکھ' افلاس اور بیماری سے سسک سسک کر بے وقت اور بے رحم موت کا نشانہ بن جاتی ہیں۔ جب مجھے ہمارے براعظموں کے بیچوں بیچ پھیلے اتھاہ سمندروں کے حسن کا خیال آتا تھا اور جب میں ان سمندروں کے کناروں پر آباد خوبصورت شہروں کا تصور کرتی تھی تو معاً میرے ذہن میں موجودہ دور کے معاشی قوانین سے لاحق ہونے والے موسمی تبدیلیوں کے خدشات بھی منڈلانے لگتے تھے۔ رفتہ رفتہ میری اردگرد کی دنیا میں پھیلے ارضی حقائق سے شناسائی بڑھتی چلی گئی۔ میں نے ان گھرانوں اور ان گھرانوں سے وابستہ افراد کا تجزیہ کرنا شروع کر دیا جن کے پاس ایک دوسرے کے پاس بیٹھنے اور ایک دوسرے کے ساتھ دکھ سکھ کی بات کرنے کا وقت بھی نہیں ہوتا پھر میں نے ٹیکنالوجی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ وہ ٹیکنالوجی کہ جسے انسان کو خوشیاں دینے کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے تھا مگر جس سے الٹا انسانی زندگی میں ویرانی پیدا ہونے لگی ہے۔ وہ ٹیکنالوجی جس نے اچھے بھلے انسانوں کو بھی مہاجروں میں بدل دیا ہے اور انھیں دوسرے انسانوں سے اور خوشی سے دور کر دیا ہے۔ یہ سب سوچتے سوچتے جب میں رکی تو میں نے دیکھا کہ میرے قدم ایک بار پھر واپس معاشیات کی دہلیز پر پہنچ چکے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ ہماری دنیا میں جب تک غربت' افلاس اور تشدد باقی ہے، ہم میں سے کوئی بھی سکھ سے زندگی نہیں گزار سکتا اور کوئی بھی کسی محفوظ مستقبل کا تصور نہیں کر سکتا۔ میں نے محسوس کیا کہ موجودہ معاشی چلن ہمارے اس خوبصورت سیارے کو تباہی کے منہ میں دھکیل رہے ہیں اور اس کے حسن کو چاٹتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے ادراک ہوا کہ ہمارے ان مروجہ معاشی قوانین کے بھیتر میں کوئی ایسی کجی اور خامی ضرور ہے جس کی وجہ سے وہ انسان کے سب اہم کام کی مناسب طور پر قدر پیمائی سے قاصر رہے ہیں: یعنی توجہ واحساس کی قدر پیمائی سے۔ اس بے بہا کام کی قدر پیمائی سے جو کہ انسان خود پر دوسروں پر اور اپنی اس مادر ارض پر توجہ دیتے وقت اور ان کا احساس اور خیال کرتے ہوئے سرانجام دیتا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ میں نے معاشیات کے علم کو ایک مختلف زاویے سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میرے دل میں ایک ایسے معاشی نظام کی جستجو پیدا ہوئی جس میں مروجہ معاشی منہاجات کی ساری اچھی باتیں بھی موجود ہوں مگر جو ہم میں ان منہاجات اور ان کے

MashalBooks.com

مطلوبات سے بالا ہو کر سوچنے کی صلاحیت بھی پیدا کر سکے اور جو ہمیں جینے اور جیون کی ایک ایسی روش تک لا سکے جس پر گامزن ہو کر ہم انسان کی خارجی اور داخلی احتیاجات کے تقاضوں سے صحیح معانی میں عہدہ برآ ہونے کے قابل ہو سکیں۔ رفتہ رفتہ میرے دل میں یہ احساس بھی جاگزیں ہونے لگا کہ ہمیں معاشیات کے بارے میں ایک زیادہ فراخ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے یعنی ایک ایسا رویہ اپنانے کی ضرورت ہے کہ جو محدود نہ ہو بلکہ اس مضمون کے وسیع تر سماجی اور فطری سیاق و سباق کو بھی مدنظر رکھے۔

مجھے خوشی ہو گی اگر اس نئے انداز کی اقتصادی تحقیق میں آپ بھی میرے ساتھ شریک ہوں۔ اس کے لیے آپ کو فقط اپنے ذہن کی سلیٹ کو صاف کرنا ہو گا' یعنی اپنے آپ کو ان مفروضات سے آزاد کرانا ہو گا جنھوں نے ہماری نظر کو سکوڑ رکھا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم جن چیزوں پر بات کریں گے ماہرین معاشیات ان کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ معاملات معاشیات کے زمرے میں ہی نہیں آتے۔ میں آپ سے یہ درخواست بھی کروں گی کہ ان اوراق کو ملاحظہ کرتے ہوئے آپ اس بات کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں کہ آپ خود اپنے اندر کس طرح کی زندگی کی تمنا محسوس کرتے ہیں اور آپ اپنی زندگی میں کس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

آئندہ صفحات میں ہم معاشیات کا مشاہدہ ایک ایسے عدسے سے کریں گے جو ہم پر اس چیز کے امکانات منکشف کرتا ہے جسے میں نے متوجہ یا حساس معاشیات یا التفاتی معاشیات کا نام دیا ہے۔ میں نے لگی بندھی سوچ سے بالاتر ہو کر سوچا ہے اور مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ حساس اور معاشیات کے الفاظ کو ایک ہی فقرے میں ایک ساتھ استعمال کرنا بھی اکثر حکماء معاش کے نزدیک ایک بدعت سے کم نہیں۔ مگر کیا کریں۔ اس دَور کا تقاضہ ہی یہی ہے کہ اس طور کی بدعتیں کی جائیں۔ اس بدعت کا الزام ہمیں اپنے سر لینا ہی ہو گا۔

ان حالات میں جبکہ معیشت بہت تیزی سے عالمی رنگ اختیار کرتی چلی جا رہی ہے اور دنیا کے بڑے تجارتی ادارے کہ بین الاقوامی معیشت اور صنعت و حرفت جن کی مکمل گرفت میں ہے، تمام تر اخلاقی اقدار کو پس پشت ڈال کر اپنا کھیل کھیلنے میں مصروف ہیں' حساس معاشیات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت پہلے سے بھی کہیں زیادہ شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ زیر نظر کتاب میں معاشیات کے بارے میں ایک نئی سوچ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس

بات کا ایک نئے سرے سے جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ معاشیات کیا ہے اور اسے کیا ہونا چاہیے۔ اس تصنیف کو ایک ایسے نقطہ آغاز کے طور پر لیا جانا چاہیے جس کو بنیاد بنا کر معاشی ڈھانچے، اصول وقوانین اور حکمت عملیوں کو ازسرنو اس طرح تعمیر کیا جا سکتا ہے کہ جس سے ہماری مثبت صلاحیتوں کو جلا ملے اور منفی امکانات میں تخفیف ہو۔

میں نے اس کتاب کو ''اصل دولت اقوام'' کا نام اس لیے دیا ہے کہ یہ ہم پر اس راز کو عیاں کرتی ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ قابل قدر معاشی اثاثے مالی نہیں بلکہ ہماری انسانی برادری کی حقیقی دولت اور اس کا اصل سرمایہ بنی آدم کی محنت اور ہمارا قدرتی ماحول ہے۔ اس کتاب کو یہ نام دینے سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں ایڈم سمتھ کی شہرہ آفاق تصنیف ''دولت اقوام'' کی طرز پر اقتصادیات کے موضوع پر کوئی تجریدی یا تکنیکی تحریر قلمبند کرنے لگی ہوں۔ ہماری آج کی دنیا کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہمیں بہت سے مختلف شعبوں کے علم کو یکجا کرنا ہوگا۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے بھی اس کتاب کو ورطہ تحریر میں لاتے ہوئے متعدد معاشی اور سائنسی علوم سے اکتساب کرنے کی سعی کی ہے۔ میں نے چند ایسے عملی اقدامات بھی تجویز کیے ہیں جن کو عملی جامہ پہنا کر ہم اپنے نظام ہائے معیشت ومعاشرت کو ایک نسبتاً زیادہ مثبت ڈگر پر ڈال سکتے ہیں۔

میں نے اس تصنیف میں جو ایک نیا معاشیاتی تناظر متعارف کرانے کی کوشش کی ہے وہ میری تیس سالہ کاوش وتحقیق کا ثمر ہے اور میں نے اس میں سائنس کے ارتقائی منہاجات کا اطلاق معاشرتی نظاموں پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس دوران میرا واسطہ نظریہ خلفشار و پیچیدگی کے شارحین سے بھی رہا اور میں نے ہمارے معاصر دور کے حقیقی عالمی مسائل سے متعلق ان نئے انقلابی نظریات کو استعمال کرتے ہوئے بہت سی تحاریر بھی قلمبند کیں۔ میں نے اپنی تصانیف میں جن کا آغاز ''اصل دولت اقوام ...... ہماری تاریخ' ہمارا مستقبل'' سے ہوا، قارئین کو ایک نئی عینک پیش کرنے کی کوشش کی ہے جسے پہن کر ہم اپنے عمرانی نظاموں کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں اور اس بات کا تعین کر سکتے ہیں کہ ایک زیادہ عادل اور مستحکم دنیا کی بنیادیں کس طرح استوار کی جا سکتی ہیں۔ اس عینک کو ایک تجزیاتی تانے بانے کے روپ میں میری تمام تحاریر وتصانیف میں محسوس کیا جا سکتا ہے: ''شراکت'' یا نظام احترام باہم اور ''تسلط'' یا اوپر سے تلے کی جانب کنٹرول کا نظام۔ یہ عمرانی زمرے ثقافتی تغیر کے اس نظریے کا لازمی

جزو ہیں جنھیں میں پیشتر تصانیف میں پہلے ہی متعارف کرا چکی ہوں۔ یہ زمرے بیمار معاشی قوانین ومنہاجات کو سمجھنے اور ان میں تبدیلی پیدا کرنے کے اعتبار سے بھی اہم ہیں جوکہ اس نگارش کا منتہائے مقصود ہے۔

ایڈم سمتھ نے جب ''دولت اقوام'' تصنیف کی تو اس کی ساری توجہ بازار یا اگر اس کے اپنے الفاظ استعمال کیے جائیں تو ''بازار کے پیچھے کارفرما خفیہ ہاتھ'' پر تھی جسے وہ ضروریات زندگی کی پیداوار اور ان کی تقسیم کے لیے بہترین منہاج تعبیر کرتا تھا۔تاہم آپ کے زیر مطالعہ یہ تحریر معاشیات کا ایک وسیع تر تناظر میں ازسرنو جائزہ لینے کے لیے بازار سے ورا بھی جائے گی اور اس تناظر میں زندگی کو سہائتا دینے والی فطری' گروہی اور عائلی سرگرمیاں بھی شامل ہوں گی۔

مزید یہ کہ میں نے اس کتاب میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ایک ایسا معاشی نظام ترتیب دینے کے لیے کہ جو ہمیں درپیش مہیب مسائل کا مقابلہ کرنے میں ہماری مدد کر سکے ہمیں انسان اور فطرت کے لیے توجہ وفکرمندی کے عمرانی اور اقتصادی اعتبار سے انتہائی اہمیت کے حامل کام کو زیادہ اہمیت دینا ہوگی۔ اس کو زیادہ نمایاں مقام دینا ہوگا اور اس کی ہرممکن طریقے سے حوصلہ افزائی کرنا ہوگی۔ اس بات کو آپ اس تصنیف کا مرکزی خیال بھی قرار دے سکتے ہیں۔ فی الواقع اگر ہم اس بابت صحیح معنوں میں سوچ بچار کریں تو یہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لااخلاق بے حس معاشی پالیسیوں اور قوانین میں اس وقت تک کسی تبدیلی کی توقع عبث ہے جب تک کہ ہم توجہ واحساس کے حامل وظائف کو زیادہ اہمیت دینا شروع نہیں کر دیتے۔

آئندہ ابواب میں ہم ملاحظہ کریں گے کہ ایک زیادہ منصفانہ اور پائیدار معاشی نظام معاشی اور عمرانی منہاجات کے درمیان تعامل پر توجہ کا متقاضی ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ ایک ایسے آدرش کے حصول کے لیے ہمیں معاشیات کے روایتی تصور کو وسعت دینے کی ضرورت ہے۔

آغاز ہم اس مفروضے سے کریں گے کہ کسی بھی معاشی نظام کو انسانی معاشرے میں بہبود' راحت اور آسودگی کے فروغ کے لیے تشکیل دیا جاتا ہے۔ یہ وہ بنیادی بات ہے جسے محسوس ہوتا ہے کہ آج کے دور کے ماہرین معاشیات نے یکسر نظرانداز کر رکھا ہے۔ ازاں بعد ہم

معاشیات اور متعدد شعبوں کے بڑے مفکرین کے افکار وتحقیقات سے اکتساب کرتے ہوئے محنت' اقدار اور زندگی کے بارے میں نئی جہات دریافت کریں گے۔

باب اول میں قاری کو معاشی تعلقات و تعاملات کی اس تنگ گلی سے نکالنے کی کوشش کی گئی ہے جن کو روایتی معاشی منہاجات مثلاً سرمایہ داریت' اشتراکیت' اجتماعیت یا مراجیت وغیرہ بحث میں لاتے ہیں۔اس باب میں متوجہ معاشیات کی پہلی اساس پر بات کی گئی ہے۔ اس میں ایک مکمل معاشیاتی نقشہ آپ کے سامنے آئے گا جس میں زندگی کو سہائیتا دینے والے فطری' گروہی اور عائلی تفاعلات بھی شامل ہیں۔

باب دوم میں ہمارے اقتصادی تناظر کو توسیع دے کر اس میں اس کے وسیع تر ثقافتی سیاق وسباق کو بھی شامل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ سعی ہمیں متوجہ معاشیات کی دوسری اساس تک لے آتی ہے یعنی ان ثقافتی عقیدوں اور اداروں پر غور وفکر تک جو توجہ ونگہداشت کو قرار واقعی اہمیت اور وزن دیتے ہیں۔کتاب کے اس جزو میں شراکتی نظام اور تسلطی نظام کی معاشی ومعاشرتی اصطلاحات کو متعارف کرایا گیا ہے اور اس میں ایسے روابط وتعاملات کو عیاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن پر پہلے اتنی توجہ نہیں دی گئی۔ معاشی طور پر کسی چیز کی کیا قدر وقیمت ہے اور کیا نہیں اس سلسلے میں نئے اصول و معیارات تجویز کیے گئے ہیں۔ اس میں یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ سب عوامل ہماری زندگیوں پر اور ہمارے بچوں اور اس کرہ ارض کے مستقبل پر کیسے اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

موخر تین ابواب میں متوجہ معاشی نظام کی تین مزید اساسات کا تعارف دیا گیا ہے۔اول متوجہ معاشیات کے اصول وضوابط اور پالیسیاں' دوم اشتمالی اور درست معاشی مظاہر اور سوم وہ معاشی اور معاشرتی ڈھانچے جو تسلط کی بجائے شراکت کو فروغ دیتے ہیں۔

یہ ابواب ہماری روزمرہ زندگیوں' معاشیات اور ثقافتی اقدار و روایات کے نقاط کو ملاتے چلے جاتے ہیں اور قارئین کو بتاتے ہیں کہ متوجہ معاشی پالیساں کس طرح تحلیل اشکال' اختراع اور تجارت میں انسان کی معاونت کرتی ہیں اور ان سے کاروبار' تجارت' افراد اور ہمارے قدرتی ماحول کو کیسے فائدہ پہنچتا ہے۔ ان میں اس بعد الصنعتی معیشت کو مدنظر رکھتے ہوئے محنت اور پیداوار کی ازسرنو تعریف مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں افرادی سرمائے کو اہم ترین سرمائے کی جگہ دی جاتی ہے۔ پیداواریت کے ان نئے مقیاسات اور اشارات کی بات بھی کی

گئی ہے جو زندگی کو سہانا دینے والی فطری اور عائلی سرگرمیوں کے متغیرات کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان میں اس سرمائے کے تحفظ کے طریقے بھی تجویز کیے گئے ہیں جنھیں آج کل کے ماہرین اقتصادیات فطری سرمائے کا نام دیتے ہیں۔

دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ یہ ابواب ہمیں اپنے ماضی کی سیر بھی کراتے ہیں اور ہمیں ورثے میں ملنے والی بیمار اقدار و حکایات کا ازسر نو تعین کرنے میں بھی ہماری مدد کرتے ہیں۔ ان میں ان پوشیدہ جنسی دوہرے معیار کا بھی پردہ چاک کیا گیا ہے جو ہمیں بے انصافی اور معاشی زبوں حالی کے گزرے زمانوں سے ودیعت ہوا ہے۔ ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آج کے اس معاشی دوہرے معیار نے بھی اس جنسی دوہرے معیار سے ہی جنم لیا ہے جو کہ معاش ومحنت کے غیر پائیدار موجودہ منہاجات کے پیچھے کارفرما ہے۔ کتاب کا یہ حصہ اس بات سے بھی بحث کرتا ہے کہ ہم ان بیمار طور طریقوں کو صحت مند اور حیات آفریں روایات میں کیسے تبدیل کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد باب ششم میں جا کر ہم فرسودہ معاشی وسیاسی نظاموں کی انفرادی، سماجی، مالی اور ماحولیاتی قیمت کا جائزہ لیں گے اور ان نظاموں کی ہمیں درپیش گمبھیر چیلنجوں کا سامنا کر سکنے کی نااہلیت پر غور کریں گے۔ باب ہفتم میں اس بات کا مطالعہ ہوگا کہ ہم متوجہ معاشیات کو کیسے فروغ دے سکتے ہیں۔ اس باب میں جدید اقتصادی نظریات کا ان مخصوص حالات کے تناظر میں مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں یہ پروان چڑھے نیز ایک نئے تصوراتی ڈھانچے کی تشکیل کے لیے اساسی اصول پیش کیے گئے ہیں جس میں سرمایہ داریت اور اشتراکیت دونوں کے بہترین اصول شامل ہیں مگر جو ان دونوں سے ورا بھی جاتا ہے۔

باب ہشتم میں جدید ترین حرفتی پیش رفتوں مثلاً روبوٹ، بائیوٹیکنالوجی اور نیوٹیکنالوجی کو موضوع بنایا گیا ہے اور اس امر کا جائزہ لیا گیا ہے کہ وہ حیات ومعاش پر کیسے اثرانداز ہوتے ہیں۔ یہ باب صنعت وحرفت کا ایک نئے اور مختلف انداز نظر سے جائزہ لینے کی دعوت دیتا ہے اور گدھے، گھوڑے میں تمیز کا درس دیتا ہے اور اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ پیچ کس سے لے کر جوہری بموں تک کو ٹیکنالوجی کے ایک ہی ٹوکرے میں نہ ٹھونسا جائے۔ اس سے یہ بات ہویدا ہوتی ہے کہ اس بعدالصنعتی دور میں تیزی سے رونما ہونے والے حرفتی تغیرات کے تناظر میں متوجہ معاشیات پر توجہ دینے کی ضرورت میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے۔

باب نہم اس امر پر غور وخوض کے لیے مخصوص کیا گیا ہے کہ ہم کہاں ہیں اور انجام کار ہم کہاں اور کون سی منزل تک جا سکتے ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ عصبی سائنس کے حیرت انگیز نئے انکشافات سے استفادہ کرتے ہوئے اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ متوجہ معاشیات سے ان صلاحیتوں کو جلا دی جا سکتی ہے کہ جنھوں نے ہمارے ارتقائی سفر میں ہمیں ہمارا منفرد انسانی تشخص ودیعت کیا۔

اخیراً باب دہم میں چند ایسی عملی اقدامات تجویز کے گئے ہیں جنھیں ہم سب کو عملی جامہ پہنانے کی سعی کرنا چاہیے تا کہ ایک زیادہ مروت و مؤدت سے پرُ ماحول دوست اور معاشی طور پر خوشحال مستقبل کے خواب کو جلد از جلد شرمندہ تعبیر کی جا سکے۔

میں نے یہ کتاب ایک نئے مکالمے کی سلسلہ جنبانی اور انسانی معاشرے کی بہبود کے لیے کیے جانے والے عملی اقدامات کو مہمیز دینے کے لیے تحریر کی ہے۔ یہ تصنیف ہر اس شخص کے لیے ہے جس کے دل میں ایک بہتر زندگی اور ایک بہتر انسانی معاشرے کے لیے تڑپ موجود ہے اور جو ان اہداف تک رسائی کے لیے کسی عملی منہاج کا متلاشی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم مل کر ایک ایسا نیا معاشی نظام تشکیل دے سکتے ہیں جو حرص و تخریب کی بجائے جود وسخا اور تخلیق و اختراع کی آبیاری کرے۔ میرا ذہن کہتا ہے کہ ہماری تہذیب اور ہمارے سیارے کے ارتقاء کے اس نازک موڑ پر یہی ایک وہ قابل عمل راستہ ہے جس پر چل کر ہم اپنی منزل مراد پا سکتے ہیں۔

ریان آئسلر

جنوری 2007ء

باب اول

معاشی نظام میں تبدیلی کیوں ضروری ہے؟

جم کراس کمپیوٹر سائنس کے کورس میں اپنی پوری جماعت میں اول پوزیشن لے کر کامیاب ہوا مگر بے چارے کو پھر بھی کیلیفورنیا کی سلیکان ویلی' جہاں آج کل روپے پیسے کی بہت ریل پیل دیکھنے میں آتی ہے' میں کوئی ملازمت ہاتھ نہ آ سکی۔ یہ وہی سلیکان ویلی ہے جہاں کبھی لوگ پرکشش تنخواہوں کی تلاش میں جوق درجوق کھنچے چلے آتے تھے۔ اس علاقے میں بکری اور منافع کا گراف اب بھی (گزشتہ تین برس کے دوران پانصد فی صد سے زائد کی اوسط کے ساتھ) آسمانوں کو چھو رہا ہے مگر روزگار اور ملازمتوں کے مواقع کم سے کم تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

اب نائجیریا میں ایک منظر دیکھیے جہاں ماریان ابھی ابھی اپنے دوسرے کم سن بچے کی تدفین سے فارغ ہوئی ہے۔ اس کے پہلے بچے...... اور ہر سال افریقہ کے لاکھوں بچوں کی طرح اس کی یہ پانچ برس کی لڑکی فاقے کے سبب موت کا شکار ہوئی۔ ماریان خود بھی ایڈز کے موذی اور مہلک مرض میں مبتلا ہے جو اسے اپنے شوہر سے لگا۔ اس کے بعد سے اس کے شوہر کا بھی کوئی پتہ نہیں کہ کہاں چلا گیا۔ گیا تو وہ شہر کام ڈھونڈھنے تھا مگر اس وقت کے بعد ماریان کو اس کی کبھی کوئی خبر سننے کو نہیں ملی۔

برازیل کے مشہور شہر ریوڈی جیزو کی نو سالہ روزاریو مینن کھلے آسمان تلے بازار میں سوتی ہے۔ اس معصوم جان کے دل کو ہر وقت چوہوں' اوباش غنڈوں اور پولیس والوں کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ جو گاہے گاہے روزاریو اور اس جیسے بیشمار دوسرے بچوں پر نت نئے ستم آزماتے

MashalBooks.com

رہتے ہیں۔ برازیل کے ہزاروں دوسرے لڑکے اور لڑکیوں کی طرح روز اریو کا بھی اس دنیا میں کوئی سہارا یا آشیانہ نہیں۔

الریاض میں اٹھارہ سالہ نوجوان احمد نے چند روز پیشتر ہی ایک مذہبی دہشت پسند تنظیم میں شمولیت اختیار کی ہے۔ اسے اپنے وطن سعودی عرب میں کسی روشن مستقبل کی کوئی امید نہیں۔ مشرق وسطیٰ کی آبادی گزشتہ پانچ عشروں کے درمیان بڑھ کر تین گنا ہو چکی ہے۔ 1950ء میں یہ سو ملین کے لگ بھگ تھی مگر اب یہ تین سو اسی ملین کے عدد کو چھوتی بلکہ اسے بھی عبور کرتی نظر آ رہی ہے۔ اس آبادی کا تقریباً دو تہائی حصہ پچیس برس کی عمر سے کم کے نوجوان افراد پر مشتمل ہے اور ملازمتیں ہیں کہ دن بدن عنقا ہوئی چلی جاتی ہیں۔ تیل کی دولت سے مالا مال اس عرب ملک میں بھی احمد جیسا نوجوان کسی خودکش حملے میں جان دینے کے صلے میں اگلے جہان ملنے والی حور وقصور کو اپنے ارضی مستقبل سے زیادہ ترجیح دیتا ہے۔

اس سب بدحالی' افلاس اور بے کسی کے باوجود ماہرین معاشیات سرکاری مداخلت کی بجائے آزاد تجارت اور اقتصادی منصوبہ بندی کے مقابلے میں نجکاری کے حق میں دلائل دیتے نہیں تھکتے۔ وہ ہر وقت کاروباری منافع' بین الاقوامی تجارتی معاہدوں' روزگار سے متعلق اعداد و شمار' شرح سود' کساد بازاری' افراط وتفریط اور خام قومی پیداوار کے منتر جپتے نظر آتے ہیں۔ یہی باتیں ہمیں خبر ناموں' تجارتی مدارس اور ان گنت اقتصادی تحاریر و تصانیف میں ایک ایسی چیستاں لغت میں سننے اور پڑھنے کو ملتی ہیں جو ہماری اصل ضروریات سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔

یہ صحیح ہے کہ ماہرین معاشیات بھی لوگوں کی روزمرہ ضروریات سے کوئی اتنے بے خبر نہیں ہوتے پھر ان میں نوبل انعام یافتہ امرتیا سین اور جوزف سٹگلٹز جیسے افراد بھی ہیں جو کھلے بندوں ان قوانین اور پالیسیوں کو ہدف تنقید بناتے ہیں جو بھوک' امراض اور ماحولیاتی آلودگی کا باعث بنتی ہیں۔ نینسی فولبر اور ہیڈی ہارٹمین جیسے چند ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے دنیا کو یہ بتایا ہے کہ امریکہ جیسے غنی ملک میں بھی لوگوں کا سکھ چین غلط معاشی نظام کی بھینٹ چڑھ رہا ہے' وہاں بھی لوگ ذہنی دباؤ کا شکار ہیں کیونکہ انھیں اپنے افراد خانہ کو دینے کے لیے مناسب وقت نہیں بچتا۔ حتیٰ کہ اچھی خاصی آمدنی والے امریکی بھی اپنی کاروباری ذمہ داریوں اور عائلی زندگی کو ایک ساتھ مناسب طریقے سے نبھانے میں مشکل محسوس کر رہے ہیں۔ ان حالات

میں بھی جبکہ عالمگیریت کا عمل بہت سے گھرانوں کے لیے دباؤ میں روزافزوں اضافہ کرتا چلا جارہا ہے، آج کی بیشتر اقتصادی تحاریر میں اس امر پر سوچ بچار کا کوئی شائبہ تک نہیں ملتا کہ معاشی نظام ہماری روزمرہ زندگی پر کیسے اثرانداز ہوتے ہیں۔

عموماً اقتصادی ماہرین لوگوں کی روزمرہ زندگی کے بارے میں کچھ لکھنا یا اس پر توجہ دینا گوارانہیں کرتے تاہم ان کے ذہن اور تحریروں میں آجرین' ملازمین اور صارفین کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے اور اگر وہ ہمارے ماحولیاتی یا سماجی مسائل کا ذکر کرنے کی زحمت کرتے بھی ہیں تو بھی بیشتر اوقات وہ آزاد تجارت / نجکاری اور حکومتی منصوبہ بندی / سرکاری مداخلت کی بحث میں الجھے دکھائی پڑتے ہیں۔ بات انجام کار وہیں آ پہنچتی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام بہتر ہے یا کہ اشتراکیت۔

اس طرح کے مباحث اس حقیقت کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ ماحول کی بربادی' افلاس' جنگ و جدال اور دہشت گردی جیسے دیرینہ مسائل کو نہ کبھی سرمایہ داریت حل کر پائی ہے اور نہ ہی اشتراکیت۔ یہ مسائل ایسے ہیں جو معاشی وسائل کی ایک کثیر پیمانے پر تباہی اور ضیاع کا باعث بنتے ہیں اور اس طرح بیشمار زندگیوں کا ستیاناس کر کے رکھ دیتے ہیں بلکہ سچ پوچھیں تو ان میں سے بہت سے مسائل سرمایہ داریت اور اشتراکیت کی اقتصادی پالیسیوں کی ہی دین ہیں۔

ہمیں درپیش مسائل سے موثر طریقے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اقتصادیات کا ایک مختلف زاویے سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے دور کے تیزی سے بدلتے ہوئے حرفتی اور سماجی حالات کے پیش نظر ہمیں زیادہ گہرائی میں اترنے اور ان معاملات پر سوچ بچار کرنے کی ضرورت ہے جنھیں روایتی معاشیاتی تجزیے اور نظریے نظرانداز کر دیتے ہیں۔

ہمارے بڑھتے ہوئے ذاتی' سماجی اور ماحولیاتی مسائل کی تہہ میں ایک چیز مشترک نظر آتی ہے اور وہ ہے توجہ و احساس کا فقدان۔ ہمیں ایک ایسے معاشیاتی منہاج کی ضرورت ہے جو ہمیں سرمایہ داریت' اشتراکیت اور اس جیسے دوسرے فرسودہ نظاموں سے آگے لے جائے۔ ہمیں ایسے معاشیاتی آدرشوں' اصولوں اور پالیسیوں کی احتیاج ہے جو ہم میں خود پر' دوسروں پر اور ہماری مادرارض پر توجہ دینے اور ان کا احساس کرنے والی بات پیدا کر دیں۔ ممکن ہے کہ التفات و احساس پر مبنی اقتصادیات کا تصور کچھ لوگوں کو غیرحقیقت پسندانہ محسوس ہو لیکن

سچی بات ہے کہ یہ قدیمی معاشی منہاجات کی نسبت بہت زیادہ قابل عمل اور حقیقت پسندانہ ہے۔ ہمارے یہ قدیمی منہاجات انسانی زندگی سے متعلق بعض بہت اساسی اور انتہائی اہمیت کے حامل حقائق کو نظرانداز کر دیتے ہیں اور توجہ ونگہداشت کے جذبے کو وہ وزن اور اہمیت نہیں دیتے جو انھیں دی جانی چاہیے۔

ایک ثانیے کے لیے ذرا اس بات پر غور کریں کہ اگر اس دنیا میں خدمت' توجہ اور احساس جیسی چیزوں کا وجود نہ ہوتا تو ہم میں سے کوئی بھی یہاں نہ ہوتا۔ نہ گھر ہوتے نہ گھرداریاں ہوتیں' نہ کام کرنے والے ہوتے اور نہ ہی کوئی معیشت ہوتی...... کچھ بھی نہ ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود معاصر معاشیاتی مباحث میں توجہ ونگہداشت جیسی چیزوں کا تذکرہ بھی مشکل سے ملتا ہے۔ حالانکہ معاشیات کے لفظ پر غور کیا جائے تو یہ بات بہت عجیب محسوس ہوتی ہے۔ اس لفظ کا انگریزی متبادل اکنامکس ہے جو یونانی لفظ اکونومیا سے نکلا ہے جس کا مفہوم ہے گھرداری اور گھرداری وہ چیز ہے جس کا توجہ ونگہداشت کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب میں میرا عندیہ یہ ہے کہ موجودہ اقتصادی نظام میں ایک انقلابی سطح کی تبدیلی نہ صرف ہماری بقاء بلکہ آگے کی جانب ارتقاء کے لیے بھی اشد ضروری ہے۔ یہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ معاشیات اور معاشی نظام سے توجہ ونگہداشت کے عنصر کا اخراج لوگوں کے معیار زندگی اور معاشی پیداواریت' اختراعیت اور اس کی نئے حالات کے مطابق خود کو تبدیل کرنے کی صلاحیت پر بہت خوفناک اثرات مرتب کر دیتا ہے۔ معاشی منہاجات میں توجہ و نگہداشت کو شامل نہ کرنا بعدالصنعتی معیشت کے لیے ایک انتہائی نامناسب بات ہے جس میں ماہرین معاشیات کے بقول انسانی سرمائے یعنی افراد کو اہم ترین اثاثے کی حیثیت حاصل ہے۔ مزید برآں جب تک ہم توجہ ونگہداشت کو زیادہ وزن دینا شروع نہیں کرتے، لاخلقی اور غیرمتواضع معاشی پالیسیوں میں کسی دیرپا تبدیلی کی توقع کرنا عبث ہوگا۔

بقول آئن سٹائن ہم اس فکری روش کو استعمال کر کے مسائل کو حل نہیں کر سکتے جو کہ ان مسائل کو پیدا کرتی ہے۔ معزز قارئین ہم ایک انتہائی نازک موڑ پر کھڑے ہیں جہاں اقتصادیات کے ضمن میں ایک نئی فکر اور سوچ ازبس ضروری ہے۔

توجہ ونگہداشت کو زیادہ اہمیت دینے سے فی الفور ہمارے سب مسائل کوا پائے نہیں مل جائے گا مگر جب تک ہم یہ روش اختیار نہیں کرتے حالیہ عالمی بحرانات کو حل کرنا اور کسی قسم کی

ذاتی، معاشی یا عالمی ترقی کی آس لگانا ناممکن ہے۔ اگر ہم بیمار حکومتی پالیسیوں اور کاروباری وتیروں میں کوئی تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو ہمیں معاشیات کے بارے میں ایک قطعی مختلف اندازِ نظر اختیار کرنا ہوگا اور توجہ و احساس کو مناسب مقام دینا ہوگا۔

معاشیات کسے کہتے ہیں؟

2004ء کے موسم خزاں میں مجھے ڈاگ ہیمر شولڈ فاؤنڈیشن کی طرف سے ایک اجلاس میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا جس کا مقصد معاشیات کے مستقبل پر غور وفکر کرنا تھا۔ یہ اجلاس میرے دیرینہ دست اور رفیق ہیڈل ہینڈرسن کے گھر منعقد کیا گیا جنھیں ایک نئے معاشی نظام کے حصول کی منزل کی طرف گامزن تحریک کے علمبرداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ پچیس دیگر مندوبین کا تعلق لاطینی امریکہ، یورپ، ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ سے تھا۔ ان میں پروفیسر، دانشور، سماجی کارکن اور کچھ سابق اعلیٰ حکومتی عہدیداران بھی شامل تھے۔

ہمارے مذاکروں کا اہم ترین مرحلہ اس نام نہاد نوکلاسیکی معاشیات پر تنقید کا مرحلہ تھا جسے آج کل حاصل افرنگی دانشگاہوں میں بڑی پذیرائی حاصل ہے۔ نوکلاسیکی معاشیات ایڈم سمتھ کی توضیع کردہ ابتدائی کلاسیکی معاشیات، ڈیوڈ رکارڈو اور جدید سرمایہ دارانہ نظریے کے دوسرے شارحین سے ماخوذ ہے اور بنیادی طور پر اس مسئلے سے بحث کرتی ہے کہ منڈیاں کیسے چلتی ہے۔ یہ ریاضیاتی ماڈلنگ پر بہت زیادہ انحصار کرتی ہے اور یہ ریاضیاتی ماڈلنگ ایک بند پھندے کی مانند ہے کیونکہ اسے بعض بنیادی بلکہ مقدس خیال کیے جانے والے مفروضات کی بناء پر استوار کیا گیا ہے۔

ان میں سے ایک مفروضہ یہ ہے کہ ایک ''منطقی رویے کا اقتصادی شخص''، منطقی ذاتی مفاد کی بنیاد پر بابصر اقتصادی قدم اٹھاتا ہے۔ ایک اور مفروضہ یہ ہے کہ ان خودغرضانہ سرگرمیوں کو مقابلے بازی منضبط کرتی ہے اور انجام کار اسے اجتماعی فائدے کی شکل دے دیتی ہے۔ ایک دیگر مفروضہ یہ کہتا ہے کہ حکومتوں کو ہر ممکن حد تک منڈی کی تجارت سے الگ تھلگ رہنا چاہیے اور اس کی سرگرمیوں میں کم از کم مداخلت کرنا چاہیے۔ اس آخری مفروضے کو نوکلاسیکی

نظریے کا قلب قرر دیا جا سکتا ہے۔ امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کے نوقدامت پسند اسی نام نہاد نوحریت پسندی کے پیرو ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ نجکاری' کھلی تجارت' عدم انضباط اور قومی سرحدوں اور مفادات سے آزاد تجارت ہمارے سب دلدّر دُور کرسکتی ہے۔

ہیمر شولڈ فاؤنڈیشن کے سیمینار میں نوکلاسیکی اور نوحریتی آدرشوں اور نظریوں پر بات کی گئی۔ بعض مندوبین نے یہ رائے پیش کی کہ یہ منہاجات نئی سائنسی دنیا کے مناسب حال نہیں رہے۔ یہاں ان ماہرین طبیعیات کا ذکر بھی آیا جنھوں نے کلاسیکی اقتصادی ڈھانچوں کی ریاضی کا بھانڈا پھوڑ کر حاسبی تجزیے کے منہاج (Computerized analysis methodology) میں غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ منہائیت پسندانہ (reductionist) منہاجات حقیقت کی غلط عکاسی کر رہے ہیں۔ بعض شرکاء نے اشتہارات و تشہیر اور ان اثرات پر بھی بات کی جو یہ کاروبار و تجارت پر مرتب کرتے ہیں اور یہ بتایا کہ مصنوعات کی یہ تشہیر عوام میں مصنوعی ذوق و رجحانات کیسے پیدا کرتے ہیں۔ دیگر ماہرین نے اس مفروضے کو ہدف تنقید بنایا کہ مقابلہ خود ہی کاروباری سرگرمیوں کو انضباط میں لے آتا ہے اور دنیا کی مختلف تجارتی منڈیوں اور اداروں کا حوالہ دیتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی کہ ہمارے اردگرد کی دنیا میں کس طرح بڑی کاروباری کارپوریشنیں چھوٹی چھوٹی کمپنیوں کو نگلے جاتی ہیں اور بڑے مگرمچھ کس طرح قیمتوں میں تخفیف کر کے اپنے حریفوں کو بساط لپیٹنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

بعدازاں مذاکرے کا رخ اقتصادی نظریات سے حالات حاضرہ کی جانب پھر گیا۔ متعدد مندوبین نے پانی اور دیگر اشیاءِ ضروریہ کی نجکاری اور بڑے بڑے بین الاقوامی کاروباری اداروں میں روز بروز بڑھتے ہوئے ثروت و اثر کے ارتکاز کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ بعض نے عالمی مالیاتی فنڈ جیسے بین الاقوامی اداروں کے احتساب کی ضرورت پر زور دیا اور ہماری قدرتی پناہ گاہ یعنی اس کرہ ارض کے ماحول کی بربادی پر ارباب اختیار کی عدم توجہی پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ بھوٹان کے "پیمانہ خوشی" جیسے معیار زندگی کے نئے مقیاسات بھی گفتگو کا موضوع بنے اور مصنوعاتی مواخذے کے لیے بین الاقوامی عدالتوں کے قیام اور ایسے نئے نصابوں اور نصابی کتب کی بات بھی کی گئی جن سے نئے اقتصادی نظریاتی کی اشاعت کی جا سکے۔

لیکن جوں جوں بحث آگے بڑھی ایک اور چیز نمودار ہونا شروع ہوگئی۔ جہاں بہت سے معاملات کے حق و استرداد میں اتفاق رائے کا اظہار ہوا' ایک چیز ایسی بھی تھی جس پر مندوبین کے درمیان بہت زیادہ اختلاف نظر دیکھنے میں آیا۔ اس اختلاف کا مرکز یہ تھا کہ معاشیات کا دائرہ کار کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے۔ بعض شرکاء عین ان ماہرین معاشیات کی مانند کہ جن پر کچھ لمحے پیشتر وہ خود تنقید کر رہے تھے، اس بات کے حق میں دلائل دیتے نظر آئے کہ معاشیات کو محض کاروباری معیشت کے اقتصادی روابط تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ انھوں نے ان معاشیاتی آدرشوں کی بڑی شدومد سے مخالفت کی کہ جو توجہ و نگہداشت کے غیر کاروباری وظائف (جو کہ اساساً گھرداری اور غیر مالی معیشت کے دوسرے شعبوں میں سرانجام دیے جاتے ہیں۔) کو بھی قابل اعتنا سمجھتے ہیں۔

معاشیات کا مفہوم

> ''معاشیات'' کا علمی حلقوں میں مفہوم الگ ہے اور عوامی سطح پر الگ۔ علمی حلقوں میں ''معاشیات'' کو معاشرتی علوم کی ایک شاخ کے طور پر لیا جاتا ہے جو اشیاء و خدمات کی پیداور' تقسیم' تصرف اور ان کے انصرام سے بحث کرتی ہے۔ جب اس مفہوم میں استعمال کیا جائے تو یہ اصطلاح اقتصادی نظریوں اور سانچوں کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ معاشیات کا عوامی مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔ یہاں اسے اکثر و بیشتر معاشی نظاموں' پالیسیوں اور روائتوں کو بیان کرنے کے لیے شاٹ ہینڈ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر عام محاوروں مثلاً ''امریکی معاشیات اور سیاست'' میں۔ میں نے اس تصنیف میں اس اصطلاح کا استعمال سیاق و سباق کی مناسبت سے اس کے دونوں متذکرہ مفاہیم میں کیا ہے۔

ان کا موقف تھا کہ اس نوع کے کام کی مقدار کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ جب ان کے سامنے یہ دلیل دی گئی کہ اس کا تعین کیا جا سکتا ہے بلکہ کیا جاتا رہا ہے تو انھوں نے متفقہ طور پر یہ موقف اختیار کر لیا کہ ''یہ تعین نہیں کیا جانا چاہیے۔'' اگرچہ انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ناقص معاشی سانچے ناقص اقتصادی پالیسیوں کی طرف لے جاتے ہیں' انھوں نے حاضرین کے سامنے یہ کہنے سے بھی گریز نہیں کیا کہ انھیں معاشیات کے دائرہ کار میں توسیع یا اس کی از سر نو تعریف میں کوئی دلچسپی نہیں۔

بایں ہمہ معاشی منہاجات کی توسیع وتعریف نو کا سلسلہ تو پہلے ہی شروع ہو چکا ہے۔ دنیا میں سینکڑوں اور ہزاروں مرد ایسے ہوں گے جن کا ذہن یہ دیکھ کر ضرور ٹھٹکا ہو گا کہ اقتصادی اقدامات اور پالیسیوں میں اس سب سے زیادہ اہم بنیادی اہمیت کے حامل انسانی محنت کے وظیفے کو شامل کیوں نہیں کیا جاتا۔ چند برس پیشتر میرلن وارنگ صاحبہ نے اس موضوع پر ایک تہلکہ خیز کتاب تصنیف کی ہے۔ ابھی حال ہی میں باربرا برانت' این کرٹنڈن' ماریان فربر' نینسی فولبر' جینٹ گورنک' ہیڈی ہارٹمین' ہیذل ہینڈرسن' مارشیا میسرز' جولی نیلسن' پائیتلا پاٹل' گینو یووان اور اس قبیل کے دوسرے اقتصادی مفکرین نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے اور معاشی نظریے اور نظام میں توجہ و احساس کو زیادہ نمایاں اور اہم مقام دینے کی ضرورت کو اپنی تحریر وتقریر میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ نرملا بیز جی' ایڈگر کان' ہرمن ڈیلی' دیوائی جین' ڈیوڈ کوٹن' پال کرگ مین' امریتا سین اور دیگر اہم دانشوروں نے بھی اس بات پر زور دینا شروع کر دیا ہے کہ ہم معاشی روابط وتعاملات کو ایک وسیع تر تناظر میں ملاحظہ کریں۔

ان افراد خصوصاً پائٹلا اور ہینڈرسن کی تحقیق کو متوجہ معاشیات کے لیے درکار معاشی آدرش کے لیے ایک بنیاد کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

جدید معاشی نقشہ:

نئے معاشی نقشے میں چھ کے چھ معاشی شعبے شامل ہیں:

مرکزی شعبہ: گھریلو معیشت

شعبہ دوم: رضا کار طبقے کی معیشت

شعبہ سوم: منڈی کی معیشت

شعبہ چہارم: غیر قانونی معیشت

شعبہ پنجم: سرکاری معیشت

شعبہ ششم: قدرتی معیشت

MashalBooks.com

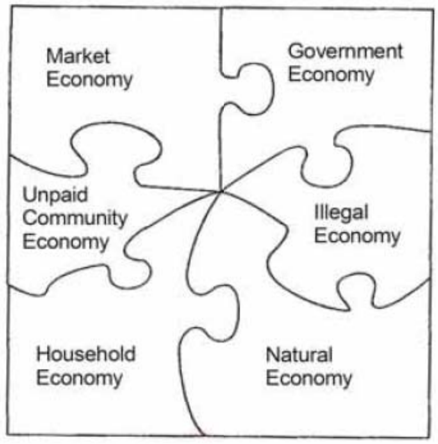

جدید معاشی نقشہ:

ایک جدید معاشی نقشے کی تشکیل کے لیے ہمیں اس میں سب کے سب معاشی روابط کو شامل کرنا ہوگا اور اس بات پر تامل کرنا ہوگا کہ انسانوں کا ہمارے قدرتی مسکن سے کیا تعلق بنتا ہے اور گھر کے اندر مختلف افراد کے معاشی تعاملات کی نوعیت و اہمیت کیا ہے۔ اس واسطے ایک ایسا مکمل اور صحیح نقشہ درکار ہے جس میں تمام معاشی شعبے شامل ہوں۔

قدیم معاشی نقشہ:

ان قدیم معاشی آدرشوں میں اساسی معاشی شعبے...... گھر' بن تنخواہ کام کرنے والا طبقہ اور قدرتی ماحول کو قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا تھا جس سے غلط قسم کے تصورات اور پالیسیوں نے جنم لیا۔ ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ ہم ایک ایسی متوجہ معاشیات کو فروغ دیں جس میں انسانی صلاحیتوں کی افزائش ہو' ہمارے قدرتی مسکن کی نگہداشت کی جائے اور توجہ و تحقیق کے ہمارے عظیم وصف کو جلا ملے۔

MashalBooks.com

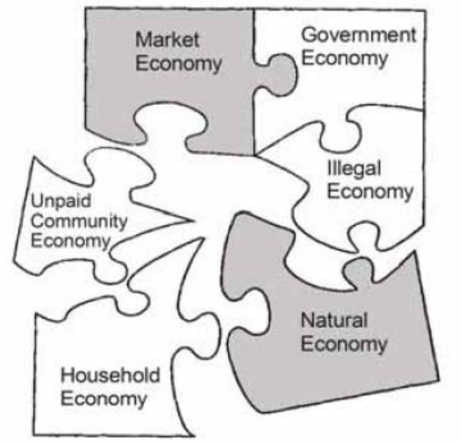

یہ جدید معاشی نقشہ کنبے سے شروع ہوتا ہے جسے ایک قلبی اور داخلی شعبے کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ شعبہ معاشی پیداواریت کا حقیقی مدار ہے کیونکہ یہ وہ شعبہ ہے جو بقیہ تمام شعبوں میں معاشی سرگرمی کو ممکن بناتا ہے اور اس کی معاونت کرتا ہے۔ کنبے کو محض صرف کی اکائی خیال نہیں کیا جانا چاہیے جیسا کہ اکثر اقتصادی تحاریر کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ یہ اصل میں یہ ایک پیداواری اکائی ہے بلکہ ہمیشہ سے ہی ایک پیداواری اکائی کا کردار ادا کرتے چلا آتا ہے۔ اس کا اہم ترین ثمر یا مصنوع افراد ہیں اور یہ مصنوع آج کی بعد الصنعتی معیشت میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے جس میں ''اعلیٰ معیار کے افرادی سرمائے'' کو ایک کاروباری منترے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے مگر افسوس کی بات ہے کہ روایتی معاشی تجزیات و تباصر میں اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی کہ اس اعلیٰ معیار کے افرادی سرمائے کو پیدا کرنے کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے: توجہ نگہداشت کی۔ (جدید معاشی نقشہ اور قدیم معاشی نقشہ ملاحظہ فرمائیں)

معیشت کا دوسرا شعبہ ان افراد کا طبقہ ہے جو بلا معاوضہ خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ ان میں خیراتی اور سماجی انصاف کے اداروں میں کام کرنے والے رضا کار نیز مبادلہ اور گروہی کرنسی کی معیشت (جس میں بتدریج اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔) اس میں بھی توجہ و نگہداشت کو اہم وظائف کی حیثیت حاصل ہے۔

تیسرا شعبہ منڈی کی معیشت کا ہے جو روایتی معاشی تجزیوں اور اشاریوں کا مرکز انحنا ہے۔ پہلے دونوں معاشی شعبے منڈی کو ایندھن فراہم کرتے ہیں مگر اس کے پیمانے اور قوانین انھیں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ موجودہ نظام کے مطابق منڈی کی معیشت توجہ کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے اکثر و بیشتر اس کی حوصلہ شکنی کرتی نظر آتی ہے اگرچہ تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ جب ملازمین یہ محسوس کرنے لگیں کہ ان کا خیال رکھا جا رہا ہے اور انھیں وقعت دی جا رہی ہے تو ان کی تخلیق اور پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

چوتھا شعبہ غیر قانونی معیشت کا ہے جس میں منشیات‘ عصمت فروشی نیز بعض نوع کے اسلحے کی تجارت اور بعض دیگر معاشی سرگرمیاں شامل ہیں جو کہ جرائم پیشہ افراد اور گروہوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ غیر قانونی شعبے کی امتیازی خصوصیت عدم احساس ہے......قتل و دہشت کی تو خیر بات ہی کیا کرنی جو اس کا سب سے بڑا وصف ہے۔

پانچواں شعبہ حکومتی معیشت کا ہے۔ یہ وہ شعبہ ہے جو منڈی کی معیشت کے لیے پالیسیاں اور اصول و قوانین وضع کرتا ہے اور براہ راست یا نجی اداروں کے توسط عوامی خدمات فراہم کرتا ہے۔ ان خدمات میں سے بعض میں توجہ و نگہداشت کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے مثلاً علاج معالجہ کے سرکاری اداروں کی پیش کردہ خدمات میں لیکن اکثر ممالک میں حکومتی پالیسیاں کنبے اور بلامعاوضہ کام کرنے والے افراد کی معیشت کو کوئی خاص وقعت نہیں دیتیں حالانکہ تمام معاشی شعبوں کا انحصار انھی پر ہے۔ موجودہ حکومتی پالیسیوں میں عامۃ الناس کے لیے عدم توجہی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے اور بیشتر مال و متاع بڑی مچھلیوں کو چلا جاتا ہے۔ مزید برآں امریکہ سمیت دنیا کے بہت سے ممالک میں حکومتی پالیسیاں قدرتی ماحول کو آلودگی اور وحشیانہ استحصال سے بچانے میں بری طرح ناکام رہی ہیں۔

چھٹے نمبر پر قدرتی معیشت کا شعبہ آتا ہے جو کنبے کی طرح بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارا قدرتی ماحول ہمیں ایسے وسائل مہیا کرتا ہے جو منڈی کی معیشت کو برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں مگر روایتی معاشی منہاجات فطرت کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ جوں جوں ہم زیادہ طاقتور ٹیکنالوجی کی طرف چلے جاتے ہیں قدرتی وسائل کا انتہائی بے دردی اور شقاوت سے استحصال کیا جا رہا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے خوفناک نتائج بھی سامنے آتے چلے جا رہے ہیں۔ کرہ ارض کے احساس کو لاگت و منافع کے تناظر میں

تشکیل پانے والے معاشی تجزیوں میں ایک حرج اور خسارے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ ابھی تک بھی کئی معاشی نظریات ایسے ہیں جن میں اس مسئلے کو کوئی مسئلہ تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔

یہ چھ معاشی شعبے دائماً ایک دوسرے سے تعامل کرتے رہتے ہیں۔ ہماری آج کی دنیا کو جن تبدیلیوں اور تغیرات کی ضرورت ہے ان کو شرمندہ تعبیر کرنا تبھی ممکن ہے کہ اگر ہم ان سب پر مناسب توجہ دیں۔

وقت کی ضرورت یہ ہے کہ ایسے معاشی آدرش' پالیسیاں اور اصول وضع کیے جائیں جو پہلے' دوسرے اور چھٹے شعبے کی اہمیت کو تسلیم کریں اور انھیں مناسب وزن دیں۔ یہ ایک ایسے متوجہ معاشی نظام کے لیے کلیدی چیز ہے جس میں انسانی صلاحیتیں پروان چڑھ سکیں نہ کہ ان کا استحصال ہو' جو ہمارے قدرتی مسکن کو تباہی سے بچا سکے اور جس میں توجہ و نگہداشت کی ہماری بے بہا صلاحیت کو فروغ مل سکے۔

ثقافت' معاشیات اور اقدار

معاشی منہاجات انسانی ذہن کی تخلیق ہیں۔ ان میں تبدیلی آ سکتی ہے اور وہ تبدیل ہوتے بھی ہیں۔ گزشتہ پانصد برس کی مغربی تاریخ میں مختلف حرفتی ادوار میں مختلف طرح کے معاشی اور اقتصادی نظام معرض وجود میں آئے۔ جوں جوں ہم زرعی دور سے صنعتی دور کی جانب سفر کرتے چلے گئے، جاگیردارانہ نظام کی جگہ سرمایہ دارانہ اور بعض جگہ اشترا کی نظام لیتا چلا گیا۔ آج کے دور میں ہم حرفتی تبدیلی کے ایک اور بڑے دور سے گزر رہے ہیں مگر یہ تبدیلی جو ہمیں صنعتی دور سے بعد الصنعتی دور کی جانب لیے جاتی ہے پہلے کی تبدیلیوں سے بہت مختلف ہے۔

قبل کی تبدیلیوں کے برعکس بعد الصنعتی / جوہری / الیکٹرانی / بائیو کیمیائی ٹیکنالوجی کی طرف یہ تبدیلی صدیوں کے عرصے میں نہیں بلکہ چند دہائیوں کے دوران رونما ہو رہی ہے اور ماضی میں بپا ہونے والی تبدیلیوں کے برعکس یہ اپنی تولید کے مراحل میں ہی بہت شدومد کے تجزیات کا ہدف بنی ہوئی ہے۔ مزید برآں یہ عالمی سطح پر رونما ہو رہی ہے کہ اب پہلے والی باتیں نہیں چلیں گی اور یہ کہ اگر ہم بعض بنیادی قسم کی تبدیلیاں عمل میں نہیں لاتے تو ہمیں ایک انتہائی غیر یقینی اور مخدوش مستقبل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر تہذیب انسانی کی تاریخ کا جائزہ

لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ نئی حرفتوں کے وجود میں آنے سے قدر پیمائیوں میں بھی تغیرات واقع ہوئے۔ مثال کے طور پر جب ہم ایک اساساً زرعی معیشت میں رہ رہے تھے تو زمین کو سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ تصور کیا جاتا تھا لیکن جب ٹیکنالوجی صنعتی دور میں داخل ہوئی تو آلات نے اس کی جگہ لے لی اور مشینوں اور دوسرے اثاثہ جات کی قدر میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔

لیکن حرفتی عوامل پر مبنی قدر پیمائی اقتصادی مساوات کے اقداری پہلو کا محض ایک چھوٹا سا جزو ہے۔ اس سے زیادہ اہم اور مزاحم وہ زیر سطحی ثقافتی اقدار اور معاشرتی ڈھانچے ہوتے ہیں کہ معاشی منہاجات جن کے ایک جزو کا کردار ادا کرتے ہیں۔

ہمارے اعتقادات کہ کیا چیز قیمتی ہے اور کیا نہیں ہے زیادہ تر تحت الشعوری ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ قدر و قیمت کے ہمارے ان اعتقادات نے ان مفروضات سے بہت زیادہ اثرات قبول کیے ہیں جو ہمیں ماضی کے ایام سے وراثت میں ملے اور جن میں انسانیت کے نسوانی منصب سے منسوب ہر چیز...... بشمول توجہ و نگہداشت کے...... کی قدر و قیمت کی تحقیر کی گئی۔ ہماری آج کی مغربی دنیا میں معاملات میں کافی تبدیلی واقع ہوئی ہے اور عورت مرد کے درمیان مساوات کا تصور ایک آدرش کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مردوں میں ''نسوانی'' وظائف اختیار کرنے کے رجحان میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ مثلاً بہت سے والد اب گھر کے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال اور نگہداشت کا فریضہ سنبھالنے لگے ہیں جسے کہ ماضی میں ''مردانہ وقار'' کے منافی خیال کیا جاتا تھا مگر مروجہ معاشی نظاموں میں دیکھ بھال اور توجہ کی قدر افزائی کے فقدان...... خواہ یہ گھر کے اندر ہو یا معاشرتی سطح پر...... کو اب بھی بہت سی معاشی امراض اور ناانصافیوں کے پیچھے کارفرما دیکھا جا سکتا ہے۔ ان وظائف کی کہ جو انسانی بہبود و ترقی میں سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں کی تخفیف قدر کا یہ باقاعدہ عمل ایک قسم کے معاشی پاگل پن کو جنم دے رہا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھ بھال اور نگہداشت کے بیشتر کام کو معاشی پیداوار کے پیمانوں مثلاً ''خام خانگی پیداوار'' (خ خ پ) یا ''خام قومی پیداوار'' (خ ق پ) میں درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا جاتا۔

لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ صرف یہی نہیں کہ گھریلو دیکھ بھال کے وظائف کو...... کہ جس کے بغیر کسی افرادی قوت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا...... اقتصادی پالیسیوں میں زیادہ

وقعت نہیں دی جاتی' منڈی میں بھی تواضع ونگہداشت کے کام کو انتہائی حقیر اجرت کا سزاوار خیال کیا جاتا ہے۔

ہم امریکیوں کو ہی دیکھ لیں جو نل ساز کو جو کہ ہمارے پائپوں کی دیکھ بھال کرتا ہے' پچاس ساٹھ ڈالر تک دے جاتے ہیں اور اس میں تامل نہیں کرتے مگر امریکی وزارت محنت کے اعداد وشمار کے مطابق نگہداشت اطفال کے شعبے میں کام کرنے والے کارکنوں کو کہ جو ہمارے بچوں کی نگہداشت جیسا اہم فریضہ سرانجام دیتے ہیں' مر کے دس ڈالر فی گھنٹہ بھی نہیں ملتا۔ اور پھر ہمارا خیال یہ ہوتا ہے کہ نل سازوں کی تربیت تو ضرور ہونا چاہیئے' بچوں کی نگہداشت کرنے والوں کی خیر ہے۔

یہ چلن صحیح نہیں۔ اسے منطقی رویہ نہیں کہا جاسکتا بلکہ اگر اسے مریضانہ روش قرار دیا جائے تو بھی غلط نہ ہوگا۔ اس روش کو ٹھیک کیا جاسکتا ہے مگر اسے ٹھیک کرنے کے لیے ہمیں ان عوامل سے آگے جاکر سوچنا ہوگا جن پر روایتی معاشی تجزیات میں سارا زور ڈالا جاتا ہے۔

نگہداشتی کام کی اہمیت

مروجہ معاشی نظریہ کہتا ہے کہ کسی چیز کی کیا قیمت پڑتی ہے' اس کا دارومدار طلب ورسد کے اصول پر ہوتا ہے اور ان اشیاء اور وظائف کی قدر وقیمت میں جو نسبتاً کمیاب ہوتے ہیں' ان اشیاء وخدمات کی نسبت کہ جو وافر ہوتے ہیں' اضافہ ہو جاتا ہے مگر اس نظریے کے شارحین دو اہم نکات بھول جاتے ہیں۔ پہلا (جس پر میں آگے چل کر مزید بات کروں گی) یہ کہ مروجہ معاشی ریتیں اور پالیسیاں خود جان بوجھ کر بھی منڈی میں مصنوعی قلتیں اور کمیابیاں پیدا کرتی ہیں۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ طلب کا دارومدار بھی بہت حد تک ان ثقافتی اعتقادات پر ہوتا ہے کہ کون سی چیز اہم اور قیمتی ہے اور کون سی نہیں۔

یہ یقین کرنے کے لیے کہ کسی شے یا وظیفے کی کیا معاشی قدر وقیمت ہونا چاہیے ایک نسبتاً بہت زیادہ معقول اور حقیقت پسندانہ معیار یہ ہوسکتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ شے انسانی بقاء و ترقی کے لیے کس قدر ممد ومعاون ثابت ہوتی ہے۔ اگر اس بات کو معیار بنایا جائے تو اپنی دوسروں اور ہمارے قدرتی ماحول کی بہبود وترقی کے فکر واحساس میں کیے گئے کاموں کی بہت زیادہ قدر وقیمت بنتی ہے۔ یہی صورت نگہداشتی کاموں اور متوجہ ماحول پیدا کرنے کی ہے خواہ وہ گھر میں ہو' دفتر میں ہو' محلے میں ہو یا پھر حکومتوں میں۔

MashalBooks.com

اس کا مطلب یہ نہیں کہ دیکھ بھال اور نگہداشت کے وظائف کا معاوضہ ضرور بالضرور رقم کی صورت میں ہی ادا کیا جائے۔ جیسا کہ ہم آئندہ ابواب میں دیکھیں گے اس طرح کے کام کی پذیرائی بہت سے دوسرے طریقوں سے بھی کی جا سکتی ہے اور اس کا اجر بہت سی دوسری صورتوں میں بھی ادا کیا جا سکتا۔

ہم آئندہ ابواب میں نگہداشتی معاشیات کا زیادہ قریب سے جائزہ لیں گے۔ یہاں میں یہ واضح کرتی چلوں کہ نگہداشتی کاموں سے میری مراد ایسے وظائف ہیں جو زیادہ سے زیادہ انسانی ترقی کے لیے ہمدردی، احساس اور ذمہ داری کی بنیاد پر سرانجام دیے جاتے ہیں۔ مزید برآں جیسا کہ میں نے نیچے تفصیل سے بیان کیا ہے متوجہ طرزِ عمل احساس و نگہداشت کو زندگی کے تمام شعبوں میں اہمیت اور نمایاں مقام دینے کا نام ہے۔

جیسا کہ ہم باب سوم میں چل کر دیکھیں گے کہ ایک بااحساس کاروباری طرزِ عمل قدیم بے حس طرزِ عمل کے مقابلے میں روپے پیسے کے معاملے میں بھی زیادہ سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مشہور سافٹ ویئر کمپنی ایس۔ اے۔ ایس انسٹیٹیوٹ کو اس قدر منافع صرف اور صرف اس وجہ سے حاصل ہوتا ہے کہ اس کی انتظامیہ کی پالیسیاں ملازمین کی بہبود کو بہت زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ شرقی ساحل کے سپر مارکیٹوں کے مشہور سلسلے ویگمینز کے بارے میں بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ فارچون کی 2005ء کی ''سو بہترین آجرین'' کی فہرست میں پہلے نمبر پر آنے والی ویگمینز اپنی ویب سائیٹ میں کہتی ہے کہ یہ اپنے ملازمین کو ''ایک خوشگوار پر احساس اور متنوع ماحول مہیا کرتی ہے، جس میں ان سب کو آگے بڑھنے اور کامیاب ہونے کا موقع ملتا ہے۔'' بعض کاروباری اداروں نے تو اپنے ناظمین اور منصرین کے تربیتی پروگراموں میں بھی توجہ واحساس کے عنصر کو شامل کر لیا ہے۔ اس ضمن میں باورچی خانوں اور غسل خانوں کا فرنیچر تیار کرنے والی کامیاب ترین کمپنی امیر کن ووڈ مارک کا نام گنوایا جا سکتا ہے۔

توجہ ونگہداشت اور ایک پر احساس طرزِ عمل

میں جب احساس اور توجہ ونگہداشت کی بات کرتی ہوں تو میری ان سے مراد ایسے وظائف ہیں جو ایک پر احساس طرزِ عمل کے نتیجے میں عمل میں آتے ہیں۔ ایک پر احساس طرزِ عمل نہ صرف انسانی ضرورتوں اور امنگوں کی تکمیل کرتا ہے بلکہ یہ کاروباری اور حکومتی

> پالیسیوں میں بھی ایک مختلف رنگ پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے اور مالی اور معاشرتی دونوں اعتبار سے کامیابی کا باعث بنتا ہے۔ ایک پراحساس طرزِعمل محض بچوں، بیماروں اور بوڑھوں کی گھروں میں نگہداشت کے کام کو اہمیت اور مقام دینے کا نام نہیں۔ یہ فقط منڈی کی معیشت میں نگہداشتی کام مثلاً نگہداشت اطفال، تدریس، نرسنگ یا معمرافراد کی دیکھ بھال کا نام بھی نہیں اور نہ ہی اس سے مراد محض کاروباری اور حکومتی معاملات میں ایک اخلاقی رویہ اختیار کرنا ہے۔
>
> ایک متوجہ طرزِعمل میں بچوں، بیماروں اور بوڑھوں کی نگہداشت سے لے کر ملازموں، گاہکوں، ساجھے داروں تک کے احساس تک سب کچھ آ جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں صحت مند معاشروں کی تعمیر کے لیے کیا گیا کام، سماجی انصاف کے لیے چلائی گئی تحاریک کا کام اور ہمارے اور ہماری آئندہ نسلوں کے لیے ایک صحت مند قدرتی ماحول برقرار رکھنے کے لیے درکار ماحولیاتی کام بھی آ جاتا ہے۔
>
> ایک پراحساس اور متوجہ طرزِعمل کی یہ بھی ایک نشانی ہے کہ اس کے اہداف دوراندیشانہ ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ایک متوجہ طرزِعمل سامنے نظر آنے والے معاملات کے ساتھ ساتھ دور کی باتوں کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ فوری حاصل ہونے والے منافعہ کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ غیر دانشمندانہ ماحولیاتی پالیسوں کے طویل المدتی مضمرات پر بھی توجہ دیتا ہے۔
>
> اسی طرح اگر ہم نل ساز اور بچوں کی نگہداشت کرنے والے شخص کی مثال کی طرف دوبارہ آئیں تو ایک پراحساس طرزِعمل بچے کی صحیح نگہداشت کے طویل المدتی معاشی اثرات کو نلوں کی مرمت کے مقابلے میں زیادہ وزن دے گا اور یہ فرق ان دونوں وظائف کی معاشی قدر پیمائی کے وقت بھی پیش نظر رکھا جائے گا۔

یہ ادارے اپنے تجربے سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ملازمین اور ان کے گھرانوں کی بہبود کا خیال رکھنے سے قابلیت وتعاون میں اضافہ ہوتا ہے۔ اختراع وتخلیق کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ ادارے کی اجتماعی صلاحیت بڑھتی ہے اور اندرونی اور بیرونی طور پر بہتر کاروباری مراسم کو فروغ ملتا ہے۔ انھوں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ ایک غیر متوجہ طرزِعمل کی بجائے ایک متوجہ اور متواضع طرزِعمل عملے اور کاروبار دونوں کی بھلائی میں جاتا ہے۔

متوجہ طرزِعمل معاشی پالیسی کو بھی ایک زیادہ موثر رنگ بخشتا ہے...... نہ صرف انسانی اعتبار سے بلکہ خالصتاً مالی اعتبار سے بھی۔ مثال کے طور پر اس طرح کی پالیسی اختیار کرنے سے

جرائم کی شرح اور ان پر اٹھنے والے اخراجات میں کمی آجاتی ہے۔ ایسی پالیسی بچے کی نگہداشت اور تعلیم پر بھرپور توجہ دیتی ہے۔ لہٰذا اس سے ایک خوش آئند مستقبل کے لیے ضروری اعلیٰ معیار کا افرادی سرمایہ بھی یقینی ہو جاتا ہے۔

امریکہ کی مثال ہی لیجیے جہاں کی معیشت میں اس نوع کے کیے گئے ایک اقدام یعنی کم عمر بچوں کی بہبود کے پروگرام کے بارے میں پتہ چلا ہے کہ یہ قومی سرمایہ کاری پر بارہ فیصد منافع دیتا ہے۔ ایک امریکی ادارے نے اعداد وشمار جمع کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بچوں کی بہبود کے ایسے پروگراموں میں شرکت کرنے والے بچے دوسرے بچوں کے مقابلے میں اپنی زندگی میں 143000 ڈالر زیادہ کما سکتے ہیں۔

اسی طرح کینیڈا کی حکومت کے شروع کردہ صحت مند بچوں کے پروگرام میں شریک ہونے والے بچے نشوونما کے بیشتر پیمانوں میں دوسرے بچوں کی نسبت آگے نکلتے نظر آتے ہیں، جن میں اپنی مدد، خام حرکی مہارات' لطیف حرکی مہرات اور نطق شامل ہے جو کہ سب کے سب اعلیٰ سطحی انسانی صلاحیت کی نشوونما کے مظاہر ہیں اور یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایسے پروگرام ان بچوں کے لیے ایک روشن تر مستقبل کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔

لگتا ہے سکنڈے نیویا کے ممالک مثلاً فن لینڈ' سویڈن اور ناروے نے اس راز کو پالیا ہے کہ نگہداشتی پالیسیوں اور پروگراموں...... یعنی سب کے لیے طبی سہولیات' بہبود اطفال اور بامشاہرہ رخصت زچگی وغیرہ...... میں پیسہ لگانا ایک اعلیٰ معیار زندگی' خوشحال قوم اور ایک زیادہ قابل اور اختراعی معیشت کے لیے سرمایہ کاری کرنے کے مترادف ہے۔ ایسی پالیسیوں کا ثمر دیکھیے کہ فن لینڈ 04-2003 ء اور 06-2005ء میں عالمی اقتصادی فورم کی Global Competitive Rating میں امریکہ جیسے طاقتور ملک سے بھی بازی لے گیا۔(20)

یہ مثالیں توجہ ونگہداشت کے وظائف کو زیادہ وقعت دینے سے ملنے والے ذاتی' معاشرتی اور معاشی فوائد کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ لازم نہیں کہ ہم سب کچھ یکسر ایک نئے سرے سے شروع کریں۔ اس جہت میں سفر کا آغاز پہلے ہی ہو چکا ہے اور مختلف معاشی پالیسیاں اور پروگرام ایسے ماڈل متعارف کرا رہی ہیں جن سے اس بعد الصنعتی دور میں پوری دنیا میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

MashalBooks.com

وہ عصری رجحانات جن سے متوجہ ونگہداشتی وظائف کی قدرافزائی مترشح ہوتی ہے:

متعدد ممالک نے گھروں میں بلامعاوضہ سرانجام دیے جانے والے نگہداشتی کام کی قدروقیمت کاتعین کرنا شروع کر دیا ہے جس سے ان پر یہ بات واہوگئی ہے کہ یہ کتنی مالی اہمیت کا حامل ہے۔

ایک امریکی کاروباری ادارے سے Salary.Com نے یہ تخمینہ نکالا ہے کہ گھر پر رہ کر بچوں کی دیکھ بھال کرنے والے میاں یا بیوی کا سالانہ اوسط معاوضہ 134471 ڈالر تک ہوسکتا ہے۔

اقوام متحدہ کی افرادی ترقی کی رپورٹیں اقوام کی صحت مندی کو اموات زچہ و بچہ، تعلیم، ماحول اور دیگر ایسے عوامل کے تناظر میں آنک رہی ہیں کہ جنھیں پیشتر ازیں درخور اعتنا خیال نہیں کیا جاتا تھا۔

اکثر صنعتی ممالک نے تمام عوام کے لیے علاج معالجے کی سہولیات سرکاری سطح پر فراہم کرنا شروع کر دی ہیں اور وہ اس اقدام کو اپنے افرادی سرمائے کے لیے سرمایہ کاری خیال کرتے ہیں۔

بہت سے کاروباری اداروں نے اس بات کو محسوس کیا ہے کہ توجہ کی جزا وقدرافزائی سے عملے میں قابلیت، ربط وتعامل اور تعاون میں اضافہ ہوتا ہے۔

نیوزی لینڈ، کینیڈا اور مغربی یورپ کے بیشتر ممالک نگہداشت اطفال کے لیے رقوم مختص کر کے اور مع مشاہرہ رخصت زچگی متعارف کرا کے نگہداشتی کام کی پذیرائی کر رہی ہیں۔

حال ہی میں چلی کے صدر نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی یہ فرمان جاری کیا ہے کہ کم آمدنی والے گھرانوں میں اپنے صاحب فراش عزیزوں کی نگہداشت کرنے والے حضرات کو چالیس ڈالر ماہانہ ادا کیے جائیں گے۔ نیز انھیں مفت تربیتی کورس مہیا کیے جائیں گے۔(22)

متوجہ معاشیات کی ترویج:

ہم اس وقت تاریخ کے ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں ہمیں اساسی تبدیلیاں عمل میں لانے کی اشد ضرورت ہے۔(23) اگر ہم آئندہ صفحات میں مذکور اقتصادی اشاریے اور معاشی پیمانے استعمال کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ ہماری عالمی معیشت بہت زیادہ خسارے میں

جا رہی ہے۔ یہ بات بھی ہم پر آشکار ہو چکی ہے کہ ہمیں اپنے قدرتی ماحول کو تباہ کرنے اور اس کا بے دریغ استحصال کرنے کی روش کو بھی چھوڑنا ہو گا۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ ایک زیادہ پر راحت اور ذہنی دباؤ سے پاک زندگی کے حصول کے لیے ہمیں توجہ و نگہداشت جیسے وظائف کی مناسب پذیرائی کرنا ہو گی اور نہ صرف منڈی میں بلکہ گھر سے لے کر قدرتی وسائل تک معیشت کے ہر شعبے میں اس کی اہمیت کے حسب حال اس کی قدر و قیمت کا تعین کرنا ہو گا۔

یہ سوچنا اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہو گا کہ ہم کم آلودگی پیدا کرنے والے آلات متعارف کرا کے اور اپنی صارفانہ عادات تبدیل کر کے اپنے ماحولیاتی مسائل کا توڑ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسی کوششوں میں کامیاب ہو بھی جائیں تو نئی طرح کے مسائل جنم لے لیں گے۔ لہٰذا ہمیں ان مسائل کے کسی پائیدار حل کی تلاش کے لیے زیادہ گہرائی میں جانا ہو گا اور زیادہ اساسی نوعیت کی تبدیلیاں عمل میں لانا ہوں گی۔

ہم یہ تبدیلیاں عمل میں لا سکتے ہیں مگر اس کے لیے ہمیں پہلے اس بات کی آگاہی حاصل کرنا ہو گی کہ کسی معاشرے کے معاشی اصول اور ڈھانچے اس کا نظام اقدار اور اس کے دیگر معاشرتی ادارے مسلسل ایک دوسرے سے متعامل ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ معاشرتی توازن کے اوقات میں یہ تعاملاتی دور نسبتاً ایک مستحکم حالت میں ہوتا ہے اور اس کے پیچھے کارفرما اقدار کے رہنما نظام کا احساس نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ عام طور پر نظر سے اوجھل رہتا ہے مگر معاشرتی عدم استحکام اور عدم توازن کے ایسے ایام میں کہ جن کا ہمیں سامنا ہے، اس نظام کی تہہ میں کارفرما تنظیمی ساخت اور عامل اقدار کو زیادہ صراحت سے دیکھنا ممکن ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے دور میں ایسی اساسی تبدیلیاں متعارف کرانا عین ممکن ہے کہ جو بجائے کسی نظام کی محض نوک پلک درست کرنے کے اس کی سرے سے ہی کایا کلپ کر دیتی ہیں۔

ایک متوجہ معاشیات کی تشکیل کے لیے...... یہاں میں معاشیات کو اس کے عوامی مفہوم یعنی معاشی منہاجات کے بیان کے لیے ایک شارٹ ہینڈ کے طور پر استعمال کر رہی ہوں...... ہمیں اپنی توجہ فقط اقتصادی نظریات و روایات پر ہی نہیں بلکہ ثقافتی اقدار و ادارہ جات پر بھی مرکوز کرنا ہو گی۔ ہم درج ذیل تین بنیادی سوالوں سے آغاز کر سکتے ہیں:

MashalBooks.com

☆ اول یہ کہ ہم کس نوع کی اشیاء‘ خدمات‘ وظائف یا خواص کو کم یا زیادہ معاشی قدر تفویض کرنے کے خواہاں ہیں؟

☆ دوم یہ کہ جب تک توجہ ونگہداشت کے وظائف کی مناسب پذیرائی کا آغاز نہیں ہوتا‘ کیا ہم سماجی و ماحولیاتی اعتبار سے زیادہ متوجہ سرکاری پالیسیوں اور کاروباری وتیروں کے فوائد کی حقیقی معانوں میں کوئی آس لگا سکتے ہیں؟

☆ سوم یہ کہ ایک زیادہ متوجہ‘ موثر‘ تخلیقی اور پائیدار معاشی نظام کی تشکیل کے لیے ہمیں کس نوع کی اقتصادی ایجادات کی ضرورت ہو گی؟

تمام معاشی اداروں کو معاشی ایجادات کے طور پر لیا جا سکتا ہے خواہ یہ بینک ہوں‘ سٹاک ایکسچینج ہوں‘ سوشل سیکیورٹی کے دفاتر ہوں‘ صحت عامہ کے پروگرام ہوں یا پھر نوآبادیت‘ خرکار کیمپ یا چائلڈ لیبر ہو۔ بیمہ بیروزگاری اور رخصت زچگی ایسی معاشی ایجادات ہیں جنھیں معاشرے کے تمام افراد کی بہبود ونگہداشت کو پیش نظر رکھ کے اختراع کیا گیا ہے۔ غلامی اور جبری مشقت کے اڈے بھی معاشی ایجادات ہیں لیکن خرکار کیمپوں‘ نوآبادیت اور چائلڈ لیبر کی مانند ان معاشی ایجادات کو فقط معاشرے کے بعض افراد کے زیادہ موثر استحصال بلکہ اگر ’’ضروری‘‘ ہو تو ان کے خون سے ہاتھ رنگنے کے لیے اختراع کیا گیا ہے۔

بہ الفاظ دیگر ہم کسی معاشی ایجاد کو قدرتی‘ انسانی اور انسان ساختہ وسائل کے استعمال اور ان کی تخصیص کا ایک قاعدہ اور طریقہ دے سکتے ہیں لیکن یہ کیا صورت اختیار کرتی ہے...... اور اس کے کیا ثمرات برآمد ہوتے ہیں...... اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ یہ کس مروجہ نظام اقدار اور کن سماجی اداروں کی تائید کرتی ہے۔

ہمارے دور میں جبکہ تسخیر‘ استحصال اور تسلط جیسی اقدار سے پروان چڑھنے والی طاقتور ٹیکنالوجی ہماری اپنی بقاء کے لیے خطرے کا نشان بن چکی ہے‘ ہمیں ایسی معاشی ایجادات و اختراعات کی ضرورت ہے جن کے پیچھے احساس وتوجہ کا جذبہ کارفرما ہو۔ یہ دَور ایک التفاتی انقلاب کی تلاش میں ہے۔

اس چیز کا تعین کرنا ہماری ذمہ داری ہے کہ ہمیں کون سی معاشی ایجادات کو برقرار رکھنا ہے اور کون سی ترک کرنا ہے۔ ہمیں ایسی نئی معاشی پالیسیوں‘ اصولوں‘ وتیروں اور پیمانوں کو فروغ

MashalBooks.com

دینے کی ضرورت ہے جو ایسے عادلانہ اور پائیدار مستقبل سے لگا کھاتے ہوں جس کی ہمیں تلاش اور ضرورت ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں وہ غیر متوازن ثقافتی بنیادیں تبدیل کرنا ہیں جن پر سرمایہ داریت اور اشتراکیت جیسے معاشی نظام استوار ہوئے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسے معاشی نظام کی جانب قدم بڑھانا ہے کہ جس میں اہم ترین انسانی وظیفے...... توجہ و نگہداشت...... کی صحیح معانوں میں پذیرائی ہو سکے۔

ایک متوجہ معاشیات وہ ہے جو احساس و نگہداشت کی انفرادی، تنظیمی، سماجی اور ماحولیاتی ہر سطح پر سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرے۔ ایسی معاشیات تمام انسانی احتیاجات کو مدنظر رکھ کر پالیسیاں وضع کرتی ہے۔ صرف روٹی، کپڑا، مکان کی مادی احتیاجات ہی نہیں بلکہ بامعنی کام اور بامعنی زندگی کی انسانی حاجت بھی اس کے پیش نظر موجود ہوتی ہے۔

متوجہ معاشیات کی چھ اساسات

متوجہ معاشیات کے چھ اہم ستون ہیں: ایک جامع معاشی نقشہ، توجہ و نگہداشت کو اہمیت دینے والے ثقافتی ادارے اور اعتقادات، جامع اور صحیح معاشی پیمانے، شراکتی معاشی اور سماجی ڈھانچے اور ایک ایسا معاشی نظریہ جسے میں شریکیت کہوں گی کیونکہ اس کے اندر سرمایہ داریت اور اشتراکیت دونوں میں موجود شرکتی عناصر آ جاتے ہیں لیکن یہ یہیں پر بس نہیں کرتا بلکہ اس سے آگے جا کر خود، دوسروں اور قدرت کے احساس و نگہداشت کی اساسی معاشی قدر کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے۔

متوجہ معاشیات کی منزل تک رسائی حاصل کرنے میں وقت لگے گا۔ ہتھیلی پر سرسوں نہیں جم سکتی۔ یہ سفر آہستہ آہستہ اور بتدریج آگے بڑھے گا۔ ایک شعبے میں کی گئی پیش رفت دوسرے تمام شعبوں میں تبدیلی کے ارتعاشات بپا کرے گی۔ ان اعتقادات میں تغیرات کہ کیا چیز معاشی طور پر منفعت بخش ہے اور کیا چیز نہیں معاشیات کے بارے میں نئی سوچ اور فکر کو جنم دیں گے جس سے زیادہ درست معاشی پیمانے تشکیل پائیں گے۔ پیمانوں اور عقیدوں کی یہ تبدیلیاں مزید متوجہ پالیسیوں اور وتیروں کی جانب سفر کو مہمیز دیں گی جس سے اور زیادہ شراکتی بنیادوں پر استوار معاشی اور معاشرتی ڈھانچوں کو فروغ ملے گا اور یہ سب ایک جامع معاشی نقشے زیادہ جامع معاشی نظریوں اور پیمانوں اور ایسے ثقافتی عقیدوں اور اداروں کی طرف تحریک

کوتقویت دے گا کہ جو احساس اور توجہ ونگہداشت کو ان کی صحیح قدر و قیمت تفویض کریں گے۔

بہ کلمات دیگر کسی ایک منطقے میں کی گئی پیش رفت بقیہ مناطق میں ترقی کو تحریک دیتی ہے۔ لہٰذا ہم اگر کسی بھی شعبے میں تبدیلی لانے کے لیے مساعی عمل میں لائیں گے تو تھوڑے وقت میں ہی ہمیں پورے معاشی نظام میں انقلاب کا مشاہدہ ہونے لگے گا۔

ہم کیا کر سکتے ہیں؟ متوجہ معاشی نظام کے لیے چھ اساسات کی توضیح

اگر ہم ان میں سے کسی ایک جہت میں بھی کام کرنا شروع کریں گے تو خود بخود بقیہ جہات میں بھی پیش رفت ہونے لگے گی۔

اساس اول: جامع معاشی نقشہ: ایک جامع معاشی نقشے میں گھریلو معیشت' بلا معاوضہ کام کرنے والے طبقے کی معیشت' منڈی کی معیشت' غیر قانونی معیشت' حکومتی معیشت اور قدرتی معیشت شامل ہیں۔ یہ زیادہ درست اور مکمل معاشی نقشہ اس باب میں متعارف کرایا گیا ہے۔

اساس دوم: ایسے ثقافتی عقیدے اور ادارے جو توجہ اور نگہداشت کو اہمیت دیتے ہیں: عقیدوں اور اداروں کی سمت تسلطی نظام کی بجائے شراکتی نظام کی طرف ہونا چاہیے اور والد / والدہ / بچہ اور مرد۔عورت تعلقات میں تسلطی تعلق سے شراکتی تعلق کی جانب تبدیلی اس میں شامل ہونا چاہیے۔شراکتی نظام اور تسلطی نظام سے متعلقہ تفصیلات کو باب دوم میں بیان کیا گیا ہے۔

اساس سوم: جامع اور درست معاشی پیمانے: حکومتی اور کاروباری اصول و روایات اور پالیسیاں توجہ ونگہداشت کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور اس پر مناسب جزا بھی دیتی ہیں۔ بنیادی انسانی حاجات کو پورا کرتی ہیں۔ان میں دونوں انواع کی حاجات آ جاتی ہیں۔ مادی حاجات بھی اور افرادی ترقی کی حاجات بھی۔ یہ جدید ٹیکنالوجی کو معیار زندگی بہتر بنانے کے لیے استعمال کرتی ہیں اور آئندہ نسلوں پر مرتب ہونے والے اثرات کو مدنظر رکھتی ہیں۔باب سوم میں ان اصولوں' وتیروں اور پالیسیوں کی بات کی گئی ہے اور ان سے متوقع بے بہا کاروباری اور سماجی فوائد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اساس چہارم: جامع اور درست معاشی پیمانے: ان پیمانوں میں دیکھ بھال کے وہ وظائف شامل ہیں جو خواتین عموماً گھروں میں انجام دیتی ہیں یا جو غیر زری معیشت میں انجام دیے جاتے ہیں۔اس میں ممد حیات قدرتی وظائف بھی آ جاتے ہیں۔ تاہم وہ

وظائف اس میں شامل نہیں جن سے ہمیں یا ہمارے قدرتی ماحول کو نقصان پہنچتا ہے۔ باب چہارم میں نئے معاشی پیمانے بیان کیے گئے ہیں جن میں مد حیات خانگی، گروہی اور قدرتی وظائف شامل ہیں۔

اساس پنجم: شراکتی معاشیات اور معاشرتی ڈھانچے: منصفانہ اور شراکتی ڈھانچے بجائے معاشی اثاثوں اور طاقت کے بالائی طبق میں ارتکاز کے باہمی فائدے، ذمہ داری اور محاسبے کے تعلقات کو تقویت دیتے ہیں۔ باب پنجم میں شراکتی اور تسلطی معاشی اور سماجی ڈھانچوں کے مابین فرق واضح کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ یہ ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔

اساس ششم: شریکیت کا ایک ارتقاء پذیر معاشی نظریہ: اس معاشی نظریے میں سرمایہ داریت اور اشتراکیت دونوں کے شراکتی اجزاء شامل ہیں مگر یہ ان سے ورا جا کر خود، دوسروں اور فطرت کے احساس کی اساسی اور معاشی قدر و قیمت کو تسلیم کرتا ہے۔ باب ہفتم میں شریکیت کا تصور متعارف کرایا گیا ہے۔

MashalBooks.com

باب دوم

معاشیات ایک وسیع تناظر میں

آج کی دنیا میں لوگوں نے دکھ اور تکلیف کو محض خدا کی رضا یا پراسرار اور ناقابل تغیر معاشی قوانین کا نتیجہ جان کر قبول کرنا چھوڑ دیا ہے۔ پورے کرۂ ارض کے لوگ بے تحاشا صنعتکاری کی وجہ سے صحت عامہ اور ماحول پر پڑنے والے منفی اثرات کی وجہ سے تشویش میں مبتلا ہیں۔ انھیں اس تجارتی عالمگیریت کے اصولوں پر تشویش ہے جن کی وجہ سے کارکنوں کی اجرتوں اور تحفظ میں ماضی کی نسبت بہت کمی آ رہی ہے۔ وہ اس بات سے آگاہ ہیں کہ دنیا کی نصف آبادی اب بھی بھوک اور افلاس میں زندگی بسر کر رہی ہے اور امریکہ جیسے متمول ملک میں بھی امیر اور غریب کے درمیان کا پاٹ بتدریج بڑھ رہا ہے۔ وہ اس امر سے بھی واقف ہیں کہ ہزاروں لاکھوں بچوں کو مدارس میں ملنے والا کھانا کیوں بند کر دیا گیا ہے جبکہ دوسری طرف بڑی بڑی کاروباری کارپوریشنوں کو لمبی رعایتیں مل رہی ہیں اور بڑے لوگوں کو ٹیکس واپس کر دیے جاتے ہیں۔ وہ ایسی پالیسیوں کے خاتمے کے لیے آوازیں اٹھا رہے ہیں جن کے ذریعے کمپنیوں کے آفیسران ملازمین مفادات اور حصص خریدنے والوں کے سرمائے کو داؤ پر لگا کر اپنی جیبیں بھرنے پر لگے ہوئے ہیں۔ المختصر وہ بے مہر معاشی پالیسیوں اور لاخلق کاروباری وتیروں کے خلاف سراپا احتجاج ہیں اور ان کی جگہ متوجہ اور متواضع پالیسیوں کے خواہاں ہیں۔

افسوسناک خبر یہ ہے کہ معاشی نظامات کو زیادہ متوجہ سمت میں موڑنے کی کاوشیں صرف معدودے چند مقامات پر ہی بارآور ثابت ہو سکی ہیں جبکہ کئی محاذوں پر انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا

پڑا ہے۔ ''ہمدردانہ قدامت پسندی'' کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود امریکہ میں معاشی پالیسیاں بجائے آگے جانے کے پیچھے کو آ رہی ہیں۔ دنیا کے وسائل کا ایک بڑا حصہ اب بھی ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے بڑے لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ کمزور اقوام کی بات چھوڑیں متمول ملکوں میں بھی بچوں کو فاقے برداشت کرنا پڑ رہے ہیں اور ہمارے قدرتی مسکن یعنی اس کرہ ارض کو عالمی درجہ حرارت میں اضافے کی طرح کے ایسے خطرات درپیش ہیں جن کی مثال عصر رفتہ میں نہیں ملتی مگر ان خدشات سے مسلسل چشم پوشی کی جا رہی ہے۔

دوسری طرف خوشخبری یہ ہے کہ ایک کثیر تعداد میں غیر سرکاری تنظیمیں موجودہ پالیسیوں کے سبب پیدا ہونے والے کٹھن اور دشوار حالات میں تالیف کا سامان مہیا کر رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ نظام میں تبدیلی لانے کے لیے بھی بعض کوششیں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ ایک سماجی طور پر ذمہ دار تحریک کارپوریشنوں پر ایسے نئے قوانین کے نفاذ کے لیے کوشاں ہے جو ان پر معاشرتی اور ماحولیاتی احتساب کا اطلاق کر سکیں۔ خام قومی پیداوار جیسے پیمانوں کی جگہ ''معیار زندگی'' جیسے اشاریوں کی ترویج کے لیے بھی کوششیں جاری ہیں کیونکہ اس طرح کے پیمانے زیادہ درست طور پر نشاندہی کر سکتے ہیں کہ کس قسم کے وظائف انسانی زندگی کی خوشحالی میں اضافہ کرتے ہیں اور کس نوع کی سرگرمیاں ماحول کے تحفظ کی ضمانت دے سکتی ہیں۔ ہمارے قدرتی ماحول کو بچانے' جبری مشقت روکنے اور ان بین الاقوامی معاہدوں کے لیے معیارات وضع کرنے پر بھی کام ہو رہا ہے جو کارکنوں کو عالمی طور پر تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ موجودہ معاشی پالیسیوں اور وتیروں میں موجود نقائص کے تدارک کے لیے یہ مساعیاں اپنی اپنی جگہ بہت اہم ہیں لیکن ہمیں اس سے کچھ زیادہ کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک ایسے باقاعدہ انداز سے کام کرنے کی ضرورت ہے کہ جس میں اس وسیع تر نظام کا بھی جائزہ لیا جائے کہ معاشیات جس کا محض ایک جزو ہے۔

معاشیات کی معاشرتی بنیادیں:

معاشی نظام خلا میں پیدا نہیں ہو جاتے۔ وہ ایک وسیع تر معاشرتی' ثقافتی اور حرفی سیاق و سباق سے برآمد ہوتے ہیں۔ ہم اس وسیع تر سیاق وسباق کو سمجھ کر اور اسے تبدیل کر کے ہی ایک ایسا نیا معاشی نظام استوار کر سکتے ہیں کہ جس میں وہ سب لوازمات موجود ہوں کہ جو ایک

موثر معاشی نظام میں ہونے چاہئیں۔ ان لوازمات میں انسانی خوشحالی کا فروغ' انسانی ترقی میں اضافہ اور ہمارے بچوں اور آئندہ نسلوں کے لیے قدرت کے ممد حیات نظامات کا تحفظ شامل ہیں۔ گو یہ بات عجیب لگتی ہے مگر ہے سو فیصد درست کہ ہم معاشی نظاموں کو تبدیل کرنے کے لیے ساری توجہ صرف معاشیات پر ہی صرف نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس سے زیادہ آگے اور گہرائی میں جانا ہوگا۔

ہم ناکارہ' غیر عادلانہ اور ماحولیاتی اعتبار سے تباہ کن معاشی روایات سے آگے گزر سکتے ہیں لیکن ایسا کرنے کے لیے ہمیں ان معاشرتی عوامل کا جائزہ لینا ہوگا جو معاشیات کی تشکیل کرتے ہیں اور جنھیں معاشیات تشکیل دیتی ہے۔ باالفاظ دیگر معاشی نظامات میں ان کے وسیع تر سیاق و سباق (یعنی زندگی کے تمام شعبوں میں تعلقات کی نفسیاتی اور سماجی حرکیات) کا جائزہ لیے بنا بہتری لانا تو کجا ہم انھیں سمجھ بھی نہیں سکتے۔

معاشی نظام انسانی تعلقات کی ہی ایک صورت ہیں۔ اشیاء کے آپس میں مراسم نہیں ہوتے' ایک دوسرے سے تعلق انسان بناتے ہیں۔ چنانچہ ان افراد اور وظائف کو معاشی تجزیات کی توجہ کا مرکز بنایا جانا چاہیے جو انسانی زندگی اور انسانی تعلقات کو جلا بخشتے ہیں اور انھیں پروان چڑھاتے ہیں۔

تعلقات ہی ہماری زندگی کو متعین کرتے ہیں۔ وہی گھر اور تعلیم سے لے کر سیاست اور معاشیات تک تمام سماجی اداروں کی بنیاد ہیں۔ جیسے کہ اس سے قبل میں تعارف میں ذکر کر چکی ہوں اس تصنیف میں پیش کردہ معاشیات کا یہ نیا تجزیہ میری کثیر الجہتی تحقیق کا نتیجہ ہے جس میں میں نے ارتقائی سائنس' نظریہء ژولیدگی' نظریہ پیچیدگی اور دوسرے نئے نظریات کے تناظر کا سماجی نظاموں کی تحقیق پر اطلاق کیا ہے۔ یہ تحقیق میری کتاب The Chalice and the Blade: Our History Our Future کی تحریر کا سبب بنی جس میں میں نے تاریخ انسانی کی تحقیق کا ایک غیر مستقیم منہاج متعارف کرایا ہے جس سے اس بات کی تہہ تک پہنچا جا سکتا ہے کہ کون سے عوامل ثقافتی ارتقاء میں ہمیں ترقی یا انحطاط کی جانب لے جاتے ہیں۔ (2) یہ تحریر پھر میری دوسری کتب کا پیشہ خیمہ بنی جن میں میں نے جنسی عمل اور طاقت کا بھی اسی تناظر سے تجزیہ کیا۔ (3) زیر نظر کتاب میں اب میں اس تحقیق کا معاشیات پر اطلاق کر رہی ہوں۔ اس طرح جنسی عمل' طاقت اور زر یعنی ان عوامل کہ جن کے دم سے ہماری

یہ دنیا رواں دواں ہے کے جائزہ نو کا دور مکمل ہو جائے گا۔

معاشیات کے ارتقائی سائنس کے تناظر کا جائزہ لینے کے لیے میں نے ان تصانیف کی مدد لی ہے جو میرے خیال میں اس شعبے کی بہترین تصانیف ہیں۔ میں نے اپنے دور طالبعلمی میں عمرانیات' بشریات اور قانون جیسے مضامین کا مطالعہ کیا تھا اور میں نے کبھی بھی معاشیات کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ لہٰذا آپ مجھے ایک خارجی قرار دے سکتے ہیں اور خارجی ہونے کے نقصانات بھی ہیں اور فوائد بھی۔ فائدہ اس کا اگر پوچھیں تو یہ ہے کہ خارجی ہونا کسی محقق کے لیے یہ ممکن بناتا ہے کہ وہ معاشیات کا پہلے سے ذہن میں بنے مفروضات وتصورات کے بغیر جائزہ لے اور شاید یہی وجہ ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں بہت سے بڑے بڑے کام خوارج کے ہاتھوں انجام پائے ہیں۔

میں نے اس تصنیف کے لیے تحقیق کرتے وقت متعدد علمی دھاروں سے حکمت نوش کی ہے۔ یہ طریقہ کار علمی و تحقیقی حلقوں میں تیزی سے مقبول ہو رہا ہے کیونکہ ہماری اس پر پیچ اور گنجلک دنیا کی حقیقی احتیاجات کی تکمیل کے لیے بنتی ہی تب ہے کہ جب ہم مختلف شعبوں کے علم وحکمت کو باہم یکجا کریں۔ اس وسیع النظر تجزیے میں ایسے عوامل و معاملات کا جائزہ لیا گیا ہے جن پر بیشتر حکمائے معاش توجہ نہیں دیتے۔ ان عوامل میں ثقافتی عقیدے اور سماجی ادارے بھی شامل ہیں جن کا بظاہر معاشیات سے کوئی تعلق بنتا نظر نہیں آتا۔ کیا چیز اہم اور قابل قدر ہے اور کیا نہیں اس میں اس طرح کے عقائد پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ اس میں تعلقات' خواتین وحضرات' خاندان' محنت وحرفت' سیاست اور متعدد دیگر عوامل کا مطالعہ کیا گیا ہے جو سب مل کر ہمارے اس باہم متصل اور روزافزوں شدید سے شدید تر ہوتے خدشات سے دوچار سیارے کی جیتی جاگتی معاشیات تشکیل دیتے ہیں۔ فی الواقع اس تصنیف میں بعض ایسے مناطق کو بھی منسلک کیا گیا ہے جن سے روافتی معاشی تجزیے کی دور پار کی شناسائی بھی نہیں مثلاً والد / والدہ اور بچے کے ابتدائی تعلقات اور معاشرت انسانی کے دو پہیوں یعنی مرد وعورت کے باہمی روابط و مراسم جو لوگوں کی اقدار اور ان کے تعاملات، بشمول معاشی تعاملات کے، پر انتہائی گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اس میں ان تمام مناطق کا شراکتی یا احترام باہمی کے نظام اور تسلطی یا بالاتازیریں چوہدراہٹ کے نظام کے نئے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ قبل کے عمرانی زمروں...... دایاں بازو بمقابلہ بایاں بازو' دینی بمقابلہ دنیوی' مشرقی بمقابلہ

مغربی، صنعتی بمقابلہ قبل یا ورائے صنعتی...... کے تجزیاتی عدسات عمرانی نظامات کے صرف خاص خاص پہلوؤں پر ہی غور کرتے ہیں مثلاً حرفتی ترقی، محل وقوع یا پھر نظریہ۔ اس سے ایک حقیقی معنوں میں باقاعدہ اور ترتیب وار تجزیہ ناممکن ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس شراکتی نظام اور تسلطی نظام معاشرے کے اعتقادات اور ادارات کی کلیت کو بیان کرتے ہیں جن میں خاندان اور تعلیم سے لے کر مذہب و سیاسیات اور معاشیات تک سب کچھ آ جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ان وسیع تر عمرانی ڈھانچوں کو بیان کرتے ہیں جنھیں قدیمی زمرون کی تنگ نظر سے ملاحظہ نہیں کیا جا سکتا۔

جیسا کہ معروف ماہرنفسیات رابرٹ اورنسٹائن اپنی تصنیف ''شعوری نفسیات'' میں لکھتا ہے، اگر ہمارے پاس مظاہر کی تخصیص کے لیے زمرے نہ ہوں تو ان کا تصور کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''کوئی بھی زبان تجربے کے لیے زمروں کا ایک تقریباً غیرشعوری طور پر متفقہ علیہ مجموعہ فراہم کرتی ہے اور یہ زبان بولنے والوں کو اس بات کی آزادی دیتی ہے کہ وہ اس مشترک زمراتی نطام سے خارج تجربات کو نظرانداز کر دیں۔''

نظام میں تبدیلی لانے کے لیے ایسے زمروں کی ضرورت ہے جو معاشرے کے اہم اجزاء کو خارج نہ کریں۔ شرکاتی اور تسلطی نظام ہمیں ایسے زمرے مہیا کرتے ہیں۔ وہ کسی معاشرے کی قلبی اقدار اور ان اداروں کو بیان کرتے ہیں جن میں ہمارے خاندان کے نام نہاد نجی دائرے اور دیگر قریبی تعلقات اور باہر کے مقامی، قومی اور بین الاقوامی اقوام کے دائرے کے ادارے بھی شامل ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ عمرانی زمرے ان اقدار اور اداروں کی نشاندہی کرتے ہیں جو تمام شعبہ ہائے حیات (جس میں معاشیات کا شعبہ بھی آ جاتا ہے) کے دو انتہائی مختلف اقسام کے تعلقات کو تقویت دیتے ہیں یا پھر انھیں دباتے ہیں۔

تسلطی نظام اور شراکتی نظام

تسلطی نظام میں روابط کی صرف دو راہیں ہیں کہ یا تو چوہدراہٹ حاصل کر لی جائے اور یا چوہدراہٹ کو قبول کر لیا جائے۔ خواہ خاندان ہوں، دفاتر ہوں اور یا معاشرہ بہ حیث مجموعی جو لوگ اوپر ہوتے ہیں وہ نیچے والوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اس نظام میں معاشی پالیسیاں اور وتیرے مقتدر لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے تشکیل دی جاتی ہیں اور نیچے والوں کو نقصان پہنچتا

ہے۔ معاشرتی فضا میں اعتماد مفقود ہو جاتا ہے اور کشیدگی بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ سارا نظام خوف اور قوت کے بل بوتے پر استوار ہوتا ہے۔ تسلطی مراتب برقرار رکھنے کے لیے احساس و ہمدردی کی اقدار کو دبایا جاتا ہے اور ان کی قدو قیمت کو گھٹا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ عمل خاندانوں سے شروع ہوتا ہے اور پھر معاشیات اور سیاست تک چلا آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متوجہ معاشیات کی ایک بنیاد ان اعتقادات اور ادارہ جات پر مشتمل ہے جن کا میلان شراکتی نظام کی طرف ہے۔

شراکتی نظام احترام باہمی اور احساس و توجہ پر مبنی تعلقات کو فروغ دیتا ہے۔ اس میں بھی نظام مراتب موجود ہے اور نظام چلانے کے لیے اسے ہونا بھی چاہیے لیکن یہ نظام مراتب تسلطی نظام ہائے مراتب سے مختلف ہے۔ اس میں احترام اور محاسبے کا بہاؤ دوطرفہ ہوتا ہے نہ کہ صرف نیچے سے اوپر کی طرف یا اوپر سے نیچے کی طرف۔ معاشی اور معاشرتی ڈھانچے اس طرح تشکیل دیے جاتے ہیں کہ ہر طبقے کے افراد ان میں شریک ہو سکیں۔ قائدین اور ناظمین لوگوں کو کنٹرول کرنے اور انھیں طاقت سے محروم کرنے کی بجائے انھیں آسانیاں اور مواقع فراہم کرتے ہیں، انھیں تحریک دیتے ہیں اور انھیں اختیار و قوت تفویض کرتے ہیں۔ اس نظام میں معاشی پالیسیاں اور وتیرے اس طرح تشکیل دیے جاتے ہیں کہ وہ ہماری بقاء کی بنیادی ضروریات اور ہماری قوم، تخلیق، معنی اور احساس و توجہ کی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہماری اعلیٰ ترین صلاحیتوں کو حقیقت کا روپ دیتے ہیں۔

کسی معاشرے میں بھی خالصتاً شراکتی یا تسلطی نظام رائج نہیں ہوتا۔ ہم فقط کسی خاص وقت میں کسی خاص نظام کے تناسب کی بات کر سکتے ہیں لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر تفصیل سے بات کریں گے سکنڈے نیویا کے ممالک مثلاً سویڈن، ڈنمارک وغیرہ میں شراکتی نظام کا تناسب زیادہ ہونے کے طفیل وہاں عام معیار زندگی دوسرے ان ممالک کی نسبت بہت اعلیٰ و بلند ہے جن میں تسلطی نظام مروج ہے اور اسے محض حسن اتفاق نہیں کہا جا سکتا کہ سکنڈے نیویا کی اقوام اپنی ان پالیسیوں کی وجہ سے بھی معروف ہیں جو توجہ و نگہداشت کے وظائف کی بہت زیادہ پذیرائی کرتی ہیں۔

مروجہ معاشی منہاجات میں کہیں کم کہیں زیادہ شراکتی عناصر ضرور دیکھنے میں آتے ہیں مگر

MashalBooks.com

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے بیشتر عالمی مسائل کا سبب یہ ہے کہ سرمایہ دارایت اور اشتراکیت دونوں کا میلان تسلطی نظام کی طرف ہے۔

اگرچہ سرمایہ داری اور اشتراکی معیشتوں میں واضح فرق موجود ہیں، دونوں نظاموں میں قدرتی وسائل اور ذرائع پیدوار کا کنٹرول بالائی طبقے کے افراد کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ سوویت اشتراکیت میں سیاسی انتظامیہ اوپر سے نیچے تک یہ کنٹرول خوف اور قوت کے بل بوتے پر عمل میں لاتی تھی یا پھر یہ حکومت کے زیرکنٹرول بڑی کاروباری کارپوریشنوں کے ذریعے عمل میں لایا جاتا تھا۔ امریکی طرز کے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں بھی حکومت اور بڑی بڑی کارپوریشنیں آپس میں گٹھ جوڑ سے کام کرتی ہیں۔ طاقتور لابیاں انتخابی مہموں میں بڑی بڑی رقوم چندے میں دے کر اور بعض دیگر ذرائع سے حکومت پر بہت زیادہ اثر ورسوخ حاصل کرلیتی ہیں اور معاشی پالیسیوں پر اثرانداز ہوتی ہیں۔

قبل کے جاگیرداری اور ملوکیتی ادوار میں جبکہ تسلطی نظام ہی سکہ رائج الوقت تھا اس طرح کا بالا تا زیریں کنٹرول زیادہ دیکھنے میں آتا تھا۔ درحقیقت موجودہ معاشی پالیسیوں اور وتیروں کے پیچھے کارفرما بہت سے اساسی مفروضات ہمیں انھی ایام سے ملنے والا ورثہ ہیں جب بادشاہوں کا رعایا پر حکم چلتا تھا اور وہ آزادی و مساوات کی بات کرنے والوں کو بال بچے سمیت کولہو پٹھوا دیا کرتے تھے۔ اس طرح کے وقتوں کو گزرے کوئی زیادہ وقت نہیں ہوا بلکہ یہ پوری طرح گزرے ہی کہاں ہیں۔ کئی جگہوں پر تو یہ اب بھی موجود ہیں۔ یہ وہ وقت تھے جب سارا خاندان ایک جابر باپ کے زیرنگیں ہوتا تھا اور امراء اور بادشاہ جاگیروں، ریاستوں اور مملکتوں پر راج کرتے تھے۔ غلاموں، کمیروں اور بعد میں مفلوک الحال صنعتی مزدوروں کے حامل ان تسلطی معاشروں سے ہمیں وراثت میں ملنے والا ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ اذیت اور قلت کا خوف ہی وہ بڑے محرکات ہیں جو لوگوں کو محنت پر مجبور کرتے ہیں۔ معاشیات کی یہ تعریف اب بھی عام ہے کہ معاشرتی علم ہی غیرمحدود ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قلیل وسائل کی تخصیص کی تحقیق کرتا ہے۔"(10)

یہ تعریف دو مفروضات پر مبنی ہے پہلا یہ کہ قلت نے پیدا ہونا ہی ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ انسان خلقی طور پر حریص ہیں اور ان کی ضروریات اور طلبات کی کوئی انتہا نہیں۔ تاہم میں کہوں گی کہ یہ تعریف تسلطی نظام کی شرح تو ضرور کرتی ہے، معاشیات کی نہیں۔

MashalBooks.com

اگرچہ قلت بعض اوقات قدرتی حالات کے نتیجے میں بھی پیدا ہو جاتی ہے، تسلطی نظام اکثر و بیشتر خود جان بوجھ کر بھی قلت پیدا کرتے ہیں اور اسے طوالت دیتے ہیں...... اور اس کے ساتھ خوف اور اذیت کو بھی۔ وہ یہ قلت وسائل کا رخ امراء کی طرف پھیر کے، اسلحے کی خرید پر بے تحاشا پیسہ خرچ کر کے، انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کی جانے والی سرمایہ کاری میں تخفیف کر کے، فطرت کا وحشیانہ استحصال کر کے اور جنگوں اور دیگر متشددانہ سرگرمیوں پر قدرتی اور افرادی وسائل لٹا کے عمل میں لاتے ہیں اور یہ سارے عوامل تسلطی نظام معیشت کے خمیر میں شامل ہیں۔

سرمایہ داریت اور اشتراکیت کی خامیاں

قدرت کے ممد حیات نظامات کے تحفظ میں ابھی تک نہ تو سرمایہ دارانہ نظام کامیاب ہوا ہے اور نہ ہی اشتراکیت۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں نظام ابھی بھی ''تسخیر فطرت'' کے تسلطی تصور میں گرفتار ہیں لہٰذا یہ ماحولیاتی نگہداشت کی کماحقہ قدرافزائی نہیں کر سکے۔ سرمایہ داری نظام نے وسیع پیمانے پر ماحولیاتی آلودگی وانحطاط کو جنم دیا ہے۔ اب بھی بہت سی بڑی بڑی کاروباری کارپوریشنیں ماحولیاتی قوانین کو پچھاڑنے میں لگی ہوئی ہیں جنھیں وہ آزاد تجارت میں خواہ مخواہ کی دخل اندازی کا نام دیتی ہیں۔ جس نوع کی اشتراکیت سوویت یونین اور چین میں دیکھنے میں آئی، وہ بھی ماحولیاتی تخریب و تباہ کاری کا باعث بنی۔ اس کی بڑی مثالیں بحرارال کا تکدر اور چرنوبل کے جوہری پلانٹ کی تباہی اور چین کے ستر فیصد دریا اور جھیلیں ہیں جنھیں تشویشناک حد تک آلودہ قرار دیا گیا ہے۔

سرمایہ داریت اور اشتراکیت دونوں نے جنگ و جدال کے معاملے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے اور بجائے فساد میں کسی تخفیف کا باعث بننے کے دونوں نے اسے بڑھاوا دیا ہے۔ جنگ کو مسئلے کے حل کا ذریعہ بنانا تسلطی نظام کا ہی شاخسانہ ہے۔ ان دونوں نظاموں کی پیرو اقوام کے درمیان ٹکراؤ نے کوریا اور ویتنام کی جنگوں کو جنم دیا۔ اب بھی جبکہ سرد جنگ اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے، سرمایہ دار اور اشتراکی اقوام نت نئے اور مہلک سے مہلک ہتھیار بنانے، استعمال کرنے اور برآمد کرنے میں جتی ہوئی نظر آتی اور پوری دنیا میں فساد و خصومت کے شعلوں پر تیل ڈالنے میں مصروف نظر آتی ہیں۔

اشتراکیت نے کسی حد تک غربت و افلاس کی چارہ جوئی کی مگر اس کے ساتھ شہری حقوق

MashalBooks.com

اور آزادیوں کا بھی بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا۔ دوسری طرف سرمایہ داریت نے گو بہت سے افراد کے معیار زندگی میں بہتری پیدا کی اور بیمہ بیروزگاری اور سوشل سیکیورٹی جیسے معاشی تحفظ کے اقدامات متعارف کرائے لیکن دنیا میں چاروں اور منڈلاتے غربت وافلاس کے منحوس سایوں کا اپائے یہ بھی نہ کر سکی بلکہ سچ پوچھیں تو بعض اوقات تو یہ اس تاریکی میں اضافے کا ہی باعث بنی ہے۔ آئے دن اس بات کے شواہد سامنے آ رہے ہیں کہ سرمایہ داریت کی عالمگیریت عالمی وبا کی شکل اختیار کر کے ترقی پذیر اور ترقی یافتہ دونوں انواع کی اقوام میں امیر اور غریب کے درمیان کی خلیج کے پاٹ میں روزافزوں اضافے کا سبب بن رہی ہے؟

اس پر مستزاد یہ کہ چونکہ تسلطی نظامات میں بنیادی انسانی ضروریات......جس میں ہماری محبت، شخصیت، توجہ، نگہداشت، قدرافزائی اور اس احساس کی ضرورت بھی شامل ہے کہ ہماری زندگی کسی معنی اور مقصد سے عبارت ہے......کو پورا کرنا دشوار ہوتا ہے، لوگوں کی تسلی نہیں ہو پاتی۔ اس طرح حرص اور زیادہ سے زیادہ مادی اشیاء اور سماجی مرتبہ حاصل کرنے کی ہوس بھی تسلطی نظام مصنوعی طور پر پیدا کرتا ہے۔ آج کل زیادہ سے زیادہ جمع کر لینے کی اس ہوس کو اشتہاری مہمات مزید ایندھن فراہم کر رہی ہیں۔ یہ اشتہارات مصنوعی بلکہ بعض صورتوں میں مضر احتیاجات اور طلبات کی نشوونما کا باعث بنتی ہیں۔

چنانچہ جب ہم مصنوعی قلتوں اور مصنوعی حاجات و مطالبات کے اثرات پر غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے طلب و رسد کی ایک اس سے قطعی مختلف تصویر آنا شروع ہو جاتی ہے کہ جو ہمیں روائتی معاشی تجزیات پیش کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تسلطی حرکیات حقیقی انسانی احتیاجات کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں اور اکثر و بیشتر اس میکانیت کو سبوتاژ کر کے رکھ دیتے ہیں جن سے یہ بات متعین ہوتی ہے کہ کس شے کی منڈی میں قدر و قیمت ہونی چاہیے اور کس کی نہیں۔

تسلطی نظام اور تسلطی معاشیات ایک ہے۔ یہ دونوں معاندانہ ذہنیت اور دوسروں پر بے اعتمادی کی فضا کو پروان چڑھاتے ہیں۔ اس نظام میں اعتماد اور عزت و احترام صرف ان کا کیا جاتا ہے جو اونچے عہدوں پر فائز ہوں۔ اور ان کے احکامات کی تعمیل بے چون و چرا کی جاتی ہے۔ یہ عقیدہ کہ انسان اصلاً برا اور خودغرض ہے اور لہٰذا اسے ایک مخروطی نظام تسلط کی مدد

سے قابو رکھنا بہت ضروری ہے اس تسلطی اساطیر کا ایک بنیادی پہلو ہے۔ ''ازلی گناہ'' جیسے مذہبی تصورات اور ''خود غرض جینوں'' جیسے نظریات میں بھی یہی ذہنیت کارفرما ہے۔

فطرت انسان کے بارے میں یہ تصور آزاد منڈی کے سرمایہ داری نظریات کا ایک جزو لا ینفک ہے۔ ان نظریات کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ اگر ہر شخص صرف اپنے مفاد کے لیے کام کرے تو اس سے ایک ایسا معاشی نظام وجود میں آئے گا جس سے سب کو فائدہ ملے گا۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی ذی شعور شخص اپنے کسی بچے کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگر ہم سب خود غرض بن جائیں تو ہر شئے خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔لیکن اس کے باوجود اس تصور کی اشاعت بدستور جاری ہے۔ اصل میں یہ آزاد منڈی (جس کا وجود ان حالات میں ممکن ہی نہیں) نہیں بلکہ حرص ہے جو تسلطی معاشی نظام کو بڑھاوا دیتی ہے۔ ایک اور بنیادی مفروضہ جو ہمیں وراثت میں ملا ہے وہ یہ ہے کہ عدم تشدد اور احساس جیسے ''لطیف'' خواص و وظائف معاشی اور معاشرتی انتظام حکومت میں کام نہیں دیتے۔

اس ورثے کا ایک جزو یا عقیدہ یہ بھی ہے کہ توجہ و نگہداشت پیداوار میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے اور یہ کہ انہیں معاشیات سے کوئی لینا دینا نہیں۔ دوسرے الفاظ میں بجائے اس کے کہ ہمیں ایسے عقائد اور ادارے ملتے کہ جو توجہ و نگہداشت کی روایات کی آبیاری کرتے ہمیں اس طرح کے عقائد اور ادارے نصیب ہوئے ہیں جو اس کا بالکل الٹ ہیں اور ان کی بدولت بہت سے غیر حقیقت پسندانہ اور خطرناک معاشی نظریات، اصول و قوانین اور روایات کو نشو نما ملی ہے۔

تسلطی معاشی مفروضات

- محنت کے اصل محرکات اذیت اور قلت کا خوف ہے۔
- لوگ نا قابل اعتماد ہیں۔
- لطیف خواص و وظائف معاشی و معاشرتی نظام چلانے میں مدد نہیں دیتے۔
- توجہ و نگہداشت پیداوار کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے اور یہ کہ اس کا معاشیات سے کوئی سروکار نہیں۔
- خوغرضی کے نتیجے میں سب کو فائدہ پہنچتا ہے۔

مخفی قدر پیمائی

اگر کوئی بچوں ، بوڑھوں اور بیماری کی نگہداشت کا کام نہ کرے تو ہم سب مرے پڑے ہوں۔ اگر کوئی کھانے ، پینے اور پہننے اور صاف ستھری جگہ پر رہنے کی ہماری روزانہ کی ضروریات کا خیال رکھنے والا نہ ہوتو ہمارے حال کا برا حال ہوجائے۔ اگر اس نوع کے نگہداشتی وظائف سرانجام دینے والے افراد اس دنیا میں موجود نہ ہوں تو دکانوں ، ورکشاپوں اور دفتروں میں کام کرنے والی افرادی قوت بھی میسر نہ آئے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ توجہ ونگہداشت کے وظیفے کے لیے اتنی کم معاشی قدر و قیمت مختص کیوں کی گئی؟ کاروبار کی دنیا میں توجہ و اعتنا کی اس منظم طریقے سے حوصلہ شکنی کیوں کی گئی؟ ان لوگوں کی، کہ جو ایک متوجہ اور منصفانہ معاشرہ کے لیے بلا تکان محنت کرتے ہیں، بے قدری اور اہانت کیوں کی جاتی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ ان افراد کو اب بھی ''معاشی طور پر غیر فعال'' کا لقب عنایت کر دیا جاتا ہے کہ جو گھروں سے باہر کی لا معاوضہ معیشت میں بچوں،بوڑھوں اور مریضوں کی خدمت ونگہداشت میں جتے رہتے ہیں۔

انسانی کام کہ جس کے بغیر ہمارا زندہ رہنا ہی محال ہے۔ اور خود التفات کی ــــ تخفیف قدر میں منطق والی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ یہ سب درحقیقت ان وقتوں کی دین ہے کہ جب ہمارے معاشرے پر تسلطی رنگ بہت گہرا تھا۔

جیسا کہ ہم آگے چل کر باب چہارم میں دیکھیں گے ،اس تسلطی مخروط کا ایک اہم پہلو انسانیت کے مردانہ نصف کا اس کے زنانہ نصف پر تفوق ہے۔ اس نظام مراتب نے مرد اور ''مردانہ'' کو عورت اور ''زنانہ'' کے مقابلے میں زیادہ قدر و قیمت ودیعت کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں خواتین کی مردوں کے سامنے محکومیت کے طفیل ''حقیقی مردانگی'' سے منسوب ہر چیز خواتین اور نسوانیت سے وابستہ ہر شے کی نسبت قدر و قیمت میں زیادہ ٹھہری۔ اور یہ بات عورتوں سے منسوب توجہ ونگہداشت کے کام پر بھی صادق آتی ہے۔ قدر پیمائی کا یہ نظام ان معاشی نظاموں ــــ خواہ وہ قبائلی ہو، جاگیر دارانہ ہو، سرمایہ دارانہ ہو یا پھر اشتراکی ــ میں بھی جھلکتا نظر آتا ہے جو توجہ ونگہداشت کے وظائف کی قدر بہت کم متعین کرتے ہیں یا پھر وہ سرے سے انہیں کسی قدر و قیمت کا سزاوار ہی نہیں سمجھتے۔

مردانگی اور نسوانیت کے جن تصورات کی ہم بات کر رہے ہیں انہیں خلقی طور پر مردانہ یا زنانہ خواص سے خلط ملط نہیں کیا جانا چاہیے۔ خواتین ''مردانہ کام'' بھی کر سکتی ہیں مثلا وہ ویلڈر، سیاستدان اور پادری کے طور پر بھی کام کر سکتی ہیں بلکہ بعض اوقات تو وہ مردوں کے مقابلے میں بہتر کر سکتی ہیں۔ یہ امر کہ آج کے دور میں بہت سے خواتین وحضرات پرانے دور کی جنس پر مبنی پیشہ وارانہ تخصیصات سے بغاوت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ تذکیر و تانیث کی بنیاد پر متعین کردہ معاشرتی مناصب کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔

تاہم ہمیں وراثت میں ملنے والے نظام عقائد کے مطابق دیکھ بھال اور نگہداشت کے وظائف مردانہ شان کے خلاف سمجھے جاتے ہیں۔ یہ خیال عام ہے کہ پدر سالاری گھرانے میں ایسے کام عورتوں کی ذمہ داری ہیں اور یہ بھی کہ اس نوع کے ''ہلکے پھلکے'' کاموں کو نہ تو کوئی وقعت دی جاتی ہے اور نہ ہی انہیں کسی حقیقی معاشی قدر کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ اس سے نہ صرف انفرادی سطح پر خواتین اور مردوں کے مناصب و مراسم پر بلکہ معاشی نظام پر بھی بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض افراد کو جنس اور معاشیات کی بات ایک ہی سانس میں کر گزرنا عجیب لگے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بعض لوگ تو روائتی جنسی مناصب اور روابط پر کسی قسم کی تنقید کو ویسے ہی فطری قوانین کی خلاف ورزی کے مترادف خیال کرتے ہیں اور اس مسئلے کو بحث کے لیے موزوں ہی خیال نہیں کرتے۔ تاہم اگر ذرا غور کریں تو جنسی مسائل سے یہ گریز خود ہی سب کچھ کہہ دیتا ہے۔

جیسا کہ معروف ماہر عمرانیات لوئی ورتھ صاحب پہلے ہی اس بات کی نشاندہی کر چکے ہیں کسی معاشرے کے بارے میں اہم ترین چیزیں وہ ہوتی ہیں جنہیں شاذ ہی بحث میں لایا جاتا ہے۔ زیادہ دور کی بات نہیں کہ نسلی برتری کا تصور اتنا فطری محسوس ہوتا تھا کہ اس پر بہت کم بات کی جاتی تھی۔ آج بھی بعض لوگ نسلی عدم مساوات پر بات نہ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور اس بات کی طرف آنا قطعاً گوارا نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ بحث ایک غیر فطری چیز ہے۔ چنانچہ یہ امر کہ جنسی ناانصافی یا عدم مساوات کی بات کچھ کھردری محسوس ہوتی ہے اور یہ امر کہ اس مسئلے کے وجود کو ہی بیشتر اوقات ماننے سے انکار کر دیا جاتا ہے اور اسے ''فطری'' تسلیم کر

لینے پر اصرار کیا جاتا ہے، اس بات کی علامت ہے کہ یہ ایک انتہائی اہم مسئلہ ہے۔ خاص طور پر خواتین سے منسوب اوصاف و وظائف کی تخفیف قدر' دراصل ایک ایسا مخفی نظام قدر پیمائی ہے جو تسلطی نظام کا جز و خاص ہے۔ یہ ان اصول و قوانین میں بڑی گہرائی تک رسا ہوا ہے جو ان گزشتہ ادوار سے ہم تک پہنچے ہیں جن میں تسلطی نظام کا عمل دخل زمانہ حال کی نسبت زیادہ تھا۔ موجودہ معاشی پیمانے بھی اس تخفیف قدر کی غمازی کرتے ہیں اور اسے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

ان معاشی پیمانوں میں کیا چیز شامل کی جاتی ہے اور کیا نہیں، براہ راست اس پر اثر انداز ہوتی ہے کہ پالیسی ساز کس بات کو غور میں لاتے ہیں اور کس کو نہیں۔ اس طرح جنس پر مبنی اقدار کا ہمارا یہ مخفی نظام ہماری معاشی پالیسیوں کی صورت گری کرتا چلا جاتا ہے۔

ہم اقدار کے اس مخفی نظام کو بحری برفانی تودے کے نچلے پوشیدہ حصے سے تشبیہ دے سکتے ہیں اور یہ ایک دانشمندانہ، زیادہ موثر اور زیادہ انسان نواز معاشیات کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

ایک منظم تبدیلی کی ضرورت

ہماری بیشتر روائتی معاشی پالیسیوں اور روایات پر یہ تسلطی چھاپ اب تک نمایاں ہے۔ یہ ایک ادھورے معاشی آدرش پر مبنی ہیں جو مجموعی معیشت تشکیل دینے والے چھ میں سے تین شعبوں کو اپنے تجزیے میں شامل کرتا ہے اور یہ تین شعبے بھی ایسے ہیں جن میں نگہداشت اور دیکھ بھال کے وظائف کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی۔ اگر دی بھی جاتی ہے تو اسے ہم نہ ہونے کے برابر کہہ سکتے ہیں۔ یہ شعبے عموماً منڈی کی رسمی معیشت پر غور کرتے ہیں اور اپنی پالیسیاں طے کرتے وقت متذکرہ بالا ان تینوں شعبہ جات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ہمارے اساسی اور ممد حیات نظاموں کی بنیاد ہیں اور جن میں گھریلو معیشت، رضا کار معیشت اور قدرتی معیشت شامل ہے جو ہماری بقا و بہبود کے لیے نہایت ضروری ہیں۔

مروجہ معاشی پیمانوں کی خامی

خام قومی پیداوار اور خام خانگی پیداوار جیسے مروجہ معاشی پیمانے معاشی عوامل کا تجربہ کرتے

ہوئے ایسے وظائف کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن میں کرنسی کا لین دین نہیں ہوتا یا جنہیں سرکاری ریکارڈ کے لیے رپورٹ نہیں کیا جاتا۔ لیکن یہ کسی بھی ملک کی معیشت کا اس قدر بڑا حصہ بناتے ہیں کہ ان سے اغماض نہیں کیا جانا چاہیے۔ خام قومی پیداوار اور خام خانگی پیداوار سے یہ بھی کوئی پتہ نہیں چلتا کہ اشیاء اور خدمات (بشمول خوراک، علاج اور تعلیم جیسی بنیادی چیزوں کے) کو تقسیم کیسے کیا جاتا ہے اور یہ تقسیم لوگوں کی زندگی پر کیسے اثر انداز ہوتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مروجہ پیداواری پیمانے ایسے وظائف اور سرگرمیوں کو شامل کر لیتے ہیں جو بجائے معیار زندگی میں بہتری لانے کے الٹا اس میں بدتری پیدا کرتی ہیں۔ مزید برآں یہ منڈی کی سرگرمیوں میں صحت عامہ اور ماحولیات کو پہنچنے والے نقصانات کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔

خام قومی پیداوار اور خام خانگی پیداوار جیسے پیمانے اس قدر بودے ہیں کہ بجائے اس کے کہ یہ بے اعتنا معاشی عادات کی ماحولیاتی اور معاشی لاگت کو شامل کر کے مجموعی لاگت کا حساب پیش کریں، یہ اس طرح کی لاگت کو الٹا معاشی منافع کے طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کیسی عجیب بات ہے کہ زہریلے صنعتی مادوں سے ہونے والے نقصانات کی تلافی پر اٹھنے والے مصارف کو معاشی پیداواری پیمانوں سے منہا کرنے کے الٹا انہیں ان میں جمع کر دیا جاتا ہے۔

اس طرح کی بوالعجبیوں نے اس احساس کو تقویت دی ہے کہ نئے معاشی پیمانے وضع کیے جانا بہت ضروری ہے۔ اس احساس سے تحریک پانے والی تحقیق کے نتیجے میں ابتدا میں جو پیش رفت ہوئی اس میں زندگی کے معیار طبعی کے اشاریے کی تشکیل شامل ہے جسے 1960 کی دھائی میں عالمی ترقیاتی ادارے نے وضع کیا۔ (11) اس کے بعد اقوام متحدہ نے افرادی ترقی کی رپورٹیں شائع کرنی شروع کیں جن میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں، ماحولیاتی مسائل اور خاص طور پر قابل ذکر (1995 میں) خواتین کی حیثیت جیسے معاملات کو بھی جگہ دی جانے لگی۔ (12)

معاشی پیمائش کا جدید رجحان خام قومی پیداوار اور خام خانگی پیداوار کی ایک اور خامی کے ازالے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اس خامی سے میری مراد معاشی اعتبار سے دیکھ بھال اور نگہداشت کے انتہائی اہم وظائف کو معاشی طور پر پیداواری اشیاء کے طور پر شامل نہ کر سکنا ہے جنہیں تاحال عموماً گھروں میں خواتین اور باہر رضا کار سرانجام دیتے ہیں (13)

مثال کے طور پر اقوام متحدہ کے قومی حسابات کے نظام میں اب ایک سیاراتی حساب یا ایس۔این۔اے (قومی آمدنی کے حساب کا ایک بین لاقوامی معیار) بھی شامل ہے جس میں خانگی اور دوسرے بلا معاوضہ محنت کے اعدادوشمار شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف ممالک کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد اس نوع کے کام کی معاشی خدمت کی قدر پیمائی کر رہی ہے۔ 2004 میں سوئٹزر لینڈ کی حکومت کی طرف سے کیے جانے والے ایک سروے میں بلا معاوضہ کام کی قدر 162 بلین یورو یا 190 بلین ڈالر متعین کی گئی جو کہ سوئٹزر لینڈ کی خام خانگی پیداوار کا ستر فی صد بنتا ہے۔(14)

اس کے برعکس شراکتی نظام پر مبنی معیشت ان چھ بنیادوں پر استوار ہوتی ہے جس کا تذکرہ ہم باب اول میں کر چکے ہیں۔ یہ ایک مکمل معاشی نقشے پر مبنی ہوتی ہے اور یہ چھ کے چھ معاشی شعبوں کو زیرغور لاتی ہے جن میں خانگی معیشت، رضاکار معیشت اور قدرتی معیشت بھی شامل ہیں۔ ان ثقافتی عقیدوں اور اداروں سے قوت حاصل کرتی ہے جو توجہ و نگہداشت کو قرار واقعی وقعت دیتے ہیں۔ اس کی معاشی پالیسیاں، روایات اور نظریات انتہائی اہمیت کے حامل وظائف کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، بجائے اس کے کہ تسلطی معیشت کی طرح ان کی حوصلہ شکنی کریں۔ اس کے معاشی پیمانے زیادہ درست جامع اور اس کے ڈھانچے زیادہ منصفانہ ہوتے ہیں۔

مسئلہ یہ ہے اور یہ کوئی چھوٹا مسئلہ نہیں، کہ روائتی معاشی پالیسیاں اور روایات پائیدار نہیں ہیں۔ ان پالیسیوں اور وتیروں نے بہت سے عالمی مسائل کو جنم دیا ہے اور انہیں اسی نظام کے اندر رہ کر حل کرنا ممکن نہیں کہ جس کا یہ شاخسانہ ہیں۔

سائنسدان مسلسل یہ انتباہ کرتے چلے آرہے ہیں کہ اگر ہم ان پالیسیوں اور وتیروں میں کوئی انقلابی تبدیلی نہیں لاتے کہ جو ارضی درجہ حرارت میں اضافہ کا موجب بن رہے ہیں تو اس صدی کے اختتام تک سمندری طوفان ساحلی شہروں۔۔۔بشمول لندن، نیویارک اور میامی ۔۔۔ کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ وہ ہمیں یہ بھی خبردار کر رہے ہیں کہ یہ آفات عالمی معیشت کا دیوالیہ نکال سکتی ہیں۔(15) مگر ان سب تنبیہات کے باوجود "تسخیر فطرت" کے تصور پر مبنی پرانی معاشی پالیسیوں، رویوں اور وتیروں میں اب تک محض نام کی ہی تبدیلیاں

دیکھنے کو ملی ہیں۔ کرہ ارض پر بھوک اور افلاس کے مناظر بھی نظام میں کسی بڑی تبدیلی کی ضرورت کی غمازی کر رہے ہیں۔

اور تو اور پندرہ صنعتی ممالک ---بشمول امریکہ--- میں سے گیارہ ایسے ہیں جن میں گذشتہ دھائی کے دوران کم آمدنی والے گھرانوں میں پرورش پانے والے بچوں کی شرح میں تشویشناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔(16) 2004 میں امریکہ میں ایسے بچوں کی تعداد 14 ملین تھی۔(17)امریکہ میں معمر افراد کے مسائل سے متعلق کام کرنے والے ایک ادارے کی رپورٹ کے مطابق امریکہ میں بھوک کے شکار معمر افراد کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔(18) یہ اعداد و شمار اس ملک کے متعلق ہیں جو اس دنیا میں سب سے زیادہ خوراک پیدا کرنے والا ملک کہلاتا ہے۔ 2004ء کی امریکی گھرانوں میں غذائی تحفظ سے متعلقہ ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت 38.2 ملین امریکی ایسے گھرانوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں جو بھوک اور غذائی عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ اگر 1999 کے اعداد و شمار کا جائزہ لیں تو ایسے افراد کی تعدار د میں 43 فی صد اضافہ ہوا ہے۔(19) لیکن ان تمام جائزوں اور رپورٹوں کے باوجود متوجہ پالیسیوں کو پھر بھی غلط تناظر میں دیکھا جا رہا ہے۔ آپ اس بات کو ہی ملاحظہ کریں امریکہ میں گذشتہ چند برسوں کے دوران سب سے زیادہ توجہ و نگہداشت کے متقاضی افراد یعنی بچوں ، بوڑھوں اور خواتین کے لیے مختص سالانہ رقوم میں بڑے پیمانے پر تخفیف کر دی گئی ہے۔

ترقی پذیر دنیا میں خوراک، علاج معالجے اور پانی جیسی بنیادی اشیائے ضروریہ کی اس سے بھی زیادہ قلت ہے۔ لیکن عالمی مالیاتی فنڈ اور دیگر بین الاقوامی اداروں کو مطلوب ساختی تبدیلیوں اور نج کاری کی وجہ سے ان خدمات میں جو لوگوں کی نگہداشت کو یقینی بناتی ہیں، میں تخفیف ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ان ترقی پذیر ممالک کے، جن کو بڑی کاروباری کارپوریشنیں ملازمتیں برآمد کر رہی ہیں ملازموں کے حالات اس سے بھی بدتر ہیں جو کہ ترقی یافتہ دنیا میں انیسویں اور بیسویں صدی کے ''قزاق ٹھاکر'' سرمایہ داریت کے دور میں دیکھنے کو ملتے تھے۔ اور جیسا کہ تسلطی نظام میں عموماً ہوتا ہے، ان ممالک میں امراء اور وڈیرے تو مال و دولت کے انبار جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور دوسری طرف عوام کو روح اور جسم کا رشتہ برقرار رکھنے میں بھی دشواری پیش آ رہی ہے۔

MashalBooks.com

امریکہ جیسے ملک میں بھی مہنگائی کے پیش نظر ملازمتوں اور محنت کش افراد کی تنخواہوں اور اجرتوں میں اضافے کی بجائے تخفیف واقع ہو رہی ہے جبکہ دوسری طرف بڑی کاروباری کارپوریشنوں کے سرکردہ افسروں کی تنخواہیں آسمان کو چھوتی نظر آ رہی ہیں۔(20)

موجودہ پالیسیوں نے آبادی میں بے تحاشا اضافے کے مسئلے کو بھی مزید خراب کیا ہے۔ دنیا کی آبادی جو پہلے ہی 65 بلین کی خطرناک حد تک پہنچ چکی ہے، آئندہ پچاس برس سے بھی کم عرصے میں نو بلین تک پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ آبادی کی اس شرح اضافہ کا نوے فی صد حصہ ان مفلس ترین ممالک میں دیکھنے کو آ رہا ہے جہاں ہر روز ہزاروں بچے (نیز مرد اور عورتیں) تشدد اور غذائی قلت کی وجہ سے موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ عوامل اور نوجوان افراد میں تیزی سے بڑھتی ہوئی بیروزگاری ایک عادلانہ، پرامن اور پائیدار مستقبل کے خواب کو اس وقت تک شرمندہ تعبیر نہیں ہونے دیں گے جب تک کہ معاشی پالیسیوں میں انقلابی تبدیلیاں عمل میں نہیں لائی جاتیں۔

تسلطی نظام، جو کہ عورت کو تناسلی آزادی دینے سے انکاری ہے، کے تقاضوں کے عین مطابق عالمی خاندانی منصوبہ بندی کے لیے مختص امریکی مالی امداد میں بھی زبردست کمی کر دی گئی ہے۔ یہ کمی اسقاط حمل کے رجحان میں تخفیف کو بہانہ بنا کر کی گئی ہے جبکہ سچی بات یہ ہے کہ اسقاط حمل کے رجحان کو خاندانی منصوبہ بندی کے بغیر روکا نہیں جا سکتا۔(21) ان سب عوامل کی وجہ سے آبادی کی شرح اضافہ میں کوئی قابل قدر تخفیف عمل میں لانا ایک انتہائی گمبھیر مسئلے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

ملازمتوں کا مستقبل انتہائی مخدوش دکھائی پڑتا ہے۔ امریکہ میں بہت سے افراد صنعتیں اور ہائی ٹیکنالوجی ملازمتیں مفلس ممالک کو برآمد کرنے کے رجحان کی وجہ سے اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ ملازمتیں بھی اب تیزی سے دو زمروں میں تقسیم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ایک طرف تو کارپوریٹ ناظمین، ٹیکنوکریٹس اور اعلیٰ شعبوں مثلاً وکالت، طب اور یونیورسٹیوں کی پرکشش تنخواہوں اور مراعات والی ملازمتیں ہیں اور دوسری طرف نچلے طبقے کے عوام کے لیے کم آمدنی والی بچی کھچی معمولی ملازمتیں ہیں۔ وہ بھی اگر انہیں مل جائیں تو!

اس سے بھی گمبھیر اور فوری مسئلہ جو ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے وہ فنی آلات اور مشینوں کے روبہ اضافہ استعمال کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیروزگاری ہے۔ متمول ممالک میں اس سے

پیشتر صنعتی حرفتوں کا مہیا کردہ روزگار----یعنی کارخانوں میں پرزے جوڑنے والے کارکنوں اور ٹیلی فون آپریٹروں سے لے کر وسطی ناظمین تک کی ملازمتیں---- بھی اب معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک میں آگے اس وقت دیکھیں کیا ہوتا ہے جب مستقبل میں ہم روبوٹوں ، ذکاوت مصنوعی اور دیگر اعلی اور طاقت ور حرفتوں کو اور بھی زیادہ شدومد سے استعمال کرنے لگ جائیں گے۔

کچھ عرصہ سے ترقی پذیر اور ترقی یافتہ دونوں انواع کے ممالک میں وسیع پیمانے کی بے چینی اور اضطراب کے آثار دیکھنے کو مل رہے ہیں اور اس تیزی سے بدلتی، غیر مستحکم دنیا کے انتہائی منقبض بازار روزگار میں جوں جوں ملازمتوں کے امیدوار نئے نوجوان داخل ہوتے جا رہے ہیں اس اضطراب میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں نام نہاد بنیاد پرست مذہبی جماعتوں کے قائدین حلیف بمقابلہ حریف طرز کی

امریکہ کس کی ملکیت ہے؟

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بالائی طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک فی صد افراد قومی مالیاتی دولت کے چالیس فی صد حصے پر قابض ہیں۔ اوپر کی دس فیصد آبادی بچاس سے نوے فیصد حصص، بانڈز، اور تمسکات اور پچھتر فیصد غیر خانگی غیر منقولہ جائیداد کی مالک ہے۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر جی۔ ولیم۔ ڈام ہاف

سب سے بالا ایک فی صد
چالیس فی صد مالی دولت

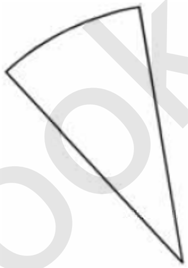

اسی فیصد نچلی آبادی:
نو فیصد مالی دولت
اس سے اوپر کے دس فیصد
گیارہ فی صد مالی دولت
اس سے اوپر کے پانچ فیصد
بارہ فیصد مالی دولت
اس کے بعد چار فی صد
اٹھائیس فی صد مالی دولت

امریکہ میں مالی دولت کی تقسیم۔ 2001 (23)

کا کہنا ہے کہ'' چونکہ آمدن پیدا کرنے والے اثاثوں کے کنٹرول کے اعتبار سے مالی دولت ہی ایک اہم چیز ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ صرف دس فی صد افراد پورے امریکہ کے مالک ہیں۔'' اس کے مقابلے میں صرف نو فی صد قومی مالیاتی دولت زیریں اسی فی صد افراد کی ملکیت میں ہے۔ اس کے علاوہ کثیر تعداد میں امریکی ایسے ہیں جن کے پاس نام کو بھی کوئی اثاثہ نہیں بلکہ بعض تو ایسے ہیں جو مقروض ہونے کے سبب منفی مالی دولت کے مالک کہلائے جاتے ہیں۔(22)

پرانی تسلطی نفرت کا پرچار کر رہے ہیں اور اپنے عزائم پورے کرنے کے لیے دہشت گردوں کو استعمال میں لا رہے ہیں۔ امریکہ میں بھی دہشت گردی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور نفرتوں کا پرچار کرنے والے گروہ اپنے تمام مسائل کا الزام امریکہ میں موجود غیر اقوام کے باشندوں، یہودیوں، سیاہ فام نسل کے افراد اور گاہے گاہے خواتین کے سر تھوپتے رہتے ہیں۔ یورپ میں بھی ان کے سر مونڈھے نظریاتی کزن بم چلا رہے ہیں اور اس طرح کمزور ترین گروہوں کے افراد کو قربانی کا بکرا بنا رہے ہیں۔ المختصر تسلطی رجعت میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتے ہوئے، لوگوں کے جذبات سے کھیلنے والے سیاسی قائدین عوام میں پائے جانے والے خوف اور مایوسی کا رخ تشدد کی جانب مبذول کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اس طرح وہ ایک ناگفتہ بہ نوع کی ابتری کا موجب بن رہے ہیں اور پوری دنیا میں کاروبار و تجارت کے لیے روز افزوں غیر مستحکم حالات پیدا کر رہے ہیں۔(25)

ان مسائل کا موثر انداز میں سامنا کرنے کے لیے ایک ایسا منظم اور باقاعدہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے جو فقط معاشی پالیسیوں پر ہی توجہ مرکوز نہ رکھے بلکہ سماجی اداروں اور ثقافتی روایات پر بھی دھیان دے۔ اس کے لیے ہمیں ایسا طرزِ عمل اپنانے کی ضرورت ہے جو ہمارے کج نظام اقدار اور ان معاشی ترجیحات کو آنک کران میں انقلاب برپا کرے جو ہمیں عصرِ رفتہ کے نسبتاً زیادہ تسلطی معاشروں سے ان دیکھے تحائف کی صورت میں ور شہ میں ملی ہیں۔

متوجہ معاشیات کی ترویج کے لیے ضروری عملی اقدامات:

اگر ہم حالیہ مالیاتی ترجیحات کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ارباب اختیار کو تسلط اور کنٹرول (مثلاً جیلوں، ہتھیاروں اور جنگوں) کے لیے پیسے کی کبھی بھی محتاجی نہیں آتی مگر ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ توجہ و دیکھ بھال کی ''نسوانی'' خدمات مثلاً نگہداشت اطفال، صحت عامہ، انسدادِ تشدد اور امن کے لیے خزانے میں پائی بھی باقی نہیں بچی۔

اقدار کا یہ غیر متوازن نظام ہمارے لاشعوری ذہن کی گہرائیوں میں رچا بسا ہوا ہے۔ ہم میں سے بیشتر تو بیچارے اس بات سے بھی آگاہ نہیں کہ ہم جب بھی کسی چیز کی قدر افزائی یا بے قدری کرتے ہیں تو ہمارا رویہ اور ہمارا معاشی نظام--- جنسی تفریق وتفوق کی اقدار کے اسی نظام پر مبنی ہوتا ہے۔ نتیجتاً التفات واعتنا کی بے قدری--- اور حقیقی زندگی میں ہمیں اس کے پیش آمدہ نتائج--- کو عموماً تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔

پرانے معاشی نظاموں سے محض ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کرنے سے کام نہیں بنے گا۔ ہمیں ایک بالکل جدید معاشیات کی ضرورت ہے جو ہمیں درپیش ذاتی، سماجی اور ماحولیاتی مسائل کا مقابلہ کرنے میں ہماری مدد کرسکے۔ ہمیں ایک متوجہ معاشیات کی ضرورت ہے۔ اور اس کی طرف منتقلی میں وقت لگے گا۔ اس کے لیے ثقافتی اقدار نیز سماجی اداروں میں تبدیلیاں لانا ہوں گی۔ لیکن اگر ہم خود کو اس کام کے لیے وقف کردیں تو یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔

عقائد و روایات اور پالیسیوں میں تغیرات انسانوں کے ذریعے سے واقع ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے اردگرد کے معاشرے میں کیا وقوع پذیر ہو رہا ہے، ہم میں سے بعض افراد اس پر براہ راست اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ ہم میں سے بیشتر مذہبی، پیشہ وارانہ اور سیاسی تنظیمات کے

ذریعے اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں اور انہیں اپنی قردادوں اور ایجنڈوں میں متوجہ معاشیات شامل کرنے کی ترغیب دے سکتے ہیں۔ ہم میں سے چند افراد ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ جو قومی اور بین الاقوامی پالیسیوں پر اپنا اثر ڈال سکیں۔ تاہم مروجہ معاشی نظاموں میں بسی مریضانہ اقدار کے بارے میں آگہی پھیلانے کا فریضہ تو ہم سب انجام دے ہی سکتے ہیں اور اس تصنیف میں پیش کردہ تجاویز اور خود اپنا ذہن اور صلاحیت استعمال کر کے اس بارے میں لکھ سکتے ہیں اور لوگوں سے بات کر سکتے ہیں۔

متوجہ معاشیات کی طرف ایک اہم قدم معاشی حساب کتاب اور جانچ کے ایک زیادہ درست نظام کی تشکیل ہے۔ ہمیں ایسے معاشی پیمانے وضع کرنے کی ضرورت ہے کہ جو معاشی پیداواریت کے اپنے تخمینوں اور جائزوں میں توجہ ونگہداشت کی قدر نیز ان کی بے قدری سے ہونے والے خسارہ جات کو بھی حساب میں لائے۔(26) ایسے پیمانے اس متوجہ معاشیات کے اصول اولین سے آپ ہی آپ مترشح ہونے لگیں گے جسے ہم ایک ایسا مکمل معاشی نقشہ قرار دے سکتے ہیں جن میں کنبہ، رضا کار اور قدرتی معاشی شعبہ جات بھی آجاتے ہیں۔

متوجہ معاشیات کی منزل کے حصول کے لیے ضروری اقدامات

ہمارے گمبھیر سے گمبھیر تر ہوتے عالمی مسائل سے صحیح معانوں میں عہدہ برآ ہونے کے لے ہمیں چند کلیدی تبدیلیاں عمل میں لانا ہوں گی جن میں معاشی پیمائشوں، اداروں اور اصولوں کی تبدیلی بہت اہم ہے۔ اس میں وقت ضرور لگے گا مگر ہر عمل خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو تغیر کی سلسلہ جنبانی ضرور کرتا ہے۔ میں زیریں سطور میں سات تجاویز دے رہی ہوں جن پر عمل کر کے ہم اپنے معاشی آدرش کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ اور نہیں تو کم از کم ہم تحریر وتقریر کے ذریعے سے اپنا کردار ضرور ادا کر سکتے ہیں۔

1۔ اس چیز کو باور کریں کہ توجہ ونگہداشت کی ثقافتی بے قدری نے ہمارے معاشی نظریات، روایات اور پالیسیوں پر کیا منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔

2۔ تسلطی نظام سے شراکتی ثقافتی اقدار اور معاشی ومعاشرتی منہاجات کی طرف منتقلی کے عمل کو تقویت دیں۔

3۔ معاشی پیمانوں میں اس طرح کی تبدیلیاں عمل میں لائیں کہ توجہ ونگہداشت کو وقعت مل سکے۔

4۔ ایسی معاشی ایجادات عمل میں لائیں جو توجہ ونگہداشت کو فروغ دیں اور اس کی صحیح پذیرائی کریں۔
5۔ معاشی لغت کو اس طرح وسعت دیں کہ اس میں توجہ واعتنا کو بھی شامل کیا جاسکے، متوجہ معاشیات کو تجارتی اور معاشی مدارس میں پڑھایا جائے اور جنسی امتیاز سے متعلق معاشی تحقیق عمل میں لائی جائے۔
6۔ بچوں اور بڑوں کو توجہ ونگہداشت کے متعلق تعلیم دی جائے۔
7۔ حکومتی اور کاروباری قائدین کو توجہ ونگہداشت کو فروغ دینے والی پالیسیوں کے فوائد سے آگاہ کیا جائے اوران کے نفاذ کے لیے کام کیا جائے۔

ہمارے معاشی نظاموں اور پیمائشوں میں تبدیلی لانے سے ایسی معاشی ایجادات کی راہ بھی ہموار ہوسکتی ہے جو توجہ ونگہداشت کی مناسب قدر افزائی کرسکیں۔ یہ امر، جیسا کہ ہم دیکھتے آئے ہیں متوجہ معاشیات کی ایک دوسری اساس کی طرف توجہ کا تقاضہ کرتا ہے۔ اس سے میری مراد ثقافتی عقائد اور سماجی اداروں میں ایسی تبدیلی ہے کہ جس سے وہ توجہ ونگہداشت کی بے قدری کی بجائے اس کی قدر افزائی کرنے لگیں۔

ہماری بہت سی اقدار اور معاشی ومعاشرتی طور طریقے ہمیں عصر رفتہ سے ورثے میں ملے ہیں جو تسلطی نظام سے زیادہ قریب تھا۔ یہ ورثہ ایک زیادہ منصفانہ اور پائیدار معاشی نظام کے قیام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ایک بار جب ہم اس مسئلے سے آگاہ ہو جاتے ہیں تو ہم تسلطی اقدار و روایات کی بجائے ایک ایسی حکومت اور کاروباری پالیسیوں کے لیے کام کر سکیں گے کہ جو شراکتی اقدار کی حوصلہ افزائی کریں۔

ہمیں منڈی کی ایک ایسی معیشت درکار ہے جو نرسنگ اور نگہداشت اطفال ومعمرین کے ان پیشوں کو زیادہ وقعت دے جو کہ ایک صحت مند معیشت اور معاشرے کے لیے لازمے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان پیشوں کی بے قدری کو، جیسا کہ بعض اوقات خیال کیا جاتا ہے، محض طلب ورسد کا ایک تفاعل تصور نہیں کیا جانا چاہیے۔ اصل میں یہ تفاعل ہے اس ہر شے کی ثقافتی بے قدری کا جسکا کہ تعلق خاص طور پر خواتین یا نسوانیت سے بنتا ہے اور یہ، جیسا کہ ہم آئندہ ابواب میں دیکھیں گے، ہم سب کے لیے منفی اثرات کو جنم دیتا ہے۔

جنسی تفاوت پر مبنی تعصّبات میں نرمی آجانے کے باعث آجکل بہت سے مرد حضرات بھی

نگہداشت اور دیکھ بھال کے کاموں میں دل چسپی لینے لگے ہیں مگر ان شعبوں اا جرت اور عزت اتنی کم دی جاتی ہے کہ وہ ایک قدم آگے جا کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک نمایاں مثال نگہداشت اطفال کے مراکز میں ملنے والے کام کی ہے۔ اس طرح کونسلرز اور ابتدائی مدارس کے اساتذہ کو بھی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور بعض دیگر افراد ایسے بھی ہیں جو بچوں اور ان کے والدین دونوں کی نگہداشت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ اس طرح ہمیں ایسی معاشی ایجادات بھی درکار ہیں جو بیرون بازار معیشت میں توجہ ونگہداشت کے سماجی اعتبار سے ناگزیر ہر کام کی قدر و قیمت کو تسلیم کریں۔ ہمیں ایسی مالیاتی پالیسیاں بھی د رکار ہیں جو ان اہم ترین سرگرمیوں میں سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کریں۔ یہ ایک ایسی سرمایہ کاری ہے جس کے لیے دوسری سرمایہ کاریوں کی طرح الگ رقوم مختص کی جانی چاہییں نہ کہ اسے قومی میزانیے میں ایک مصرف کے طور پر منتھی کر دیا جائے۔ ہمیں کاروباری اصول و ضوابط میں بھی تبدیلی لانا ہوگی تا کہ وہ توجہ ونگہداشت کی راہ میں روڑے اٹکانے کی بجائے اس کی حوصلہ افزائی کریں۔

ہمیں حکومتی سطح پر ایسے تربیتی پروگراموں کی ضرورت ہے جو مردوں اور خواتین کو بچوں کی دیکھ بھال کے فریضے سے موثر طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار کر سکیں۔ اگر ہم معاصر سائنسی تحقیق کی روشنی میں جائزہ لیں کہ بچپن کا ابتدائی تشکیل دور ایک معیاری انسانی سرمائے کی پیداوار کے لیے کس قدر ضروری ہے تو اس طرح کی تربیت کی اہمیت و افادیت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

ایسے حالات میں کہ جب مشینوں کے بڑھتے ہوئے استعمال اور برآمد روزگار کے سبب امریکہ میں ملازمتوں کی کمی واقع ہو رہی ہے، بیروزگار افراد کو فارغ بیٹھنے کا معاوضہ دینے والے ماہرین معاشیات کی آراء میں بھی مجھے کوئی معقولیت نظر نہیں آتی۔ (27)

اس سے زیادہ معقول بات یہ ہے کہ حکومت توجہ ونگہداشت اور توجہ ونگہداشت کی تربیت کے فروغ کے لیے فراخدلانہ وظیفے مقرر کرے۔ اس نگہداشتی مہارت کی اہمیت وضرورت میں ہماری روز بروز بوڑھی ہوتی آبادی کی دیکھ بھال کے پیش نظر اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

معاشی لغت میں توسیع کر کے اعتنا و توجہ دہی کو اس میں شامل کرنے کا کام بھی متوجہ معاشیات کی طرف پیش قدمی کے معاملے میں بہت اہمیت کا حامل ہے اس طرح تجارتی اور

معاشی مدارس وکلیات میں متوجہ معاشیات کی تدریس اور جنسی زاویے سے عمل میں لائی گئی معاشی تحقیق کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

علاوہ ازیں توجہ ونگہداشت کی اہمیت کے بارے میں تعلیم کے ذریعے آگہی پیدا کرنے کی بھی بڑی ضرورت ہے اور اس نوع کی تعلیم و آگہی کا آغاز ابتدائی درجات میں ہی ہو جانا چاہیے۔ مدارس کی بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ بھی نگہداشتی مہارت کی ابتدائی تربیت پر توجہ دیں۔(28) اس سے نوجوان طبقے میں کجروی اور حمل کے انسداد سے لے کر مل جل کر کام کرنے کی عادت اور امداد باہمی کے فروغ تک متعدد مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں۔

سکنڈے نیویا میں واقع فن لینڈ ایسے ممالک کی ایک بہت عمدہ مثال ہے جن میں شراکتی تعلیم کے فوائد بہت واضح طور پر دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ اگر ثانوی درجے کی خواندگی اور ریاضیات سے متعلق بین الاقوامی اعداد وشمار کا جائزہ لیں تو یہ ملک امریکہ کے مقابلے میں کہیں آگے دکھائی دیتا ہے۔ اس ملک کے باشندے بچوں کی تعلیم کے محض پرانے منہاجات پر ہی پیسہ صرف نہیں کر رہے بلکہ تعلیم کے ایک نئے معیار کو ترقی دے رہے ہیں۔ بچوں پر انفرادی توجہ--- بچوں کی نگہداشت--- اور ابتدائی مراحل میں خود تدریسی کے فروغ کو یہاں کے نظام تعلیم میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں بڑے بچے اپنے مدرسے کے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، تمام طلبا کو اپنی اپنی دل چسپی کے مشاغل پر کام کرنے کے پورے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں اور اساتذہ بچوں کو بندشیں لگانے کی بجائے حصول تعلیم میں ان کی معاونت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ ان تمام اقدامات کا مقصد قومی تعلیمی نظام کے لیے ایک نئے شراکتی ڈھانچے کی طرف پیش قدمی کرنا ہے۔

اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ہمارے نظام تعلیم میں تبدیلی پیدا کرنا بہت ضروری ہے تاکہ اس بعدالصنعتی معیشت میں مطلوبہ معیار کے انسانی سرمائے کو یقینی بنایا جا سکے اور بعدالصنعتی معیشت میں مطلوب اعلی معیار کے انسانی سرمائے کو صرف توجہ ونگہداشت کو زیادہ قیمت و وقعت دے کر ہی یقینی بنایا جا سکتا ہے کیونکہ ایک موثر نگہداشت اور تعلیم کا کامل فروغ صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔

ہمیں سیاسی اور کاروباری قائدین پر توجہ ونگہداشت کو فروغ دینے والی پالیسیوں کے فوائد آشکار کرنے چاہییں اور ہم یہ کام کر بھی سکتے ہیں ہم سب کے لیے یہ لازم ہے کہ ہم

کندھے سے کندھا ملا کر ایک زیادہ متوجہ معاشی اور معاشرتی نظام کی منزل کے حصول کے لیے جدوجہد کریں۔

انسانی حوالے سے بات کریں تو توجہ ونگہداشت کی قدر افزائی کے ثمرات کو حساب میں لانا مشکل ہے۔ متوجہ معاشیات سے نہ صرف یہ کہ مختلف اہم انسانی ضروریات کی تکمیل میں مدد ملے گی اور ہماری زندگیوں کو جلا ملے گی بلکہ اگر خالصتاً مالی اور زری حوالے سے بات کریں تو بھی یہ موجودہ نظام کے مقابلے میں زیادہ موثر ہوسکتی ہے۔

انسانی ضروریات کی تکمیل

متوجہ معاشیات بمقابلہ غیر متوجہ معاشیات

متوجہ معاشیات درج ذیل بنیادی انسانی ضروریات کو پورا کرسکتی ہے:

انفرادی : غذا اور بامعنی کام اور زندگیوں کی ضرورت

تنظیمی : اہل اور تخلیقی صلاحیتوں کے حامل افراد کی ضرورت

سماجی : متوجہ اقدار اور پالیسیوں کی ضرورت

ماحولیاتی : قدرتی وسائل کے تحفظ کی ضرورت

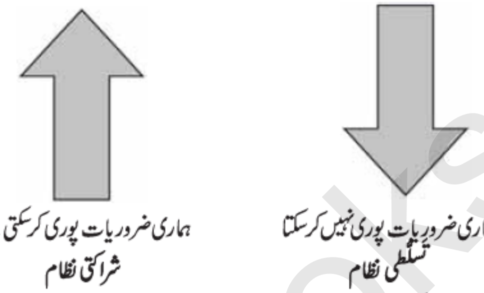

پرانے معاشی نظاموں میں توجہ و احساس کو ایک فعال معیشت کے لیے غیر ضروری بلکہ معاشی فلاح کے لیے ایک رکاوٹ تصور کیا جاتا ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

MashalBooks.com

End of Page No.45

پہلا پروف، فائل چیک ہو چکی ہے۔ حافظ محمد ناصر رشید، 22 دسمبر 2008ء

دوسرا پروف فائل چیک ہو چکی ہے عاصم بدھ 21 جنوری 2008ء

MashalBooks.com

باب سوم

توجہ ونگہداشت کے فائدے............ڈالروں میں

سافٹ ویئر تیار کرنے والی دنیا کی سب سے بڑی نجی کمپنی ایس۔اے۔ایس انسٹی ٹیوٹ کو ایک بہت زیادہ کامیاب کاروباری ادارہ شمار کیا جاتا ہے اس ادارے کو متوجہ پالیسیوں اور روائتوں سے حاصل ہونے والے مالی ثمرات کے بین ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

ایس۔اے۔ایس انسٹی ٹیوٹ خاندان دوست پالیسیوں کا سالار ہے۔ اس میں شمالی کیرولینا ریاست کا سب سے بڑا دفتری ڈے کئیر سینٹر کام کر رہا ہے۔ اس کے کیفے ٹیریا میں چھوٹے بچوں کے لیے مناسب خصوصی اونچی کرسیاں فراہم کی گئی ہیں تا کہ وہ اپنے والدین کی معیت میں کھانا تناول کر سکیں۔ یہ ادارہ اپنے ملازمین اور ان کے اہل خانہ کے علاج معالجے کے تمام اخراجات بھی خود برداشت کرتا ہے۔ یہاں ملازم کارکنان کو فقط سات گھنٹے یومیہ کام کرنا پڑتا ہے اور علیل ہونے کی صورت میں چھٹیوں کی کوئی حد نہیں اور ایسی اتفاقیہ رخصت وہ اپنے بیمار اہل خانہ کی تیمارداری پر بھی صرف کر سکتے ہیں۔

ایس۔اے۔ایس کے شمالی کیرولینا میں کیری کے مقام پر واقع صدر دفتر میں پیرا کی کا تالاب، جاگنگ ٹریک، طبی سہولتوں، کونسلنگ کی سہولیات کا اہتمام موجود ہے اور یہاں دوپہر کے طعام کے لیے ہونے والے وقفے میں میوزک شو بھی منعقد کیا جاتا ہے۔ یہاں ملازمین کے لیے چھتیس ہزار مربع فٹ کی ایک کسرت گاہ بھی بنائی گئی ہے جس میں ورزش اور کلاسوں کے لیے الگ کمرے، یوگا کے لیے ایک الگ جگہ اور باسکٹ بال کے بین الاقوامی معیار کے میدان موجود ہیں۔ اس کے بیرون میں سافٹ بال اور فٹ بال جیسے کھیلوں کے لیے میدان بھی موجود ہیں۔ اس میں ایک فزیوتھراپسٹ کی خدمات بھی حاصل کی گئی ہیں اور ملازمین کو

ورزش کے طریقے بتانے کے لیے ادارے کا ایک کل وقتی ماہر کسرت بھی یہاں موجود رہتا ہے۔ اس کسرت گاہ میں ملازمین جو کسرتی لباس استعمال کرتے ہیں اس کی دھلائی تک ادارے کے ذمے ہے۔لیکن اپنے عملے کی دیکھ بھال پر اتنا پیسہ خرچ کرنے والے اس ادارے کے کاروبار میں کسی خسارے کی بجائے مسلسل بیس برس سے بڑھوتری دیکھنے میں آرہی ہے۔(1)

ایس۔اے۔ایس کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس ادارے میں کام کرنے والے افراد کو ایک ایسا ماحول فراہم کرتا ہے جو ہر سطح پر ان کی بہبود اور خوشحالی کا خیال رکھتا ہے۔ یہاں کام سے فارغ ہو جانے کے بعد بھی ملازمین کے پاس اس قدر فراغت اور توانائی باقی بچ جاتی ہے کہ وہ ایک صحت مند خاندانی زندگی گزار سکیں۔ علاوہ ازیں یہ انہیں فقط بیماری کی چھٹیاں دینے کی بجائے صحت برقرار رکھنے کے لیے شاندار پروگرام مہیا کرتا ہے اور ان کے گھرانے کے ہر فرد کو تعلیمی اور طبی سہولیات فراہم کرتا ہے اور انہیں اپنا گھر بنانے اور سنوارنے میں بھی مدد دیتا ہے۔

مزید یہ کہ ادارہ انہیں ملازمت کا تحفظ، جسمانی طور پر محفوظ اور آرام دہ کام کی جگہ اور ان کے کام کو عزت و احترام دیتا ہے۔(2)

لہذا اس میں کوئی اچنبھے والی بات نہیں کہ اس ادارے کو ہزاروں کی تعداد میں ملازمت کی درخواستیں موصول ہوتی ہیں اور ہر دفعہ فارچون رسالے کے ''سو بہترین آجر اداروں'' میں پہلے دس میں سے ایک پوزیشن اس کی ضرور ہوتی ہے۔ اس میں بھی کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ ایس۔اے۔ایس کے ملازمین اس ادارے کی کامیابی کے لیے دل و جان سے کوشش کرتے ہیں اور سدا اس میں کام کرتے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس ادارے کے اپنے کارکنوں اور ان کے اہل خانہ کو اس قدر مراعات فراہم کرنے کے طفیل اس کے عملے میں تبدیلی کی شرح صرف چار فی صد مشاہدے میں آئی ہے جو کہ اس صنعت کی اوسط یعنی بیس فی صد سے بہت زیادہ نیچے ہے۔ اس کے ملازمین ادارے کی شراکتی انداز کی نظامت کو بھی بہت پسند کرتے ہیں جو ادارے میں اظہار خیال کی حوصلہ افزائی کر کے ادارے کی کامیابی میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔

ایس۔اے۔ایس کی مانند کامیاب کاروباری اداروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے جو تسلطی ڈھانچوں کی جگہ توجہ و دیکھ بھال کو صحیح وقعت دے کر روائتی کاروباری اداروں کی نسبت بہت زیادہ پیسہ کما رہے ہیں۔

MashalBooks.com

2004ء میں فارچون سمال بزنس ایوارڈ، نیو ایج ٹرانسپورٹیشن کی سربراہ کیولن گیبل کو دیا گیا۔ گیبل، جو کہ کبھی بیرا گیری سے روزی کماتی تھی اور جو اب پانچ بچوں کی غیر متزوج ماں ہے، نے یہ ادارہ اپنے گھر سے شروع کیا۔ یہ اس کی قائدانہ صلاحیتوں اور اختراعی ذہن کا کمال ہے کہ وہ اب انتہائی وفادار کارکنوں پر مشتمل ایک بہت بڑے ادارے کی مالک ہے جس کی کل مالیت 25 ملین ڈالر سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔

گیبل اپنے ملازمین کو ایسا ماحول فراہم کرنے کی کوشش کرتی ہے جس میں وہ اپنے کام پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ ایک صحت مند اور متوازن زندگی گزار سکیں۔ اس ادارے میں ایک بڑا اسپورٹس ہال بنایا گیا ہے جہاں ملازمین اپنے بچوں کے ساتھ کھیل سکتے ہیں۔ ایک ''ایوان سکوت'' بھی ہے جسے ادارے میں کام کرنے والے خود کو پرسکون کرنے اور اپنی توانائی بحال کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہاں ایک الگ احاطہ بھی بنایا گیا ہے جہاں عملے کے افراد صاف موسم میں اکٹھے ہو کر باربی کیو سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ گیبل اپنے ملازمین کو ادارے سے باہر بھی اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرتی ہے اور انہیں مراکز صحت کی رکنیت حاصل کرنے کی ترغیب دینے کیلئے سارے اخراجات دفتر کے کھاتے سے ادا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ انہیں تمباکو نوشی چھوڑنے کے لیے ایک سال تک 250 ڈالر کے برابر رقم فی سہ ماہی بھی ادا کرتی ہے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی شاہ خرچ پالیسیوں سے اس ادارے کو کوئی خسارہ پہنچتا ہوگا؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس ادارے کے کھاتے اوسطاً 37 فی صد سالانہ ترقی دکھاتے نظر آتے ہیں۔(3)

اس کے علاوہ بھی متعدد کاروباری ادارے ہیں جو چھوٹی اور بڑی دونوں قسم کی کمپنیوں کو متوجہ پالیسیوں اور روایات سے ملنے والے فوائد کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور اشاعتی ادارے۔ ہیرٹ کوہلر اور نیو ورلڈ لائبریری اور طبی مصنوعات تیار کرنے والے ادارے جانسن اینڈ جانسن کی مثال دی جا سکتی ہے جس کا نام گذشتہ بیس سالوں سے ملازم پیشہ ماؤں کی بہترین کمپنیوں کی فہرست میں شامل چلا آ رہا ہے۔ اس نوع کے ادارے ظاہر کرتے ہیں کہ توجہ و نگہداشت محض امیر اداروں کی طرف سے اپنے ملازمین کو فراہم کی جانے والی عیاشی نہیں بلکہ ان کمپنیوں کو مزید کامیاب بنانے کا ایک بڑا سبب ہے۔ کیا توجہ و نگہداشت پر مبنی پالیسیوں سے حاصل ہونے والے ثمرات کو ظاہر کرنے کے لیے یہی صرف چند واقعات اور مثالیں ہیں؟

کیا ہم توجہ ونگہداشت کی قدر افزائی کے فوائد کا شماریاتی طریقوں سے حساب کر سکتے ہیں؟
ہاں۔ بالکل! اس ضمن میں کی گئی سینکڑوں تحقیقات ظاہر کرتی ہیں کہ توجہ ونگہداشت پر مبنی پالیسیاں اور ان وظائف کو سرانجام دینے والے افراد کی پذیرائی مالی اعتبار سے بھی بہت مثبت اثرات مرتب کرتی ہے۔ اور اسی پر موقوف نہیں۔ غیر متوجہ کمپنیوں اور حکومتی پالیسیوں، اصولوں اور وتیروں سے برآمد ہونے والے خسارہ جات کا حساب بھی لگایا جا سکتا ہے---اور اس کا بھی کوئی انت نہیں۔

شماریاتی شواہد

میرا موقف یہ ہے کہ کاروباری سرگرمیوں کو مالی اور معاشرتی دونوں اعتبار سے منافع بخش ہونا چاہیے۔ متوجہ کاروباری پالیسیاں ملازمین کی تبدیلی میں بہت تیز تخفیف عمل میں لاتی ہے جن سے ادارے کو لاکھوں ڈالر کا مالی منافع پہنچتا ہے۔ ساعتی کارکنان کو تبدیل کرنے پر کمپنی کو ان کی چھ ماہ کی آمدن کے برابر خسارہ ہوتا ہے۔ ماہانہ تنخواہ پر کام کرنے والے ملازمین کو تبدیل کرنے کے لیے ادارے کو ان کی اٹھارہ ماہ کی تنخواہ کے برابر تنخواہ کا خرچہ کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ عمال کی آمدورفت آجرین کے لیے سالانہ منافع کے چالیس فی صد کے برابر خرچے کی باعث بھی بن سکتی ہے اور اس میں کی گئی ایک نئی تحقیق کے نتیجے میں سامنے آنے والی بات تو ہم نے اب تک کی ہی نہیں۔ یہ تحقیق بتلاتی ہے کہ کسی ادارے کو چھوڑ کر جانے کا ارادہ رکھنے والے ملازمین میں سے تیس سے چالیس فی صد تک ادارے کو چھوڑ کر جانے سے قبل ہی ذہنی و جذباتی طور پر ادارے کو چھوڑ جاتے ہیں اور اپنی حالیہ ملازمت میں دل چسپی کم کر کے اپنی ذہنی توجہ نئی ملازمت کی طرف مرکوز کر لیتے ہیں۔(4)

ملازمین کی غیر حاضری پر بھی ادارے کو بہت خسارہ پہنچتا ہے اور ان غیر حاضریوں کا صریح سبب ملازمین کی عائلی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ مثلاً کیمیکل بینک کے فراہم کردہ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ملازمین کی 52فی صد غیر حاضریوں کے پیچھے ان کے کنبے سے متعلقہ مسائل کارفرما تھے۔(5)

متوجہ پالیسیوں پر کاربند اداروں کے عملے کی تبدیلی اور غیر حاضریوں کی مد میں ہونے والے خسائر میں ڈرامائی کمی دیکھنے میں آتی ہے۔ ادارے کی حدود میں نگہداشت اطفال کا

اہتمام کرنے سے انٹر میڈکس کمپنی کے عملے کی آمدورفت کی شرح میں 37فی صد تک تخفیف واقع ہوئی ہے جس سے ادارے کو پندرہ ہزار ساعات عمل اور دو ملین ڈالر کا فائدہ ہوا۔

ادارے کی حدود میں بچوں کی دیکھ بھال کے مرکز کے قیام سے سیاٹل میں واقع ورجینا میس میڈیکل سنٹر کے عملے میں تبدیلی کی شرح صفر فی صد تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے اداروں میں یہ شرح 13فی صد کے لگ بھگ ہے۔ جانسن اینڈ جانسن نے یہ اخذ کیا ہے کہ لچک دار اندز کار اور عائلی رخصت کی پالیسیوں کے مطابق کام کرنے والے ملازمین میں غیر حاضریوں کی شرح دیگر عملے کے مقابلے میں اوسطاً پچاس فی صد تک کم دیکھنے میں آتی ہے۔(6)

ایسے ادارو ں میں جن میں عام دفاتر کی نسبت زیادہ دورانیے کے لیے کام ہوتا ہے، غیر حاضری اور دفتر بدلی کی شرح میں اضافہ اور ان کی وجہ سے اوور ٹائم پر اٹھنے والے اخراجات کا ایک خاص طور پر اہم سبب بچوں کی دیکھ بھال کی خدمات کے حصول میں پیش آنے والی مشکلات ہیں۔ ایک امریکی فرم سرکیڈین ٹیکنالوجیز کی 2003ء میں مرتبہ ایک رپورٹ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نگہداشت اطفال کی زیادہ دورانیے کی سہولت فراہم کرنے سے اس کے ملازمین کی غیر حاضریوں کی شرح میں اوسطاً بیس فی صد کمی واقع ہوئی ہے۔ اس تحقیق بعنوان ''نگہداشت اطفال کی زیادہ دورانیے کی سہولیات کی فراہمی سے حاصل ہونے والے اخراجاتی فوائد'' سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ادارے کی حدود میں بچوں کی دیکھ بھال کی سہولیات مہیا کیے جانے پر دیر تک کام کرنے والے ملازمین میں دفتر بدلی کے رجحان میں بھی قابل قدر تخفیف ہوئی ہے اور ایسے واقعات کی تعداد 9.3فی صد سے کم ہو کر 7.7فی صد تک آ گئی ہے۔ اسے اس ادارے کے لیے ایک بڑی بچت قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس نوع کے ملازم کی خدمات حاصل کرنے اور اسے تربیت دینے پر ایک کمپنی کو پچیس ہزار ڈالر کے برابر خرچہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔(7)

اس بچت سے البتہ بچوں کی دیکھ بھال کی سہولیات کی فراہمی سے تقریباً 28فیصد ان امریکی خواتین کو پہنچنے والے بے بہا فوائد کی عکاسی نہیں ہوتی جو باقاعدہ طور پر رات، شام یا چھٹی کے دن خدمات سرانجام دیتی ہیں۔ یہ معاشرے کو آج کے دور میں حاصل ہونے والے

فوائد کی عکاسی سے بھی قاصر ہے کہ جس میں ملازمت پیشہ افراد کے نگہداشت سے محروم بچے امریکہ کے لیے ایک بڑی تشویش کا باعث بن چکے ہیں۔

روائتی عملے میں نگہداشتی وظائف سرانجام دینے والے افراد کی پذیرائی جیسا کہ یُو سی ہیسٹنگز کالج آف دی لا میں قانون عمل و حیات کے مرکز کے ڈائرکٹر پروفیسر جون سی ولیمز کا کہنا ہے، صرف کاروباری مسئلہ ہی نہیں بلکہ ایک پبلک پالیسی کا معاملہ ہے۔ عائلی امتیاز کے خلاف قانون سازی کرنے کی اشد اور فوری ضرورت محسوس کی جا رہی ہے، خصوصاً کم ترین معاشی حیثیت کے حامل ان کارکنوں کے لیے کہ جو زیادہ سودے بازی نہیں کر سکتے۔(8)

موجودہ دور میں ہماری افرادی قوت کے 37فی صد حصے کے بچوں کی عمریں اٹھارہ برس سے کم ہیں۔ اس میں چنداں حیرانی کی بات نہیں کہ ریڈکلف سروے کے مطابق 21 سے 29برس کی عمر تک کے خواتین وحضرات نے اپنے اہل خانہ کے ساتھ وقت گزارنے کو اپنی ترجیحات کی فہرست میں سب سے اوپر رکھا ہے، پرکشش تنخواہ اور باوقار ملازمت کا نمبر بہت بعد میں آتا ہے۔(9)ابھی جوں جوں امریکی بوڑھے ہوں گے یہاں کے کارکنوں میں نگہداشت کے وظائف سرانجام دینے والے افراد کی تعداد میں اور بھی زیادہ ڈرامائی انداز میں اضافہ ہوگا۔ ایک تخمینے کے مطابق 2020 تک پچاس سے زائد عمر کے افراد مشتمل آبادی میں چوہتر فیصد اضافہ ہوگا۔ مگر اس کے مقابلے میں پچاس سے کم کے افراد پر مشتمل آبادی میں صرف ایک فی صد اضافہ متوقع ہے۔(10)ایک اور سروے کے مطابق 54فیصد امریکی کارکنان یہ توقع کرتے ہیں کہ آئندہ دس برسوں میں انہیں اپنے معمر والد یا والدہ کی دیکھ بھال کے لیے وقت دینا ہوگی۔ ادارہ عائلات وعمل اور متعدد دوسری تنظیموں سے موصولہ رپورٹوں نیز سینڈرا بُرڈ اور میری ٹو مولو کی تحریر کردہ کتاب انسانی سرمائے سے متعلقہ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے ہ کاروباری اداروں کی پالیسیاں وضع کرتے وقت ان حقائق کو سامنے رکھنا نہ صرف سماجی اعتبار سے بہت ضروری ہے بلکہ کاروباری لحاظ سے بھی یہ بہت معقول اقدام ہوگا۔(12)

متعدد تحقیقات سے یہ بات آشکارہ ہو رہی ہے کہ اس اندازفکر کی وجہ سے کہ لوگ جب کام پر آتے ہیں تو وہ اپنے بقیہ سب معاملات پیچھے چھوڑ آتے ہیں، اداروں کو بہت بھاری قیمت چکانا پڑتی ہے۔ اسی طرح ایسی کاروباری پالیسیوں کے اثمار کا حساب بھی مشکل ہے جو کارکنوں کی ذاتی زندگی کو بھی قابل اعتماد سمجھتی ہیں۔KPNG کے نگہداشت اطفال کے

MashalBooks.com

ایمرجنسی بیک اپ پروگرام کی خدمات حاصل کرنے والے افراد کے انٹرویو پر مبنی ایک تحقیق کے مطابق ملازمین کو نگہداشت اطفال کی سہولت مہیا کرنے سے سرمایہ کاری پر پہلے چھ ماہ کے دوران 125 فی صد فائدہ حاصل ہوا۔ چار سال کے

نگہداشت پر سرمایہ لگانے کا کاروباری فائدہ

سینڈرا ئرڈ اور میری ٹومولو کی مذکورہ بالا کتاب میں متعدد ایسی تحقیقات کی روداد بیان کی گئی ہے جو سب کی سب یہ ثابت کرتی ہیں کہ نگہداشت اطفال، لچک دار اوقات کار اور مع مشاہرہ رخصت عائلی پر سرمایہ لگانے سے بہت زیادہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

چیز مین ہٹن کمپنی کی اپنے ملازمین کو بیک اپ نگہداشت اطفال کی سہولت کی فراہمی پر کی گئی سرمایہ کاری سے اسے 115 فی صد فائدہ حاصل ہوا جس سے کمپنی کو صرف ایک سال کے دورانیے میں 6900 ایام عمل کی بچت ہوئی۔

امیریکن ایکسپرس نے جب Telecommuting کو متعارف کرایا تو اس کی بکری میں 40 ملین ڈالر اضافہ ہوا۔ ایٹن کے ملازمین نے جب گھر بیٹھ کر کمپنی کا کام کرنا شروع کیا تو اس کے بعد اس کے کلیموں کی پروسیسنگ میں 30 فی صد اضافہ ہوا۔

2001ء میں کی جانے والی ایک تحقیق ظاہر کرتی ہے کہ رخصت والدین دینے والی کمپنیوں کو ایسی چھٹیاں نہ دینے والے اداروں کی نسبت 2.5 فی صد زیادہ منافع جات ملے۔ امریکہ میں شائع ہونے والے جریدے ''کارکن مائیں'' کی کارکن ماؤں کے لیے سو بہترین کمپنیوں (جو کہ اپنے ملازمین کو نگہداشت اطفال، لچک دار اوقات کار، گھر بیٹھ کر کام کرنے کی سہولت اور اس نوع کی دیگر سہولتیں فراہم کرتی ہیں) کی فہرست میں شامل ادارے گاہکوں کی تسلی کے اعتبار سے بھی سرفہرست رہے۔ اس سے بازاری قدر میں 3 سے 11 فی صد اضافہ ہوا جو فی ملازم 2000 ڈالر بنتا ہے۔

وہ کمپنیاں جنھیں امریکی جریدے ''فارچون'' نے کام کے ماحول کے اعتبار سے بہترین کمپنیاں قرار دیا، انھوں نے اپنے حصص میں پیسہ لگانے والے سرمایہ کاروں کو ان کی سرمایہ کاری پر 27.5 فی صد منافع دیا جو اس نوع کی دوسری مشہور کمپنی رسل 3000 سٹاک کی طرف سے دیے جانے والے 17.3 فی صد منافع کی نسبت بہت زیادہ ہے۔

عرصے میں یہ منافعہ 521 فی صد کی حیرت انگیز حد تک پہنچ چکا تھا۔ نگہداشت اطفال کے حوالے سے عمل میں لائی گئی ایک اور تحقیق سے یہ حقائق سامنے آئے کہ وہ کارکن جنھیں

بچوں کی دیکھ بھال کی سہولت فراہم کی گئی تھی ان میں سے 55 فی صد میں کام کے دوران ارتکاز توجہ کی اہلیت زیادہ پائی گئی جبکہ ان میں (See Script) سے اسی طرح نگہداشت اطفال کے ایک اور بڑے مرکز کی خدمات حاصل کرنے والوں پر تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ادارے سے بہت زیادہ وفادار ہیں اور اپنے افسران کے متعلق بہت مثبت خیالات رکھتے ہیں۔ برائٹ ہرائزنز چائلڈ کیئر کا ایک سروے بتلاتا ہے کہ بہت سے بے اولاد ملازمین بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ ادارے کی حدود میں نگہداشت اطفال کے اہتمام سے ان کے ادارے پر مثبت اثر پڑے گا۔(14)

یو۔پی۔ایس نے پتہ چلایا ہے کہ لچک دار اوقات کار اختیار کرنے سے ردو بدل عملہ 50فی صد سے کم ہوکر صرف 6 فی صد رہ گئی۔(15) جب ایٹنا نے کام پر واپسی کی لچک دار شرائط کے ساتھ چھ ماہ کی رخصت زچگی منظور کرنے کی روائت شروع کی تو اس ادارے میں ملازمین کے رکنے کی شرح میں 77 سے 88 فی صد تک اضافہ ہوگیا۔جس سے ادارے کوایک ملین ڈالر سالانہ کے حساب سے بچت ہونے لگی۔ کیلی فورنیا کی سلیکان ویلی کے نوآجرین کے ایک سروے کے مطابق جن دنو ں ملازمین گھر بیٹھ کر کام کرتے ہیں تو ان کی پیداواریت میں25 فی صد اضافہ دیکھنے میں آتا ہے(16)۔ایک اور کاروباری ادارے النائے بیل کے مطابق ملازمین کے گھر بیٹھ کر کام کرنے سے پیداواریت 40 فی صد زیادہ ہو جاتی ہے۔(17)

جسمانی نگہداشت کے پروگراموں سے حاصل ہونے والی بچت

پیپسی کی متعارف کردہ جسمانی صحت کی نگہداشت کے پروگرام سے کمپنی کو ہر ڈالر کی سرمایہ کاری پر تین ڈالر کا منافع حاصل ہوا جس کی شرح 300 فی صد بنتی ہے۔ جانسن اینڈ جانسن کے متعارف کردہ اسی نوع اخراجات میں تخفیف کے طفیل ملازمین کو ان کی شرکت کے صلے میں پیش کیے گئے معاوضے کی ادائیگی کے بعد بھی فی ملازم سالانہ اوسطاً 225 ڈالر کی بچت ہوئی۔

ایک اور کاروباری ادارے سٹیل کیس کو اپنے ملازمین کی جسمانی صحت کی نگہداشت کے پروگرام سے چھ سال کے دورانیے میں شرکاء کی طرف سے 55 فی صد کم میڈیکل بل وصول ہوئے(19)

> اپلائیڈ میٹیریلز فٹنیس سینٹر سے استفادہ کرنے والے افراد نے اس سہولت سے استفادہ نہ کرنے والے افراد کی نسبت ایک بٹہ پانچ کم طبی اخراجات اور ایک بٹہ تین کم معذوری الاؤنس طلب کیے۔ دوسرا یہ کہ اس پروگرام کے شرکاء کی طرف سے معالجے کی مد میں طلب کی جانے والی رقوم بھی بقیہ ملازمین کی نسبت 79 فی صد کم تھیں۔

واٹسن واٹ اشاریۂ سرمایۂ انسانی کے مطابق ان کاروباری اداروں کی بازاری قدر کہ جو اپنی نجی زندگی میں نگہداشتی ذمہ داریاں سرانجام دینے والے ملازمین کو لچک دار نظام کار کی سہولیات فراہم کرتے ہیں۔ان اداروں کی نسبت کہ جو نہیں کرتے 3.5 فی صد زیادہ ہوتی ہے۔(20)

اگرچہ ان اعدادوشمار میں ہم صرف چند چیدہ پالیسیوں اور وتیروں کی بات ہی کرتے چلے آ رہے ہیں مگر میرا زور اس بات پر ہے کہ محض ایک یا دو متوجہ پالیسیاں متعارف کرا دینا ہی کافی نہیں۔ جو چیز صحیح معانی میں بارآور ثابت ہوتی ہے وہ ایک متوجہ کمپنی کی تشکیل ہے۔

فرسٹ ٹینی سی نیشنل کارپوریشن کی پالیسی اور کارکردگی اس مظہر کی ایک درخشندہ مثال ہے کہ کاروباری اداروں میں اب یہ سوجھ بوجھ پیدا ہونا شروع ہوگئی ہے کہ محض چند ایک نگہداشتی سہولیات متعارف کرانے کی نسبت پورے ادارے کو اعتنا و التفات کے انگ پر استوار کرنا زیادہ سود مند رہتا ہے۔اس کاروباری ادارے نے اپنے کارپوریٹ کلچر کو حقیقی معانوں میں ایک متوجہ رنگ دے کر یعنی اپنے ملازمین کے مفادات کو اولیت دے کر اپنی صنف کے دیگر کاروباری اداروں میں سب سے زیادہ منافعہ بخش ادارے کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔فوربس مسلسل اسے سب سے زیادہ منافع بخش بینک قرار دیتا رہا ہے اور اپنی متوجہ پالیسیوں کی بدولت اسے بیش بہا فوائد حاصل ہوئے۔

اس کے 97 کھاتہ دار اس کے پکے گاہک بن گئے ہیں۔ یہاں کام کرنے والے بھی اس ادارے کو چھوڑ کر کہیں اور نہیں جانا چاہتے کیونکہ ادارہ ان کی قدر کرتا ہے۔اس طرح کے پکے گاہک اور ملازمین اس بینک کے غیر معمول منافعے اور حصص کی تنومند قیمت کے پیچھے کارفرما بڑے عوامل ہیں۔(21)

المختصر بہت سے کاروباری اداروں نے اب اس چیز کی حقیقت کو پا لیا ہے کہ متوجہ پالیسیوں پر عمل پیرا ہونے کے طویل المیعادی فوائد ان کے سبب ہونے والے اخراجات سے

کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ (22) متوجہ پالیسیاں زیادہ خوشحال اور فائدہ مند ملازمین مضبوط خاندانوں اور زیادہ تسلی بخش زندگیوں کا پیش خیمہ بنتے ہیں۔ان سے مالی منافعہ میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور معیشت بھی زیادہ مضبوط اور بارآور ہو جاتی ہے۔

کاروباری حضرات اکثر یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ ہم تو کوئی نیا کام شروع کرنے سے پہلے ڈالروں میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔وہ مثالیں اور اعداد و شمار جن کا مطالعہ ہم نے ابھی کیا ہے یہی معلومات فراہم کرتی ہیں ان سے ہمیں لوگوں کی صحت اور بہبود پر خرچہ کرنے سے ڈالروں کی صورت میں ملنے والے فوائد کا پتہ چلتا ہے۔(23)

اس نوع کی سرمایہ کاری سے ملنے والے ثمرات کی تصدیق ان حالات کا پتہ چلانے کے لیے عمل میں لائی گئی سائنسی تحقیقات سے بھی ہوئی ہے جو کاروباری اداروں میں مثبت رویوں کو پروان چڑھاتے ہیں۔یہ تحقیقات اس بات کو آشکارہ کرتی ہیں کہ دوسروں کے ساتھ مثبت روابط کسی ادارے کی بہتر کارکردگی کے لیے اساسی اہمیت رکھتے ہیں۔(24)

امریکہ کی مشی گن یونیورسٹی کی محققین جین ای ڈٹن اور ایمیلی ڈی ہیفی ''کمپنی میں اعلیٰ معیار کے تعلقات کی قوت'' میں لکھتی ہیں کہ انسانی نشوونما کے لیے باہمی طور پر ہمدردانہ اور ایک دوسرے کو مضبوط بنانے والے تعلقات بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔(25) ڈٹن کا کہنا ہے کہ جب لوگوں کو احساس ہوتا ہے کہ دوسرے ان کا اتنا خیال کرتے ہیں تو ان میں زندگی اپنی پوری جولانیوں کے ساتھ عود کرتی ہے۔(20)

مثبت تنظیمی رویوں پر کی گئی تحقیقات ظاہر کرتی ہیں کہ پرالتفات تعلقات منافعہ جات پر سودمند اثرات مرتب کرتے ہیں۔ڈٹن، جیکو بالائس اور جیسن کانوف کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ دوسروں سے ہمدردی کا جذبہ ایسے مراسمی وسائل پیدا کرتا ہے جو اعتماد، تعلق، قربت اور مثبت جذبات کو فروغ دینے کا موجب بنتے ہیں۔ان مثبت جذبات سے کارکنوں کی پیداواری صلاحیت کو جلا ملتی ہے جس سے اداروں کو بھی بے بہا فائدہ پہنچتا ہے۔ان تحقیقات سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ کاروباری اداروں میں احساس و ہمدردی سے پر ماحول کو نمو دینے سے نہ صرف ان افراد میں مثبت مراسمی وسائل پیدا ہوتے ہیں جو کہ براہِ راست ایک دوسرے سے متعامل ہوتے ہیں بلکہ ان لوگوں میں بھی کہ جو براہِ راست متعامل نہیں ہوتے۔

MashalBooks.com

چھوٹی کمپنیاں اور حساس پالیسیاں

''اقدار پر مبنی کاروبار: دنیا کو کیسے تبدیل کیا جائے، پیسہ کیسے کمایا جائے اور لطف کیسے اٹھایا جائے'' میں بین کوہن اور میل وارک بتاتے ہیں کہ چھوٹی کمپنیاں اور ادارے متوجہ پالیسیاں اختیار کر کے ان سے کیسے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے بین اینڈ جیری آئس کریم اور میل وارک اینڈ ایسوسی ایٹس میں اپنے تجربات نیز دوسری سینکڑوں چھوٹی کمپنیوں سے حاصل ہونے والے اسباق کو یکجا کر کے اپنی توجہ درج ذیل پانچ بنیادی تعلقات پر مرکوز کی ہے۔

1- ملازمین کے ساتھ تعلقات
2- مال دینے والوں سے تعلقات
3- گاہکوں سے تعلقات
4- علاقے کے لوگوں سے تعلقات
5- قدرتی ماحول سے تعلقات

ملازمین کو اچھی سہولیات فراہم کرنے ساتھ ساتھ دوسری بات جس پر بین اور میل سب سے زیادہ زور دیتے ہیں وہ شراکتی انداز کی نظامت اور شراکت منافعہ کی سکیمیں ہیں جن سے ملازمین کے دل میں یہ احساس جگہ بناتا ہے کہ وہ بھی کمپنی کی کامیابی میں برابر کے ساجھے دار ہیں

ماہر ذکاوتِ جذباتی ڈینئیل گولمین، کیس ویسٹرن سکول آف مینجمنٹ کے پروفیسر رچرڈ بویاٹسز اور ٹیلسوس لیڈرشپ انسٹیٹوٹ کی ڈائرکٹر اینی مکی سب اس بات کے قائل ہیں کہ دوسروں کا خیال رکھنے اور ان کی بات کو توجہ سے سننے سے قیادت کو زیادہ موثر بنایا جا سکتا ہے۔(28)

ماہر نفسیات ایلیس آئزن اور اس کے ساتھیوں کے تجربات نے بھی یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جب کارکنان اچھا محسوس کرتے ہیں ...... ظاہر ہے اچھا وہ تبھی محسوس کریں گے جب کوئی ان کا احساس کرے گا ...... تو ان کی پیداواری اور اختراعی استعداد میں اضافہ ہو جاتا

ہے۔ نیز ان میں معاملات طے کرنے کا تدبر اور دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے اور ان کی قوت تخلیق میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔(29)

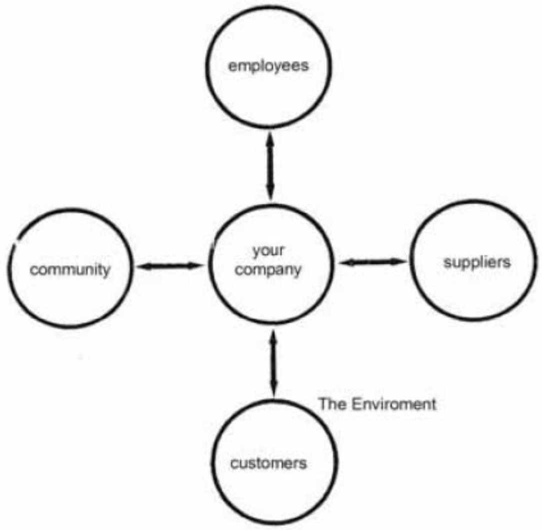

The five dimensions of values-driven business

ان آرا کے بارے میں تفصیلات کو ان موضوعات پر حال ہی میں شائع ہونے والی بعض کتب میں بآسانی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔اس نوع کی تمام تحاریر اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ کاروباری اداروں میں توجہ و احساس کی طرح ڈالنے سے پیداواریت، کاروبار اور معیشت کو چار چاند لگائے جا سکتے ہیں۔(30)

لیکن ان سب حقائق کے منظر عام پر آنے کے باوجود بہت سے افراد کی اب بھی یہ رائے ہے کہ روکھی پھیکی اور بے مہر معاشیات ہی کامیابی کا واحد راستہ ہے۔ وہ توجہ اور احساس جیسی چیزوں کو نازک اور ''نسوانی'' خیال کرتے ہیں اور شعوری یا غیر شعوری طور پر ان اجناس کو غیر منفعت بخش سمجھتے ہوئے ان سے گریز کی کوشش کرتے ہیں یا پھر وہ انھیں کاروباری کامیابی یا معاشی ترقی کے ضمن میں سرے سے کسی توجہ و اہمیت کے قابل ہی نہیں سمجھتے۔اس نوع کی

خرافات اور وہ ناقص معاشی پیمانے جو ان کو تقویت فراہم کرتے ہیں ایک ایسی تنگ نظری کے موجب بن رہے ہیں کہ جس کی وجہ سے کسی نئی اور مختلف بات پر عمل تو درکنار اسے دیکھنا بھی ممکن نہیں رہتا۔اور افسوسناک بات یہ ہے کہ باوجود یہ کہ تجرباتی شواہد نے انھیں یکسر غلط ثابت کر کے رکھ دیا ہے، بہت سے سرکردہ حکومتی اور کاروباری افراد نے ابھی تک ان مفروضات کو اپنے گلے کا ہار بنایا ہوا ہے۔

بچوں کی اچھی نگہداشت اور اس کا ثمر

اس نوع کے پرانے خیالات کس قدر غلط ہیں اس کی ایک بڑی مثال وہ بے اندازہ خسائر ہیں جو بچوں کی اچھی نگہداشت نہ کرنے کے سبب برداشت کرنا پڑتے ہیں۔اخراجات اور منافع کے خالصتاً مالیاتی تناظر میں بچوں کی معیاری نگہداشت پر پیسہ لگانے کو کسی قوم کی بہترین سرمایہ کاریوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔کینیڈا میں بچوں کی معیاری نگہداشت اور دیکھ بھال پر کیے جانے والے اخراجات سے حاصل ہونے والے منافع کے ایک مفصل مالیاتی تجزیے کے نتائج سے متاثر ہو کر اب وہاں بچوں کی دیکھ بھال اور صحت مند بچوں کے والدین کی حوصلہ افزائی کے لیے متعدد نئے پروگرام بھی شروع کر دیے گئے ہیں۔جب کینیڈا کے حکمرانوں کو بچوں کی نگہداشت پر کی جانے والی سرمایہ کاری سے منتج ہونے والے مالی منافعہ جات اور اس ضمن میں عدم توجہ سے متوقع خسارے کی بابت آگاہ کیا گیا تو وزارتِ صحت و طویل المیعادی نگہداشت نے ایک ایسے پروگرام کے اجراٗ کا فیصلہ کیا جس کا مقصد قبل پیدائش سے لے کر چھ سال تک کی عمر کے بچوں کے ابتدائی تشکیلی دور پر توجہ مرکوز کرنا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ صحت مند بچوں کے یہ پروگرام ایک ایسی حکومت کی طرف سے شروع کیے جا رہے ہیں جسے مالی پالیسیوں کے اعتبار سے قدامت پسند شمار کیا جاتا ہے۔دراصل یہ حکومت اب بچوں کی اچھی پرورش و پرداخت کے ثمرات سے بہت اچھی طرح آگاہ ہوگئی ہے۔وزیراعظم مائیک ہیرس نے حال ہی میں اس پروگرام کی ابتدا کے لیے سالانہ بجٹ میں 44 ملین ڈالر کی خطیر رقم مختص کی ہے۔علاوہ ازیں ہسپتالوں میں بچے کی پیدائش کے بعد زچہ کو 60 ساعتی نگہداشت کی فراہمی کے لیے بھی 27 ملین ڈالر رکھے گئے ہیں جبکہ صحت مند بچوں کے مذکورہ بالا پروگرام پر 17 ملین ڈالر خرچ کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔وزیراعظم

ہیرس نے ہسپتالوں کو زچہ کی انتہائی نگہداشت کے سامان کی ترسیل اور سماجی خدمات سرانجام دینے والے اداروں کے درمیان بہتر پیغام رسانی اور تعامل کی حوصلہ افزائی کے لیے بھی فراخدلانہ رقوم کی منظوری دی ہے تاکہ شیر خوار بچوں کی پرورش کرنے والے والدین کے لیے ان کی ضرورت کی خدمات کے حصول کو آسان بنایا جا سکے۔(31)۔

صحت مند بچوں کے اس پروگرام کے تحت کینیڈا کے مختلف صوبوں میں عوامی صحت کے 37 مراکز میں حاملہ خواتین کے تشخیص و معائنے کی سہولیات فراہم کی گئی ہیں۔اس پروگرام میں ہسپتالوں کی نرسوں یا دایوں کے ذریعے بچہ جننے والی خواتین کی ضروریات کا جائزہ لیا جاتا ہے اور پھر بچے کے والدین کو بچے کی پرورش و پرداخت اور اس کی ذہنی و جسمانی نشوونما کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔اس پروگرام کے تحت عوامی صحت کے مراکز کی طرف سے بھیجی گئی نرسیں زچگی والے گھروں میں جا کر زچہ و بچہ دونوں کی صحت کا جائزہ لیتی ہیں اور گھر والوں کی نومولود بچے کی دیکھ بھال کے سلسلہ میں رہنمائی کرتی ہیں۔(32)علاوہ ازیں والدین کو نومولود بچے کے لیے دودھ پلائی، تغذیہ، کھیل اور نگہداشت مہیا کرنے والے اداروں تک رسائی میں مدد دی جاتی ہے۔

2003ء میں شیر خوار بچے یا بچوں کے حامل تقریباً تمام گھرانوں نے نومولود بچوں کے اس پروگرام سے استفادہ کیا۔ایسے گھرانے جنھوں نے گھر پر معائنے کی فرمائش کی ان کو 18 دنوں کے دورانیے میں ایک مرتبہ گھر پر ایک سے دو گھنٹے تک اطباء اور ماہرین زچگی کی خدمات مہیا کی گئیں۔(33)

اس پروگرام کے ابتدائی جائزوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ بچوں اور ان کے والدین کو بیش بہا فوائد پہنچانے کے ساتھ ساتھ کینیڈا کے مستقبل کی افرادی قوت کے لیے بھی ایک انتہائی منافع بخش سرمایہ کاری ثابت ہو رہا ہے۔ان گھروں کے بچے کہ جن میں اس پروگرام کے تحت بھیجے گئے ماہرین زچہ و بچہ معائنے اور مشاورت کے لیے جاتے ہیں، ان گھروں کے بچوں کی نسبت کہ جو اس پروگرام کی مہیا کردہ سہولیات سے فائدہ نہیں اٹھاتے، نشوونما اطفال کے بیشتر پیمانوں پر سبقت لے جاتے ہیں۔ان پیمانوں میں امداد خود، مجموعی حرکی مہارات، لطیف حرکی مہارات اور نطق کی روانی شامل ہے۔یہ سب انسانی سرمائے کی اعلیٰ تر نشوونما کے مظاہر ہیں۔لہٰذا ہم بلا کسی تردد یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اس پروگرام میں شامل ہونے والے بچے ایک زیادہ تابناک مستقبل کے مالک ہوں گے۔(34)

متذکرہ گھرانوں کو ایک اور فائدہ بچے اور دیگر اہل خانہ کی بہتر صحت کی صورت میں ملتا ہے۔ اسے ہم اعلیٰ معیار کے انسانی سرمائے اور گھریلو اور ریاستی سطح پر علاج معالجے کے اخراجات، عملے کی غیر حاضری سے کمپنیوں پر پڑنے والے بار اور صحت سے متعلقہ دیگر مصارف میں بچت کا پیش خیمہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔

اس سے گھروں میں ہونے والے جھگڑوں میں بھی تخفیف واقع ہوئی ہے۔ چونکہ گھریلو جھگڑے بعد ازاں معاشرے میں ہونے والے جرائم کا سبب بنتے ہیں لہٰذا ہم اسے کاروبار و تجارت اور معاشرے کے لیے مجموعی طور پر بھی پیسے کی ایک بڑی بچت قرار دے سکتے ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق کم عمر بچوں سے زیادتی کے واقعات جہاں جذباتی و جسمانی تباہ کاری کا باعث بنتے ہیں وہاں وہ مالی طور پر بھی امریکی معیشت کو 94 بلین ڈالر سالانہ کے حساب سے نقصان پہنچاتے ہیں۔(35)

اسی طرح نگہداشت اطفال اور قبل المدرسہ پروگراموں پر سرکاری سطح پر سرمایہ کاری بھی بہت زیادہ منفعت بخش ثابت ہوئی ہے۔ اسے کینیڈا میں ہونے والی ایک تحقیق ''اچھی نگہداشت اطفال کے اخراجات اور منافع ،چھوٹے بچوں پر سرکاری سطح کی سرمایہ کاری کی معاشی توجیہہ'' میں موضوع بنایا گیا ہے۔(36)

یہ تحقیق ٹورنٹو یونیورسٹی کے دو ماہرین معاشیات نے شائع کی ہے۔ انھوں نے حساب لگایا ہے کہ کینیڈا کے تمام بچوں کو اعلیٰ معیار کی دیکھ بھال اور قبل المدرسہ پروگراموں کی سہولت فراہم کرنے سے سرکاری خزانے پر 5.3 بلین ڈالر کا اضافی بوجھ پڑے گا مگر بچوں اور ان کے والدین کو ان اضافی سہولیات کی فراہمی کی معاشی قدر اس سے دگنی یعنی 10.6 بلین ڈالر سالانہ ہوگئی جو کہ اصل سرمائے پر 200 فی صد منافعہ ظاہر کرتی ہے۔(37)

ان دونوں محققین نے کینیڈا کی حکومت پر زور دیا ہے کہ تمام بچوں کو سرکاری سطح پر نگہداشت اور قبل المدرسہ تعلیم کی سہولت فراہم کرنے سے خزانے پر خواہ جتنا بھی بوجھ پڑے وہ اس معاملے میں کسی بخل سے کام نہ لے اور اسے اپنی ترجیحات میں سرفہرست رکھے۔ انھوں نے اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے معاشرے اور مستقبل کی افرادی قوت کو بیش بہا اجتماعی فوائد حاصل ہوں گے۔ ''اگر کینیڈا بین الاقوامی طور پر اپنی حیثیت برقرار رکھنا چاہتا ہے اور اس میں بہتری لانا چاہتا ہے۔'' وہ لکھتے ہیں ''تو اسے آج کے بچوں

MashalBooks.com

کے انسانی سرمائے پر سرمایہ کاری کرنا ہوگی۔ چھوٹی عمر کے بچوں کی تعلیم پر صرف کیے گئے ڈالر کسی شخص کی زندگی کے کسی اور حصے پر صرف کیے گئے ڈالروں کی نسبت بہت زیادہ اثر انگیز ثابت ہو سکتے ہیں۔ کوئی بھی معقول صنعتی اور تعلیمی حکمت عملی معیاری نگہداشت اطفال کے بغیر ممکن نہیں۔ (38)

اس رپورٹ کے مصنفین نے کینیڈا کی حکومت کو دور اندیشانہ نقطہ نظر اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ ''کینیڈا کی اقتصادی خوشحالی کا انحصار اس کی معاشی اور معاشرتی طور پر صحیح کام کرنے کی صلاحیت پر ہے۔ اس کی کامیابی اس کے کارکنوں کی قابلیت اور ان کی صلاحیتوں پر منحصر ہے''۔ رپورٹ کے آخر میں کہا گیا ہے۔

اصل دولت اقوام

کسی قوم کی اصل دولت اس کے انسانی اور قدرتی سرمائے میں مضمر ہوتی ہے۔ یہاں میں اس بات کا اضافہ بھی کرنا چاہوں گی کہ انسانی سرمائے میں پیسہ لگانا انسانوں پر سرمایہ کاری کے مترادف ہے۔ اس سے محض منڈی میں پیسہ کمانے کی صلاحیت ہی حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس سے لوگوں کے معیار زندگی اور ان کی خوشی و خوشحالی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ (39) اور یہی متوجہ معاشیات کے جامع تصور کی اساس ہے۔ میں یہ بھی وضاحت کرنا چاہوں گی کہ قدرتی سرمائے سے میری مراد محض کسی قوم کے قدرتی وسائل نہیں بلکہ اس میں ہمارے سیارے کی ماحولیاتی صحت بھی آ جاتی ہے۔ کیونکہ اگر یہ نہیں رہے گی تو ہم اپنا بقیہ سب کچھ بھی گنوا بیٹھیں گے، اپنی زندگیاں بھی۔ یہ بھی متوجہ معاشیات کا ایک اساسی پہلو ہے۔

مالی منافعہ ہی کاروباری اور معاشی پالیسی کا واحد نصب العین نہیں ہونا چاہیے۔ لوگوں کی بہبود اور اس سیارے کی نگہداشت کو ان پالیسیوں میں ترجیحی حیثیت دی جانی چاہیے تبھی یہ پالیسیاں دانشمندانہ پالیسیاں کہلا سکتی ہیں۔

انسانوں پر سرمایہ کاری ان کی پیداواری صلاحیتوں کو جلا دینے اور کاروباری منافعہ اور پیداواری کامیابی حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ یہ سرمایہ کاری پیدائش کے وقت سے ہی شروع ہو جانا چاہیے۔ بلکہ سچ پوچھیں تو اسے پیدائش کے وقت سے بھی پہلے یعنی ماں کی قبل از زچگی نگہداشت سے شروع ہونا چاہیے۔ اس نوع کی سرمایہ کاری کی فوری ضرورت اس لیے

بھی ہے کہ آج کے دور میں اکثر ملازمتیں (کاروباری معاملات کے ماہر پیٹر ڈرکر کے مطابق 85 فی صد) علمی اور خدماتی نوعیت کی ہیں اور بقیہ ملازمتوں (صنعتی اور زرعی شعبے کی 15 فی صد) کا انحصار بھی علم پر بڑھتا جا رہا ہے۔(40)

لیکن امریکہ کے پاس انسانی سرمائے پر سرمایہ کاری کی اب بھی کوئی جامع پالیسی نہیں ہے بلکہ الٹا صحت، تعلیم، اور بہبود عامہ کے لیے مختص کی جانے والی رقم میں بتدریج تخفیف کی جا رہی ہے۔(41) یہی نہیں عالمی مالیاتی ادارے جیسی بین الاقوامی تنظیموں نے بھی ترقی پذیر ممالک کو سماجی بہبود کے کاموں پر کیے جانے والے اخراجات میں کمی کرنے پر مجبور کرنے کا کام شروع کر رکھا ہے۔ اور چونکہ یہ کٹوتیاں صحت اور تعلیم جیسے سماجی شعبوں کے لیے مختص رقوم میں کی جا رہی ہیں، اس سے انسانی سرمائے پر کی جانے والی سرمایہ کاری میں بھی اضافے کی بجائے روز بروز

انسانی سرمائے اور سماجی تحفظ پر سرمایہ کاری

برطانوی ماہر اقتصادیات رچرڈ لے یارڈ کا کہنا ہے کہ سوشل سکیورٹی پر امریکی بحث کو اس پروگرام کی نج کاری (جس نے کہ نجی سرکاری کا انتخاب کرنے والے متعدد خاندانوں کا بیڑہ غرق کیا ہے) سے رخ پھیر کر اس بات کی طرف مرکوز کرنا چاہیے کہ مستقبل کے لیے ایک زیادہ با صلاحیت اور پڑھی لکھی افرادی قوت کو کیسے تیار کیا جائے۔ وہ کہتا ہے موجودہ دور میں امریکی کارکنوں کا پانچواں حصہ عملی طور پر غیر تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل ہے

(وہ دوائی کی شیشی پر لکھی ہدایات پڑھنے سے بھی قاصر ہیں) اس کے مقابلے میں جرمنی، سویڈن اور ہالینڈ جیسے ممالک کے کارکنان کا دسواں حصہ ان پڑھ افراد پر مشتمل ہے، اسے محض حسن اتفاق نہیں کہا جا سکتا کہ یہ وہی ممالک ہیں جو والدین رخصت شروع بچپن کی تعلیم اور توجہ نگہداشت کی روایات کو تقویت دینے والی دیگر پالیسیوں پر کاربند ہیں۔ ایسی پالیسیاں زیادہ باصلاحیت اور ہنرمند کارکن پیدا کرتی ہیں جو زیادہ تنخواہیں پا کر حکومت کو زیادہ ٹیکس ادا کرتے ہیں جس سے سوشل سکیورٹی اور دیگر ایسے پروگراموں کو تقویت ملتی ہے۔(42)

تنزلی واقع ہو رہی ہے۔(43)

خوش قسمتی سے بہت سی ترقی یافتہ اقوام اس قدر کوتاہ اندیش نہیں ہیں۔سماجی خدمات کے لیے مختص رقوم کی کٹوتی کے لیے ڈالے گئے دباؤ کے باوجود بیشتر یورپی ممالک صحت عامہ،نگہداشت اطفال اور مع تنخواہ رخصت والیدینی کے پروگراموں پر سرکاری سرمایہ خرچ کر کے اپنے عوام کی دیکھ بھال پر بھاری سرمایہ کاری کے وظیفے کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اس نوع کے سب سے زیادہ فیاضانہ پروگرام سکینڈے نیویا کے ممالک میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔سویڈن میں نومولود بچے کے والد یا والدہ کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ بچے کی عمر 18 ماہ ہونے تک کام پر نہ آئے اور حکومت اس نوع کی رخصت لینے والے ملازم کو اس کی تنخواہ کے تناسب سے پہلے 390 دن کے لیے الاؤنس بھی دیتی ہے۔سویڈن کی حکومت نے مرد حضرات میں اس نوع کی چھٹی لینے کے رجحان کی حوصلہ افزائی کے لیے یہ شق بھی رکھی ہے کہ الاؤنس کے 390 دنوں میں سے اگر 330 دن بچے کی والدہ چھٹی پر رہتی ہے تو والد بھی کم کم از کم 60 دن بطور رخصت استعمال ضرور کرے اور اگر رخصت کا بڑا حصہ مرد کے پاس ہے تو اس کی بیوی بھی کم از کم 60 دنوں کے لیے رخصت پر گھر رہے۔بچے کے بیمار ہونے کی صورت میں والد / والدہ کو اختیار ہے کہ وہ عارضی رُخصت والدینی لے اور اپنے بچے کی تیمارداری کے لیے گھر پر رہے۔ناروے میں بھی مع مشاہرہ رخصت والدینی کی روائت رائج ہے۔یہاں پر 42 تا 52 ہفتوں کی رخصت دی جاتی ہے اور اگر ملازم 42 ہفتوں کی چھٹی لے تو اسے اس عرصے میں مکمل تنخواہ ادا کی جاتی ہے اور اگر وہ 52 ہفتوں کی چھٹی پر جائے تو وہ 80 فی صد تنخواہ حاصل کرتا ہے۔ڈنمارک میں 18 ہفتوں کی رخصت زچگی پوری تنخواہ کے ساتھ دی جاتی ہے اور والد اور والدہ دونوں میں سے ہر ایک کو دس دس ہفتوں کی رخصت والدینی پوری تنخواہ کے ساتھ دی جاتی ہے۔(44)

یہ ممالک اس راز کو پا گئے ہیں کہ متوجہ پالیسیوں اور پروگراموں یعنی سب شہریوں کے لیے علاج کی سہولت کی فراہمی اور نگہداشت اطفال سے لے کر مع مشاہرہ رخصت والدینی تک پر پیسہ خرچ کرنا ایک اعلیٰ معیار زندگی اور ایک زیادہ مؤثر معیشت کے لیے سرمایہ کاری کرنے کے مترادف ہے۔یہی وہ ملک ہیں جو اقوام متحدہ کی انسانی ترقی کی رپورٹوں کے قومی معیار زندگی کے پیمانوں پر ہمیشہ سب سے اوپر رہتے ہیں ان کی بچوں پر سرمایہ کاری کا ہی ثمر

ہے کہ ان کے ثانوی مدارس کے طلباء ریاضیات اور مطالعے میں دنیا میں سب سے زیادہ ممتاز مانے جاتے ہیں۔ یہ ملک معاشی ترقی و کامیابی کے اعتبار سے بھی پوری دنیا سے آگے ہیں۔

ان ممالک کو مثالی یا مسائل سے مکمل طور پر مبرا قرار نہیں دیا جا سکتا مگر ان کے سیاسی اور کاروباری ماہرین نیز ان کے عوام کی ایک بڑی اکثریت اس بات کی سمجھ رکھتی ہے کہ کسی شخص کی مالی آمدن یا کمائی ہی دولت کا واحد پیمانہ نہیں ہے۔

اگرچہ امریکی کارکن اوسط اعتبار سے یورپی کارکنوں کی نسبت زیادہ کماتے ہیں، انھیں روز مرہ زندگی کی ضروری خدمات مثلاً علاج معالجے پر خرچ بھی زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں امریکہ کی آبادی کے ایک مکمل چوتھائی حصے کو علاج معالجے کا تحفظ میسر نہیں۔ اگرچہ امریکہ کے منڈی پر مبنی نظام کے زیادہ انتظامی اخراجات کے سبب یہاں علاج معالجہ ترقی یافتہ دنیا کے تناظر میں سب سے زیادہ مہنگا ہے، 2005ء میں کیا گیا ایک سروے ظاہر کرتا ہے کہ یہاں طبی نگہداشت کا معیار بہتر نہیں بلکہ اسے کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، برطانیہ اور جرمنی جیسے ممالک کے مقابلے میں کمتر قرار دیا جا سکتا ہے۔(45)

اکثر امریکی کارکنوں کو اپنے بچوں کی نگہداشت کے لیے بھی اپنی جیب سے خرچہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ امریکی حکومت ماسوائے چند بہت ہی کم آمدنی والے گھرانوں کے افراد کے نگہداشت اطفال کے سلسلے میں کوئی مالی امداد فراہم نہیں کرتی۔ نتیجہ اس کا یہ برآمد ہوا ہے کہ اکثر امریکی کارکن نگہداشت اطفال اور قبل المدرسہ تعلیم کی خدمات تک رسائی حاصل نہیں کر پاتے جو کہ مستقبل کے سرمائے یعنی امریکی بچوں کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے درکار توجہ و دیکھ بھال کے لیے از حد ضروری ہے۔

امریکی کارکنوں کو مغربی یورپ کے کارکنوں کے مقابلے میں کام پر وقت بھی زیادہ گزارنا پڑتا ہے۔ سیاسیات کی پروفیسر جینٹ گورنک اور پبلک پالیسی کی پروفیسر مارشیا میئرز بتاتی ہیں کہ جہاں یورپی ممالک میں ایک عیال دار برسر روزگار جوڑا اوسطاً 65 سے 78 گھنٹہ فی ہفتہ کام کرتا ہے، امریکی ملازم جوڑے کو ایک ہفتے میں 80 گھنٹے سے زائد وقت کام کرنا پڑتا ہے۔(46)

بعض حضرات کو خوش فہمی ہے کہ اس سے امریکہ کی پیداواریت میں اضافہ ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ امریکہ 1995 سے لے کر 2004ء تک کے عرصے میں خام خانگی پیداوار

کی سالانہ فی ساعت عامل مرکب نمو کے اعتبار سے تنظیم برائے معاشی تعاون وترقی میں شامل 30 ممالک میں محض آٹھویں نمبر پر آتا رہا ہے۔(47)

افسوس کا مقام یہ ہے کہ امریکی بچوں کی حالت ان ممالک کے بچوں سے بھی ابتر ہے کہ جو خام خانگی پیداوار کے اعتبار سے امریکہ سے نیچے ہیں اور یہ بھی ہے کہ امریکی بچوں میں دیگر متمول مغربی اقوام کے بچوں کی نسبت افلاس کا شکار ہونے، ریاضی و سائنس کے بین الاقوامی امتحانات میں خراب کارکردگی کا مظاہرہ کرنے اور نوعمری میں بچے جننے کے رجحانات و امکانات بھی زیادہ پائے جاتے ہیں۔

کمتر خام خانگی پیداوار کے ملکوں کے بچوں کی نسبت امریکی بچوں کے کم عمر میں مرنے کے امکانات بھی زیادہ دیکھنے میں آتے ہیں۔امریکی محکمہ صحت وانسانی خدمات کی 2004ء کی ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ میں شیرخوار بچوں کی شرح اموات کے لحاظ سے 2000ء میں صنعتی ممالک میں 27 ویں نمبر پر تھا۔اورتو اور یونان سے بھی پیچھے اور کیوبا جیسے ملک سے محض ذرا سا آگے کہ جو امارت کے اعتبار سے امریکہ کی نسبت کہیں زیادہ کمتر ہے۔(48)معروف امریکی ادارے سی۔آئی۔اے کے ایک تازہ ترین

محنت،اقداراور ہماری زندگی

> امریکی ادارہ، عائلات وعمل کے ایک سروے سے پتہ چلتا ہے کہ نصف سے زائد امریکی ملازمین اپنے کام، ذاتی زندگی اور عائلی زندگی کے درمیان توازن برقرار رکھنے میں دشواری محسوس کررہے ہیں۔اس کے برعکس یورپی اتحاد میں شامل اقوام کو ملاحظہ کریں تو ان کے 80 فی صد والدین اس توازن پر بہت مطمئن نظر آتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ان کے اوقات کار اور ان کی نجی مصروفیات میں ''بہت زیادہ'' یا ''کافی زیادہ'' موافقت موجود ہے۔(49)
>
> امریکی شہریوں کو ٹیکسوں کی ادائیگی کے بدلے میں مغربی یورپ کے اکثر ممالک کے عوام کی نسبت علاج، نگہداشت اطفال اور تعلیم جیسی سہولیات بھی کم میسر آتی ہیں۔امریکی قانون ایک مختصر سی اور بلا تنخواہ رخصت والدینی کا تقاضہ کرتا ہے (چھوٹی کمپنیوں کے ملازمین کو وہ بھی نہیں ملتی) اور صرف چند امریکی ریاستیں ہی ایسی ہیں جو ماؤں کو بچے کی پیدائش یا بچہ گود لینے کے بعد عوامی بیمہ معذوری کے ذریعے کسی قسم کی

> Wage replacement کے لیے پیسہ فراہم کرتی ہیں۔(50) یہاں نگہداشت اطفال کی باری کا انتظار کرنے والوں کی فہرستیں بھی بہت طویل ہوتی ہیں اور بیشتر امریکی کارکنوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے پلے سے معیاری نگہداشت اطفال کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔اس میں طویل اوقات کار، جز وقتی کارکنوں (جن میں سے بہت سے نگہداشتی وظائف بھی سرانجام دیتے ہیں) کے لیے سہولتوں کے فقدان اور بچوں کے لیے ان عائلی الاؤنسوں کی عدم دستیابی کو بھی شامل کر لیجیے جو کہ مغربی یورپ کے ممالک میں ایک معمول کی بات سمجھے جاتے ہیں تو نتیجے کے طور پر آپ کے سامنے بھاری ذہنی دباؤ کے شکار شہریوں کی تصویر ہی آسکتی ہے(51)
>
> اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امریکی ہی اس کرۂ ارض پر سب سے زیادہ ذہنی دباؤ کا شکار نہیں ہیں۔ ہماری دنیا میں بھوک اور فلاکت کا شکار کروڑوں لوگ ایسے بھی ہیں جو امریکیوں سے بھی زیادہ دباؤ اور کسمپرسی میں زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان کے بقول ''دنیا کے تقریباً'' نصف افراد دو ڈالر یومیہ سے بھی کم پر گزارہ چلا رہے ہیں۔مگر یہ اعداد و شمار بھی اس ذلت، بے کسی اور مہیب مصائب کی تصویر کشی سے قاصر ہیں جو ہماری اس دنیا میں بسنے والے غریب اور بے سہارا افراد کا روزانہ کا نصیب ہے۔(52) یہ اعداد وشمار یہ ظاہر کرنے سے بھی قاصر ہیں کہ پورے کرۂ ارض میں پھیلے ان بھوک اور افلاس میں گھرے افراد میں ایک بڑی تعداد خواتین اور بچوں کی ہے اور یہ سب ایک ایسے معاشی نظام کا کیا دھرا ہے جو اہم ترین انسانی عمل یعنی توجہ ونگہداشت کو اس کی مناسب قدر و وقعت نہیں دیتا۔ان میں سے کسی چیز کو بھی نا گزیر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یونیسف کے سابق ڈائریکٹر کیری بیلمی کا کہنا ہے کہ ''بچوں کا معیار زندگی ان فیصلوں پر منحصر ہوتا ہے جو ہر روز گھروں، محلوں اور حکومتی ایوانوں میں طے پاتے ہیں۔ ہمیں یہ فیصلے فراست سے اور بچوں کے بہترین مفادات کو پیش نظر رکھ کر کرنے چاہئیں۔اگر ہم بچوں اور ان کے بچپن کو تحفظ دینے میں ناکام ہو گئے تو ہم انسانی حقوق اور معاشی ترقی کے اپنے بڑے عالمی اہداف تک پہنچنے میں بھی ناکام ہو جائیں گے۔اطفال کا جو حال ہو گا، وہی حال اقوام کا ہو گا یہ بڑی سادہ سی بات ہے۔(53)

عالمی حقائق نامے کے مطابق 2006ء تک کیوبا امریکہ سے آگے نکل چکا تھا جو 42 ویں نمبر پر نہ صرف یہ کہ ہر صنعتی ملک سے بلکہ مالٹا، انڈورا، مکاؤ اروبا اور دوسرے کئی معمولی معمولی

سے ملکوں سے بھی پیچھے کھڑا تھا۔(54) 2005ء کی انسانی ترقیاتی رپورٹ سے تو یہ بات سامنے آئی کہ امریکی دارالحکومت واشنگٹن میں شیر خوار بچوں کی شرح اموات بھارت کی ریاست کیرالہ سے بھی زیادہ ہے۔(یہاں میں اس بات کا ذکر کرنا بھی مناسب سمجھتی ہوں کہ بھارتی ریاست کیرالہ میں خواتین کا مقام اس ملک کی کسی بھی اور ریاست کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔ یہ چیز جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے،سب کے لیے ایک بہتر معیار زندگی کی فراہمی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔

یہ بات عیاں ہے کہ امریکہ اپنے بے پناہ وسائل کو اپنے بچوں کی بہتری و بہبود کو یقینی بنانے کے لیے استعمال میں نہیں لا رہا۔ یہ ڈالروں کے اعتبار سے تو دنیا کا امیر ترین ملک شمار ہوسکتا ہے مگر اس کی پالیسیاں اپنے اہم ترین اثاثے یعنی مستقبل کے انسانی سرمائے کی نگہداشت کرنے سے قاصر نظر آتی ہیں۔اگر امریکہ اس نامناسب روش کو تبدیل نہیں کرتا تو ہماری قومی معیشت کو آئندہ نسل تک چل کے اس کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنا ہوگی اور اس سے لاکھوں امریکی بچے غیر ضروری طور پر اذیت اور موت کا شکار بنتے رہیں گے۔

غیر متوجہ معاشیات سے جنم لینے والے خسارے کی پردہ پوشی:

افراد اور قدرتی ماحول کی نگہداشت میں غفلت برتنے کے طفیل بچوں،خانوادوں، تاہم معاشی صحت کے مروجہ پیمانوں مثلاً خام قومی پیداوار یا خام خانگی پیداوار میں یہ اخراجات نظر نہیں آتے۔جیسا کہ آپ اس سے قبل ملاحظہ کر چکے ہیں یہ معاشی پیمانے غیر متوجہ کاروباری روایات سے منتج ہونے والے بہت سے خسائر کو پیداواری حسابات کے منفی کے بجائے مثبت کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔مثال کے طور پر حکام کی غفلت کے سبب سمندر میں بہہ جانے والے تیل کی صفائی کے اخراجات کو معاشی نقصان شمار کرنے کی بجائے خام قومی پیداوار اور خام خانگی پیداوار جیسے پیمانے اسے قومی پیداوار کے ایک جزو کے طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ 1987ء کے حادثے میں بہہ جانے والے تیل سے اٹھنے والے اخراجات کو بھی امریکہ کی خام قومی پیداوار میں شامل کر دیا گیا ہے۔(55)

یہ خوفناک حادثہ جس سے کہ میلوں تک کے سمندر کا حلیہ خراب ہوگیا تھا،ایک نامناسب،کمزور اور پرانے ٹینکر کے استعمال کے نتیجے میں پیش آیا تھا جس میں گیارہ ملین ڈالر خام تیل لادنے کا

قطعاً کوئی تُک نہیں بنتا تھا۔ یہ حادثہ مچھلیوں اور دیگر حیات بحری کی وسیع پیمانے پر ہلاکت کا باعث بنا اور اس سے لاکھوں آبی پرندوں اور سینکڑوں لدھروں، ڈالفنوں، وہیلوں اور بحری شیروں کی زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ مزید برآں اس نے مقامی لوگوں کی روزی روٹی کا کئی برسوں تک کے لیے ستیاناس کر کے رکھ دیا اور ان کی صحت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا دیا۔

مگر ستم ظریفی دیکھیے کہ اس حادثے میں ملوث اور اس کی ذمہ دار کمپنی ایکسن کو کسی ازالے یا ہرجانے کی تو نہ سوجھی، اس نے لاکھوں ڈالر وکیلوں کی خدمات حاصل کرنے پر صرف کرنا شروع کر دیے۔ اور پھر ان مصارف کو لین دین کے زمرے میں آنے کی بدولت امریکہ کی خام قومی پیداوار میں بھی شامل کر لیا گیا اور مزے کی بات کہ صحت و معاش کا نقصان برداشت کرنے والے مقامی باشندوں اور ماہی گیروں نے وکلاء پر جو مال خرچ کیا اسے بھی امریکی خام قومی پیداوار کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ یہی معاملہ ایکسن کے وکلاء کی طرف سے دائر کی گئی لمبی لمبی اپیلوں کے نتیجے میں بننے والے عدالتی اخراجات، اس کمپنی کی طرف سے عدالت میں بطور گواہ پیش کردہ ماہرین کو دی جانے والی رقوم اور ادارے کے ارباب اختیار کی طرف سے داخل کی گئی 14 ملین دستاویزات پر اٹھنے والے مصارف کا ہوا۔ ان میں سے ایک دستاویز میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ ایکسن کے جہاز میں لدا خام تیل فضلہ نہیں بلکہ ایک جنس تھی۔ لہٰذا اس کے بہہ جانے سے وفاقی قانون برائے آب نظیف کی کسی خلاف ورزی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اس تیل کی صفائی پر اٹھنے والے مالی مصارف جنھیں کہ خام قومی پیداوار میں جمع کیا گیا در حقیقت اسی حادثے کی حقیقی معاشی لاگت کا فقط ایک عشر عشیر تھے۔ اس حادثے کے چار سال بعد جریدے ''سائنس'' میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ خام تیل کی ایک اچھی خاصی مقدار اب بھی سمندر کی تہہ اور ساحل پر باقی ہے جس سے سیمن مچھلی کے انڈوں اور دیگر چھوٹے بحری جانداروں اور لدھروں، بطخوں اور دوسرے ایسے جانوروں کو بہت زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے جو کہ ان مخلوقات پر پلتے ہیں۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود ان آلودہ مناطق میں بسنے والے انسان اور حیوان اس حادثے کے تباہ کن اثرات اب بھی بھگت رہے ہیں۔

اس کے باوجود معاشی پیداوار کے پیمانوں میں ان میں سے کسی بھی نقصان کا اشارہ نہیں ملتا اور مروجہ معاشی پیمانوں میں ایسے نقصانات کا اشارہ مل بھی نہیں سکتا کیونکہ وہ قدرت کے ممد حیات وظائف کی اہمیت کو کسی توجہ کے قابل سمجھتے ہی نہیں۔ عین اس طرح کہ جیسے وہ گھروں میں سرانجام دیے جانے والے ممد حیات وظائف کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

جنگوں پر اٹھنے والے کثیر معاشی اخراجات کو بھی اس مظہر کی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ غیر متوجہ معاشیات کے طفیل پیش آنے والے خسائر ہمارے معاصر معاشی پیمانوں میں پہنچ کر کیسے چپ سادھ لیتے ہیں۔ان خسائر کو بھی خ۔ق۔پ کے منفی کی بجائے مثبت کھاتے میں شامل کر دیا جاتا ہے۔مثلاً امریکی حکومت کی طرف سے عراقی جنگ میں ملوث ٹھیکے داروں،فوجیوں اور دیگر افراد کو ادا کیے جانے والے امریکی ٹیکس دہندہ عوام کے کروڑوں ڈالروں کو بھی بشمول لڑائی میں اپاہج ہو جانے والے فوجیوں پر اٹھنے والے طبی اخراجات اور ہزاروں کی تعداد میں مارے جانے والوں کی تجہیز و تکفین کی لاگت کے امریکی خ۔ق۔پ میں شامل کر لیا جاتا ہے اور سب سے حیران کن امر یہ کہ امریکی حملے کے سبب ہونے والے اندوہناک نقصان کے بعد عراق کی تعمیر نو کی امریکی کوششوں پر آنے والے مصارف کو بھی بشمول بڑی بڑی امریکی کارپوریشنوں کو دی جانے والی رقوم کے امریکی خ۔ق۔پ کے مثبت پلڑے میں ڈال دیا گیا ہے۔

نیو اورلینز میں وفاقی حکومت کی غفلت اور نا اندیشی کی وجہ سے بحری طوفان کیٹرینا سے ہونیوالے کروڑوں ڈالر کے نقصان کا بھی امریکی خ۔ق۔پ میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔اس کی بجائے طوفان کے بعد عمل میں آنے والے تعمیر نو کے منصوبہ جات کے اخراجات خ۔ق۔پ کے مثبت پلڑے میں پڑے ضرور نظر آتے ہیں۔اس تعمیر نو میں طوفان کے متاثرین کی رہائش کے لیے تیار کیے جانے والے ٹرالوں پر ضائع ہونے والی خطیر رقوم بھی شامل ہیں۔امریکی انتظامیہ کی نااہلی دیکھیے کہ یہ ٹرالا گھر اس وقت بنائے گئے جب ہزاروں کی تعداد میں سرکاری فلیٹ خالی پڑے تھے۔کیا ان فلیٹوں کو اس مقصد کے لیے استعمال میں نہیں لایا جا سکتا تھا؟

اسی طرح صنعتی حرفت کے غیر ذمہ دارانہ استعمالات کے باعث پیدا ہونے والی فضائی آلودگی سے ہونے والے اخراجات بھی آپ کو خ۔ق۔پ کی مثبت جانب ہی پڑے ملیں

MashalBooks.com

گے۔ یہ پیمانہ لاگت و منافع کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ بھی مہیا کرنے سے قاصر ہے اگرچہ ان اخراجات کی پیمائش بآسانی ڈالروں میں کی جاسکتی ہے۔

کینیڈا کے صوبے اونٹاریو کی مثال ہی لیجیے جس کی کل آبادی 11.9 ملین ہے۔اس صوبے کے باسیوں کو فضائی آلودگی کے باعث طبی مصارف اور کارکنوں کے کام سے غیر حاضری کی صورت میں کم از کم ایک بلین ڈالر سالانہ کے اخراجات برداشت کرنا پڑتے ہیں۔(57) زیادہ گندے علاقوں میں فضائی آلودگی سے ہونے والی بیماریوں کی وجہ سے اٹھنے والے مصارف اس سے بھی زیادہ ہیں۔عالمی بینک کے جمع کردہ اعداد وشمار کے مطابق 1990ء کی دہائی کے اوائل میں جکارتہ، بنکاک اور منیلا میں گردوغبار اور فضا میں شامل سیسے کے ذرات کے سبب پیدا ہونے والے مسائل صحت پر لگنے والے طبی اور غیر طبی اخراجات اوسط آمدنیوں کا دس فی صد تھے۔(58)

چین کے شہری علاقوں میں فضائی آلودگی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔عالمی بینک کے تخمینے کے مطابق یہ آلودگی چینی معیشت کو طبی اخراجات اور ساعات کار کے ضیاع کی صورت میں ہر سال 25 بلین ڈالر کا نقصان پہنچاتی ہے۔(59) ایک اور تخمینے کے مطابق چین کے شہری علاقوں کے مکینوں کو فضائی آلودگی کے طفیل لاحق ہونے والی امراض و اموات کی وجہ سے یہاں کی حکومت کو خام خانگی پیداوار کے پانچ فی صد کے برابر خرچہ کرنا پڑتا ہے۔

ان مالی اخراجات میں فضائی آلودگی کی وجہ سے ہونے والی اموات شامل نہیں ہیں۔عالمی ادارہ صحت کا کہنا ہے کہ فضائی آلودگی کے مضر صحت اثرات کے سبب ہر سال تین ملین افراد لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔یہ تعداد ٹریفک کے حادثات میں ہلاک ہونیوالے افراد کی تعداد سے تین گنا زیادہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان اموات پر اٹھنے والے طبی و تدفینی اخراجات کو بھی خ۔ق۔پ اور خ۔خ۔پ کے دائیں پلڑے میں ہی ڈال دیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ بہت سے دیگر پوشیدہ اخراجات بھی ہیں جنھیں مروجہ معاشی پیمانوں میں ''پیداواریت'' کا غلط لیبل لگا کر پیش کیا جاتا ہے۔مثال کے طور پر امریکہ کی روز بروز ترقی کرتی قید و بند کی صنعت سے حاصل ہونے والے اموال کو ایک معاشی طور پر مثبت شے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بحالی مجرمین کے مقابلے میں قید و بند پر سرمایہ کاری ضیاع و نا اہلی کی آئینہ دار ہے۔

MashalBooks.com

میسوری میں عادی مجرموں کی شرح کیلیفورنیا کی نسبت بہت کم ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ میسوری نے نوعمر مجرمین کے بارے میں روایتی طرزِ عمل ...... بڑی بڑی حوالاتیں اور تجرد و سزا پر زور کی جگہ ایک مختلف انداز اختیار کر لیا ہے۔ اب مجرمین کو چھوٹے چھوٹے گروپوں میں رکھا جاتا ہے جہاں اعلیٰ تربیت یافتہ عملے، باقاعدہ نفسیاتی علاج اور ساتھیوں کے مثبت دباؤ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس ایک زیادہ متوجہ اور نگہداشتی انداز اصلاح میں خاندانی روابط کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ بچوں کو ان کے گھروں سے پچاس میل کے فاصلے سے دور نہ رکھا جائے بلکہ والدین کو ملاقات کروانے کے لیے سرکاری گاڑیاں تک بھی بھیجی جاتی ہیں۔(61)

میسوری کے اس متوجہ اور شراکتی نظام میں بچوں کو محض کوٹھڑیوں میں بند کر کے نہیں رکھا جاتا کیونکہ یہ طریقہ کار اور زیادہ تشدد کو جنم دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میسوری کا بحالی مجرمین کا ریکارڈ بقیہ علاقوں کی نسبت بہت نمایاں ہے۔ 2003ء کی ایک تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ 1999ء میں رہا کیے جانے والے 1400 نوجوانوں میں سے صرف آٹھ فی صد بڑے ہو کر واپس جیلوں میں پہنچے۔ اس کے برعکس کیلیفورنیا، جہاں جیلوں کی نجکاری ایک بہت منافع بخش کاروبار بن چکا ہے، میں قید سے رہائی پانے والے نوجوانوں میں سے تقریباً 50 فی صد دو برس کے عرصے میں لوٹ کر پھر جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچ چکے تھے۔

میسوری کے نظام کو ایک اور اعتبار سے بھی فضیلت حاصل ہے۔ وہ ایسے کہ یہاں فی بچہ سالانہ 43000 ڈالر صرف کیا جاتا ہے جبکہ کیلیفورنیا میں فی کس خرچہ تقریباً 80,000 ڈالر سالانہ تک جا پہنچتا ہے۔(62) تاہم خ۔ ق۔ پ کے لحاظ سے کیلیفورنیا سب سے اوپر ہے یہاں جیلیں تعمیر کرنے کے اخراجات پیداواری حسابات کے مثبت پہلو میں شمار کیے جاتے ہیں۔

مسئلے کی جڑ

کیا سبب ہے کہ نہائت زیرک اور نیک نیت افراد بھی یہ بھانپنے سے قاصر ہیں کہ لاگت و منافع کے معاصر تجزیات کس قدر بودے اور بعید از حقیقت ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ انھیں توجہ و نگہداشت کی بے قدری کرنے والے معاشی اصول و روایات اور پالیسیوں کی کمزوری اور زیاں کاری نظر نہیں آتی؟

ایسا نہیں کہ ایسی تحقیقات کم ہوئی ہیں کہ جو ثابت کرتی ہیں کہ ہمیں بہتر معاشی پیمانوں کی ضرورت ہے اور نہ ہی ایسی تحقیقات کی کمی ہے کہ جنھوں نے توجہ ونگہداشت سے بے اعتنائی برتنے کے برے نتائج سے ہمیں آگاہ نہ کیا ہو۔

بچوں سے زیادتی اور غفلت اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے معاشرتی جرائم کو ہی لیجیے۔ان کے بارے میں ہمارے پاس منوں کے حساب سے اعداد وشمار جمع ہو چکے ہیں۔ (63) پرتشدد جرائم کی سزا میں جیلوں میں بند قیدیوں کی زندگی کا جائزہ لیں تو ان میں سے اکثریت کی شخصیتوں کے پیچھے اسی طرح کی زیادتی اور عدم توجہی کا ہاتھ کارفرما نظر آتا ہے۔ بچوں سے زیادتی کے نتیجے میں معاشرے پر جو مالی بوجھ پڑتا ہے ان میں عدالتی کارروائیوں، قید و بند،ضمانتوں،اور تھانے کچہری سے منسلک دوسرے کئی مصارف شامل ہیں۔ اس کے علاوہ دفتروں اور کارخانوں میں کام کی پیداواریت میں جو کمی ہوتی ہے وہ الگ ہے۔کیا ہمیں یہ سب بھگتان بچوں کی صحیح دیکھ بھال پر خرچہ نہ کرنے کی وجہ سے نہیں بھگتنا پڑتا؟

ایسی تحقیقات بھی آئے روز ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اگر بچوں کی معیاری نگہداشت پر پیسہ صرف کیا جائے تو وہ بڑے ہوکر معاشرے کے لیے مالی طور پر زیادہ منافع بخش اور کارآمد شہری بنتے ہیں۔نہ صرف اپنے اور اپنے اہل خانہ کے لیے بلکہ وہ ملک میں زیادہ معاشی ترقی اور حکومت کے لیے زیادہ محصولات کی تحصیل کا باعث بھی بنتے ہیں۔

پیری پری سکول پراجیکٹ کو اس نوع کی تحقیقات میں بہترین شمار کیا جاتا ہے۔یہ طویل المدتی تحقیق 123 ایسے سیاہ فام امریکی بچوں پر کی گئی جو غربت کے ماحول میں پیدا ہوئے اور جن کی پڑھائی میں بھی کارکردگی اچھی نہ تھی۔1962ء سے لے کر 1967ء تک کے عرصے میں جب کہ ان کی عمریں تین سے چار سال تک کی تھیں،انھیں دو گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ایک گروہ کو قبل المدرسی نگہداشت کے ایک بہت اعلیٰ پروگرام میں داخل کرا دیا گیا جبکہ بقیہ بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ یہ معمولین جب چالیس کے سن کو پہنچے تو محققین کے علم میں یہ بات آئی کہ ان بچوں میں کہ جن کی نگہداشت بڑھیا اور معیاری ماحول میں کی گئی تھی، جرائم کی شرح بہت کم تھی۔علاوہ ازیں ان کی سکول و کالج اور ملازمت میں کارکردگی بھی بہتر رہی اور نگہداشتی پروگرام سے محروم بچوں کی نسبت ان کی آمدنیاں بھی بہت اچھی رہیں۔(64)

لیکن ان سب حقائق کے منظر عام پر آنے کے باوجود حکمران اور ان کے کار پرواز پرانی جیلوں کے انتظام اور نئی جیلوں کی تعمیر پر لاکھوں ڈالر صرف کرتے ہیں حالانکہ اس میں اب کوئی شک شبہ والی بات باقی نہیں رہی کہ لوگوں کو بند کوٹھڑیوں میں بند کرنے سے جرائم کا مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا۔حکمرانوں کا خیال ہے کہ...... انھی پر کیا موقوف ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے اور بھی بہت ہیں...... بچوں کی دیکھ بھال پر اس خیال سے صرف کی گئی رقم کہ وہ جرائم میں نہ پڑیں، محض وسائل کا ضیاع ہے۔صرف یہی نہیں بلکہ جنگوں (مثلاً عراق پر کی گئی یلغار) اور وسائل کی غلط تقسیم (مثلاً امیر و کبیر افراد کو ٹیکس میں دی جانے والی چھوٹ) سے بجٹ میں خسارہ واقع ہوتا ہے تو سب سے پہلے نزلہ بھی نگہداشتی منصوبوں پر ہی گرتا ہے اور تعلیم، صحت، سماجی بہبود اور نگہداشت اطفال پر کیے جانے والے مصارف سے ہاتھ روک لیا جاتا ہے۔

ان کج ادائیوں کی تہہ میں کارفرما ایک بڑا سبب وہ معاشی دوہرا معیار ہے جو ہمیں ان زمانوں سے ورثے میں ملا جب دنیا میں تسلطی نظام کی عملداری زیادہ تھی۔ یہ معاشی دوہرا معیار جس میں توجہ و نگہداشت کے وظائف کو خواتین اور ''نسوانیت'' سے منسوب کیا جاتا ہے اور اسے مردوں اور ''مردانگی'' سے وابستہ کسی بھی چیز کے مقابلے میں حقیر خیال کیا جاتا ہے، ہمیں آج کل کی ان معاشی پیمائشوں میں بھی جھلکتا نظر آتا ہے جو غیر متوجہ پالیسیوں سے ہونے والے خسائر کو غلط رنگ دے کر پیش کرتی ہیں۔اس طرح یہ معاشی پیمائشیں اس دوہرے معیار کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہیں۔ اس طرح کی پیمائشیں لوگوں کے سامنے پیش کر کے انھیں جل دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور انھیں ان خسائر اور توجہ و نگہداشت کے وظائف سے ملنے والے بیش بہا معاشرتی فوائد کے بارے میں بیوقوف بنایا جاتا ہے خواہ یہ وظائف گھروں میں سرانجام دیے جاتے ہوں، دفاتر اور کارخانوں میں یا معاشرے میں من حیث المجموعی۔

ہمیں معاشی پیداواریت کی پیمائش کے ان ناقص اور فرسودہ طریقوں کو بدلنا ہوگا۔لیکن ہم معاشی پیمانوں اور پالیسیوں میں اس وقت تک کوئی اساسی تبدیلی کی توقع نہیں کر سکتے جب تک کہ ہم ان پوشیدہ اقدار و مفروضات کے بارے میں صحیح آگہی حاصل نہیں کر لیتے جنھوں نے ہمیں ایک بیمار معاشی نظام میں جکڑ رکھا ہے۔ چونکہ ان کے تحت الشعور میں ایک بید بردار باپ کے تسلطی ''مردانہ'' آرکی ٹائپ کی اطاعت اور بالادستی کی بات سمائی ہوئی ہے، بہت سے

لوگ حکومت کے بحالی و اصلاح کی بجائے تعزیز و تادیب پر زر و اموال صرف کرنے کو درست اور فطری خیال کرتے ہیں۔اسی طرح وہ صحت و تعلیم اور سماجی بہبود کی جگہ ہتھیاروں اور جنگ و جدال پر سرکاری خزانے لٹانے کو بھی جائز تصور کرتے ہیں کیونکہ یہاں بھی ان کے ذہن کے کسی گوشے میں ایک اور تسلطی ''مردانہ'' آرکی ٹائپ یعنی جنگی ہیرو کے رعب و جلال کا تصور کارفرما ہوتا ہے۔

اب آپ پر یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ تسلطی معاشیات سے جان چھڑانے کے لیے محض معاشیات بدلنا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے ہمیں اقدار و اعتقادات اور اداروں کو بھی تبدیل کرنا ہوگا۔ہم ان اقدار و عقائید اور اداروں کا آئندہ ابواب میں مزید قریب سے جائزہ لیں گے اور اس بات کا بھی کہ یہ معاشیات پر اور پھر معاشیات ان پر کیسے اثر انداز ہوتی ہے۔

MashalBooks.com

باب چہارم

دہرا معیار

بعض اوقات ہم صاف سامنے پڑی چیز کو بھی نہیں دیکھ پاتے۔ یہ بات ان اقدار و عقائد پر خاص طور پر صادق آتی ہے جو کہ ہمیں عصر رفتہ سے ورثے میں ملے ہیں۔ بائبل میں یہودیوں کے ایک ایسے بادشاہ کا ذکر آتا ہے کہ جس کا ایک عورت پر دل آ گیا تو اس نے اس کے شوہر یعنی اپنے رقیب کو محاذ پر بھیج دیا جہاں اسے بڑی آسانی سے ختم کر دیا گیا مگر بجائے اس کے کہ بادشاہ کو زنا یا قتل عمد کی کوئی سزا ملتی وہ جوں کا توں تخت پر براجتا رہا لیکن دوسری طرف اس بائبل کی رو سے اگر ایک جوان لڑکی پر یہ الزام آ جائے کہ وہ بکارت گنوا بیٹھی ہے تو اس کا باپ اسے شہر کے دروازے پر لے جاتا ہے جہاں اسے پتھر مار مار کر اگلے جہان پہنچا دیا جاتا ہے۔

یہ محض ایک واقعہ ہے لیکن مختلف انسانی ثقافتوں کی تاریخ جنسی دوہرے معیار کی غماز اس طرح کی کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ سب کچھ اس عقیدے کی وجہ سے روا رکھا جاتا رہا کہ عورتیں مردوں کی ملکیت ہیں۔ پرانے وقتوں میں اگر کوئی مرد کسی دوشیزہ کی آبرو ریزی کرتا تھا تو اسے اس سے بیاہ کرنا پڑتا تھا اور اس کے باپ کو اس کی ایک تجارتی جنس خراب کرنے کی پاداش میں معاوضہ یا ہرجانہ ادا کرنا پڑتا تھا اور چونکہ باپ کو اپنی بیٹیوں کی عصمت کا مختارِ کل کیا جاتا تھا، اس معاملے میں لڑکی کو کسی چوں چرا کی اجازت ہرگز نہ ہوتی تھی۔

ہم میں سے بہت سے لوگ اب اس نوع کی رشتوں اور رواجوں کو وحشیانہ خیال کرتے ہیں۔ اب یہ بات ہماری سمجھ میں آنا شروع ہو گئی ہے کہ ہمیں اپنے بڑوں سے عصمت کے

بارے میں ایک بہت بہیمانہ جنسی دوہرا معیار ورثے میں ملا ہے جس میں زور والوں (مردوں) کے لیے کوئی اور قانون تھا اور بے زوروں (عورتوں کے لیے کوئی اور۔

لیکن ایک بات جو ابھی ہماری سمجھ میں آنا باقی ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں معاشیات کے ضمن میں بھی ایک ایسا ہی دہرا معیار ورثے میں ملا ہے اور یہ کہ اس نے ہمارے معاشی نظاموں کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے اور اس خرابی کی بنیاد وہ معاشی مقیاسات اور پیمانے ہیں جو اس چیز کا تعین کرتے ہیں کہ کون سی جنس قابل قدر ہے اور کون سی حقیر اور فضول۔

اس کی بنیاد رنگ، نسل، جنس، مذہب یا کسی اور نوع کا کوئی تفاوت ہو سکتا ہے۔ یہ تمام دھڑے بندیاں ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں۔ تسلطی نظامات کے دو اساسی مفروضات بھی انھی سے تقویت حاصل کرتے ہیں۔ اول یہ کہ صرف دو صورتیں ہی ممکن ہیں ......تسلط جما لینا یا تسلط میں آ جانا۔ دوم یہ کہ تفاوت کا مطلب یا تو برتری ہے اور یا کمتری، اور آپ جانتے ہیں کہ ہم جاندار مخلوقات میں سب سے اساسی تفاوت نر اور مادہ کا ہے۔ اس نر برتر، مادہ کمتر کے سانچے کو تسلطی گھرانوں کے بچوں کے اذہان میں ابتدائی عمر میں ہی ٹھونس دیا جاتا ہے تا کہ وہ تسلط و اطاعت کے روابط کو عادی اور اخلاقی خیال کریں۔ یہ ایک شخص کو دوسرے پر تفوق دینے کے لیے ایک بنیادی سانچے کے طور پر کام کرتا ہے۔ لہٰذا یہ نا انصافی اور نا ہمواری کے استمرار کے لیے تشکیل دیے گئے اس نظام کی استواری و استقرار کے لیے ایک کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

زیادہ دور کی بات نہیں کہ انسانی ذہن عدم مساوات کے قاعدے کا اس قدر عادی تھا کہ مساوات کا تصور ایک بدعت کے مترادف خیال کیا جاتا تھا۔ بابے آگسٹائن کا یہ ارشاد تو شاید آپ نے سنا ہی ہوگا کہ کسی شخص کو بھی اپنا مقام و مرتبہ تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے بالکل جیسے کہ انگلی ہمارے جسم میں آنکھ کی حیثیت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ لہٰذا اسے ہم محض اتفاق کی بات نہیں کہہ سکتے کہ یہ وہی بابا جی ہیں جنھوں نے ازلی گناہ کے اپنے مشہور نظریے میں تمام انسانی مسائل و مصائب کا الزام حوّا کے سر تھوپا تھا۔

تحکم کے سامنے سر اٹھانا حرام شمار کیا جاتا تھا جبکہ محکوم گروہوں پر جبر بلکہ اس جبر کے استمرار کے لیے استعمال کیا گیا تشدد بھی جائز تصور ہوتا تھا۔ لوگوں کے ذہن میں بڑوں کے لیے الگ اصول اور نیچے والوں کے لیے الگ قانون کا کلیہ اتنے اچھے طریقے سے بٹھا دیا جاتا

تھا کہ اس تشدد کے آلہء کار فوجی اور کوتوال بھی انھی نچلے اور محکوم طبقوں سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ یہاں خواتین خود خواتین پر جبر کے لیے مردوں کی آلہ کار بنیں اور انھوں نے خواتین سے وابستہ کسی بھی شے (اس میں توجہ ونگہداشت کے ''نسوانی وظائف'' بھی آ جاتے ہیں) پر مردوں سے منسوب ہر شے کے تفوق کے لیے کام کیا۔

گزشتہ کئی صدیوں سے معاشی و معاشرتی انصاف کے لیے بپا کی جانے والی تحاریک زور والوں اور بے کسوں کے لیے دوہرے معیار کی ریت کو کسی حد تک نقصان پہنچانے میں کامیاب رہی ہیں مگر ان تحاریک کا رخ بنیادی طور پر سیاست و اقتصادیات کے مناطق کی طرف رہا ہے جنھیں اب بھی صرف مردوں کے شعبے تصور کیا جاتا ہے۔

لگتی عجیب ہے مگر یہ بات ہے سچ کہ نظریہ مساوات کے جدید دور سے تعلق رکھنے والے اکثر سربرآوردہ شارحین نے بھی بجائے اس کے کہ وہ اس کے خلاف کوئی آواز بلند کرتے، جنسی دوہرے معیار کی تائید وحمائت ہی کی ہے۔ ان کے ''حقوق آدم'' کے آدرش نے بھی خواتین کو نکال باہر کیا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر تاریخ اور سیاسیات میں ابھی تک زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔

سیاسی جمہوریت کے سترھویں صدی کے بڑے فلسفی جان لاک نے یہ رائے پیش کی تھی کہ آزادانہ طور پر منتخب شدہ نمائندہ حکومتوں کو مطلق العنان بادشاہوں کی جگہ لے لینی چاہیے۔ اس نے اس دور میں مروج پدر سالاری خاندان کے تصور پر کڑی تنقید کی اور اسے مطلق العنان بادشاہت کی قدرتی اساس قرار دیا۔ بایں ہمہ اس نے بڑی شدومد سے یہ مؤقف اختیار کیا کہ خواتین پر ان کے خاوندوں کی قانونی و روائتی بالادستی کی قدرت میں ایک اساس موجود ہے۔(6)

اٹھارھویں صدی کے مشہور فلسفی روسو نے جسے آزادی و مساوات کے ایک بہت بڑے علمبردار کے طور پر جانا جاتا ہے، بھی اس دوہرے معیار کی حمائت کی ریت کو برقرار رکھا۔ اس نے تو یہاں تک بھی کہہ دیا کہ لڑکیوں پر چھوٹی عمر سے ہی بندشیں لگا دینی چاہیں کیونکہ ''فرمانبرداری'' جیسی چیز کی خواتین کو تمام عمر احتیاج ہوتی ہے۔ اس کے خیال میں خواتین کو ''ہمیشہ کسی مرد کے یا مردوں کے احکام کے زیر نگین'' ہونا چاہیے۔ لہٰذا جمہوریت و مساوات کی اس جدید تحریک کے ان دونوں رہنماؤں کی نگاہ اس بے ہودگی پر نہ پڑ سکی۔ جب

MashalBooks.com

تک انسانیت کے نصف حصے کا دوسرے نصف پر تسلط واستبداد برقرار ہے کوئی شخص سب کے لیے عدل ومساوات کے ضامن ایک آزاد اور جمہوری معاشرے کی بات کیسے کرسکتا ہے؟

معاشی مساوات کے پرچارک انیسویں صدی کے دو بڑے دانشور یعنی کارل مارکس اور فریڈرک انجلز بھی سماج کے اس مرد پرستانہ اندازفکر سے چھٹکارہ نہ پاسکے۔ان حضرات نے یہ کہہ کر کہ دنیا میں اول درجے کا جبر وہ ہے جو مرد عورتوں پر کرتے ہیں،عورت کی بات تو کی مگر ان کے لیے ......ان کے لیے کیا جدید دور کے بہت سے اشتراکیوں کے لیے بھی ...... یہ ''نسوانی مسئلہ'' ایک ثانوی معاملہ ہی رہا۔

دوہرے جنسی معیار کے خلاف اٹھنے والی ابتدائی آوازیں

سب مغربی فلاسفہ نے خواتین اور ''نسوانی'' کی تقلیل قدر کرنے والے دوہرے جنسی معیار پر صاد نہیں کی۔خصوصاً یورپی نشاۃ ثانیہ کے دوران عورتوں کی غلامی کے خلاف بعض بہت بلند آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔1405ء میں کرسٹن ڈی پزان اپنی تصنیف ''کتاب شہر نسواں'' میں لکھتی ہے کہ خواتین تذلیل غیر منطقی تعصب کا نتیجہ ہے۔اس نے تہذیب انسانی میں خواتین کے اہم کردار کے بارے میں بھی لکھا۔(8) سر ٹامس مور نے 1516ء میں اپنی شہرہ آفاق کتاب ''یوٹوپیا'' میں تعلیم نسوانی کی حمائت کی۔1790ء میں مارکس ڈی کنڈورسیٹ نے یہ کہہ کر کھلبلی مچادی کہ خواتین کو مردوں کے برابر سیاسی حقوق ملنے چاہیے ہیں۔(9) اٹھارویں صدی میں مردوزن کی برابری کی بات کرنے والوں میں جس نے سب سے زیادہ نام کمایا وہ برطانوی ادیبہ میری ولسٹن کرافٹ تھی۔اس نے اپنے مختصر عرصہ حیات(1759,1797) میں متعدد تصانیف قلمبند کیں جس میں اس نے خواتین کی غلامی کے خلاف بڑے جذباتی انداز میں دلائل دیے۔ان تصانیف میں ''در حمائت حقوق خواتین''(1792) سب سے زیادہ معروف ہے اور اسے حقوق نسواں کے ضمن میں ایک سند کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ولسٹن کرافٹ نے شادی کے بشمول بہت سی ریتوں اور رواجوں کی مخالفت کی کیونکہ شادی کا ادارہ اس کے وقتوں میں عورت کو مکمل طور پر مرد کا دست نگر بنا دیتا تھا۔اس نے بچیوں کی تعلیم وتربیت کے لیے ایک مدرسے کی بنیاد رکھی اور ایک انقلابی جماعت کی رکنیت اختیار کی جس میں ولیم بلیک،ہنری ورڈزورتھ جیسے جید شعرا نیز ٹامسن پین بھی شامل تھا۔اس نے اپنے پہلے بچے کو 1795ء میں ایک کنواری ماں کے طور پر جنم دیا جس کا نام فینی رکھا گیا یہ بچی

ایک امریکی سوداگر کی بیٹی تھی۔ اس امریکی کی جفا کاری کا علم ہونے کے بعد میری نے اپنے دیرینہ دوست ولیم گوڈون کے ساتھ رہنا شروع کر دیا اور 1797ء میں اس کے ساتھ باقاعدہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئی۔ وہ گوڈون سے ہونے والی اپنی بیٹی میری وولسٹن کرافٹ شیلے کی ولادت کے چند روز بعد انتقال کر گئی۔ یہ وہی میری وولسٹن کرافٹ شیلے ہے جس نے ''فرینکنسٹائن'' اور دیگر مشہور ناول تحریر کیے اور معروف رومانوی شاعر پی۔ بی۔ شیلے سے شادی کی۔

بعد میں آنے والی صدی میں مردانہ تسلط کے خلاف چلنے والی حقوق نسواں کی تحریک نے مزید زور پکڑ لیا مگر 1869ء میں بھی جب مشہور فلسفی جان سٹوارٹ مل نے اپنی بیگم ہیریٹ ٹیلر کے ایما پر اپنا مضمون ''عورت کی غلامی'' شائع کیا تو مساوات نسواں کا تصور بہت نویکلا اور انقلابی سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ مل کو اس مضمون کی اشاعت اپنے ایام مرگ تک مؤخر کرنا پڑی کیونکہ اس کی وجہ سے وہ کسی تنازعے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے سبب اگر کوئی قضیہ کھڑا ہو گیا تو اس کا اس کی دیگر تصانیف پر منفی اثر پڑے گا۔ رابرٹ اوون، ولیم ٹامسن، اینا ویلر، اگسٹ ببیل اور انیسویں صدی کے متعدد دوسرے اشتراکیت پسندوں نے یہ مؤقف اختیار کر لیا کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان دولت کی غیر مساوی تقسیم معاشی ناانصافی کا بڑا سبب ہے۔(10) مگر مارکس اور اینجلز نے مزدور طبقے پر ہونے والے جبر و استبداد کے سامنے اس طرح کے معاملات کو ثانوی گردانتے ہوئے انھیں مسترد کر دیا۔

انیسویں صدی میں حقوق نسواں کی غالباً سب سے معروف امریکی آواز الزبتھ کیڈی سٹینٹن (1815ء تا 1902ء) کی تھی۔ سٹینٹن ایک نواب گھرانے میں پیدا ہوئی مگر اس کے دل میں مظلوموں کی مدد کی لہر نے کروٹ لی اور اس نے تحریک انسداد غلامی میں ایک سماجی کارکن کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا جس کے دوران اس کی ملاقات اپنے مستقبل کے شوہر ہنری سٹینٹن اور دیگر ایسی خواتین سے ہوئی جنھوں نے حقوق نسواں کی جدوجہد میں تادیر اس کا ساتھ نبھایا۔ اگرچہ سٹینٹن کے ہاں سات بچے ہوئے اور اسے ان کی دیکھ بھال پر بھی کافی وقت صرف کرنا پڑتا تھا، وہ اپنی فراغت کا ایک ایک لمحہ ناموس نسواں کے بارے میں سوچنے، پڑھنے اور لکھنے میں گزارتی تھی۔ وہ 1848ء میں منظر عام پر آنے والا حقوق نسواں کا اپنا مشہور منشور امریکہ کے اعلان خودمختاری کے انداز میں شروع کرتی ہے۔ ''ہم اقرار کرتے ہیں کہ یہ سچائیاں اپنی گواہی خود ہیں کہ تمام مرد و زن دوسرے کے برابر تخلیق کیے گئے ہیں۔''

> سٹینٹن کو تضحیک اور کردار کشی کا نشانہ بنایا گیا اور اس پر اخلاقی اقدار کو بٹہ لگانے کا الزام تھوپ کر اس پر لعن طعن کی گئی۔ اس کی ایک تصنیف ''بائبل نسواں'' کو بہت سے لوگ اب بھی قابل مذمت خیال کرتے ہیں کیونکہ اس میں اس نے خواتین پر روا رکھے جانے والے جبر و استبداد میں یہودی اور عیسائی مذہب کے کردار پر سخت تنقید کی ہے۔(11) لیکن سٹینٹن کسی بات سے ڈری اور نہ جھجھکی۔ اس کی منزل عقیدوں میں اور سماجی اداروں میں اساسی تبدیل پیدا کرنا تھا اور وہ سب کے واسطے آزادی و انصاف کی جدوجہد کے لیے حریت نسواں کو لازم سمجھتی تھی۔ وہ اپنے منشور میں کہتی ہے کہ دنیا میں ابھی تک کوئی حقیقی معنوں میں عظیم اور اچھی قوم پیدا نہیں ہوئی ہے کیونکہ عورت کی تحقیر و تذلیل سے زندگی کے سرچشمے منبعے سے ہی مسموم ہو جاتے ہیں۔''(12)

1848ء میں جس سال کہ مارکس اور اینجلز نے اشتراکی منشور کا اعلان کیا، امریکی فلسفی اور سماجی کارکن الزبتھ کیڈی سٹینٹن کی طرف سے ایک نسوانی منشور بھی جاری کیا گیا۔ لیکن مارکس اور اینجلز نے عورتوں پر معاشی جبر سے متعلق اس تحریر پر کوئی توجہ نہ دی۔ 1860ء کے عشرے میں جب حقوق نسواں کے لیے جدوجہد میں شریک ایک اور خاتون وکٹوریا ووڈ ہال نے اس دور میں رونما ہونے والی مزدور تحریک کے خواتین کارکنوں کے بارے میں امتیازی رویے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو مارکس صاحب نے یونینوں کو یہ مشورہ دیا کہ ''عورتوں کے مسئلے کو مزدوروں کے مسئلے پر فوقیت دینے والے اس دھڑے کو نکال باہر کیا جائے''۔(13) مارکس و اینجلز ے کے لیے ساری باتیں طبقات پر آ کے ختم ہو جاتی تھیں۔ لہٰذا بجائے ایک ایسا انداز نظر اور طریقہ عمل اختیار کرے کہ جس میں ساری انسانیت آ جاتی، انھوں نے اپنی پوری توجہ نوع بشر کے صرف مردانہ نصف پر ہی مرکوز کیے رکھی۔ یعنی صرف مزدور طبقے کے مردوں پر جسے انھوں نے اپنی انقلابی تحاریر کا قبلہ و کعبہ بنائے رکھا۔ ان کی زبان میں ''نسوانی مسئلہ'' کہلانے والے سوال کو سرمایہ داری نظام کے خاتمے تک انتظار کی کوفت برداشت کرنا پڑی۔

چونکہ توجہ و نگہداشت کو خاص طور پر خواتین سے منسوب کیا جاتا ہے اور مارکس و اینجلز خواتین سے متعلق معاملات کو ثانوی خیال کرتے تھے انھوں نے اس شعبے کو بہت کم التفات بخشا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ توجہ و نگہداشت کی بے قدری سے معاشیات، جسے کہ وہ ایک اخلاقی و انسانی رنگ دینے میں کوشاں تھے، انسانی عنصر سے تہی ہو

جاتی ہے۔باوجودان کے معاشی انصاف کا بول بالا کرنے کے عزم کے، وہ یہ نہ جان سکے کہ مرد وزن سے دوہرے معیار کا برتاؤ خواتین بلکہ پورے معاشی و معاشرتی نظام پر کیا اثرات چھوڑتا ہے۔لیکن ان دونوں حضرات پر ہی کیا موقوف اور بھی بہت سے ارباب عقل و دانش کی عقل پر بھی پردہ پڑا رہا اور مسلسل پڑا آتا ہے اور یہ پردہ اتنا دبیز ہے کہ یہ ماضی سے اب تک ہماری عقل ونظر کو گہنا تا چلا آ رہا ہے اور ایسا گہنا رہا ہے کہ ہمارے لیے انسانی صورت حال کو صحیح طور پر دیکھنا اور سمجھنا ممکن ہی نہیں رہا۔

وہ طرح طرح کی حکایتیں......

ہم انسان لوگ حکایتوں کے سہارے زندگی بسر کرتے ہیں ہماری حکایات ہمیں سمجھاتی ہیں کہ کیا بات فطری ہے اور کیا غیر فطری، کیا چیز ممکن ہے اور کیا ناممکن اور کون سی شے قابل قدر ہے اور کون سی شے بے قدر اور فضول۔ہم یہ حکایات بہت ابتدا میں ہی سیکھنا شروع کر دیتے ہیں ...... ہمارے ناقدانہ قوانے کی صورت گری سے قبل ہمارے اذہان کی تشکیل و پختگی سے بھی بہت پہلے۔پھر ہوتا کیا ہے کہ ہم ان حکایات سے حاصل ہونے والے بیانات و اسباق کو اٹل، ناقابل تردید اور ناقابل ترمیم سچائیاں سمجھنا شروع کر دیتے ہیں اور ہمیں ترکے میں ملنے والی بیشتر حکایات کا مرکزی خیال نصف نوع بشر اور اس سے منسوب ہر شے کی تحقیر و بے قدری ہے۔

میرے شعور نے اس دور میں ہوش سنبھالا جب امریکہ تک میں یہ عقیدہ جاگزیں تھا کہ عورتیں مردوں سے کمتر اور حقیر ہوتی ہیں۔زیادہ دور کی بات نہیں مجھے یاد ہے کہ 1950 کے لگ بھگ میں بھی اگر کسی کے ہاں بچی کی ولادت ہوئی تو اڑوس پڑوس والے اس سے افسوس کرتے ......کوئی نہیں بھائی غم نہ کرو خدا کرے گا تو اگلی بار بیٹا ہوگا!

مردوں کی عورتوں پر برتری کا تصور اس قدر پختہ و مضبوط ہے کہ وہ ارباب فکر و خرد بھی کہ جو اپنے مساویانہ آدرشوں کا بڑا مان کرتے ہیں، نوع بشر کے نصف نسوانی کو ''محض ایک نسوانی مسئلہ'' ہی گردانتے نظر آتے ہیں۔ہاں یہ حکماء نوع بشر کے نصف مردانہ کو کبھی بھی ''محض ایک مردانہ مسئلہ'' قرار دے کر مسترد نہیں کرتے۔

میرے ذہن میں انسانی حقوق کے لیے برسر پیکار ایک معروف شخصیت کے ساتھ اپنی

گفتگواب بھی بڑی اچھی طرح محفوظ ہے جسے میں اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ نسوانی حقوق بھی انسانی حقوق کے زمرے میں آتے ہیں۔ پہلے تو وہ میرے جذباتی دلائل سنتا رہا اور شائستہ انداز میں ہوں ہاں کرتا رہا مگر گفتگو کے اخیر میں اس نے مجھے اسی شائستگی کے ساتھ مطلع کیا کہ وہ حقوق نسواں کو اپنے لائحہ عمل میں شامل نہیں کرسکتا۔ اس نے بتایا کہ اس پر پہلے ہی سیاسی تشدد اور قتل و ہلاکت جیسے زندگی و موت کے معاملات کا بڑا بار ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ حقوق نسواں بھی زندگی و موت کا مسئلہ ہے اور عورتوں پر تشدد سے ہر سال سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں جانیں تلف ہو جاتی ہیں (جتنی کہ شاید سیاسی تشدد و ہلاکت سے بھی نہیں ہوتیں) تو جواباً اس سے یہی حاصل ہو پایا کہ بی بی یہ ''محض نسوانی مسائل'' ہیں، پہلے بڑے مسئلوں سے نمٹ لیں پھر ادھر آئیں گے۔

مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ بات بعد میں میرے ذہن سے نہ نکل جائے اس لیے یہیں کر دوں کہ مرد تو مرد بہت سی خواتین بھی اسی جنسی دوہرے معیار کی مقلد ہیں مثلاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بہت سی عورتیں انتخابات کے موقعہ پر خواتین امیدواروں پر مرد سیاستدانوں کو ترجیح دیتی ہیں ...... ہے نہ بات؟ اور دوسرے ملکوں کی تو بات ہی کیا کرنا ہے، وہاں مرد وزن کے تفادت کا رنگ اور بھی گاڑھا اور اس سے پیش آمدہ نتائج اور بھی زیادہ افسوسناک ہیں۔

بہت سی اقوام کی ریتوں، رواجوں اور قوانین میں اس ترقی یافتہ دور میں بھی عورتوں اور لڑکیوں کے خلاف انتہائی عریاں امتیاز روا رکھا جاتا ہے۔ افریقہ، جنوب مشرقی ایشیا اور مشرق الاوسط کے بہت سے ملکوں اور ریاستوں میں عورتوں کو زمین خریدنے، اپنا کاروبار کرنے حتیٰ کہ آزادانہ نقل و حرکت کی بھی اجازت نہیں۔ ان میں سے بعض ممالک تو ایسے ہیں جہاں والدین لڑکیوں کو تعلیم بھی حاصل نہیں کرنے دیتے، ان کے علاج معالجے میں بھی خساست کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور روٹی بوٹی کے معاملے میں بھی انھیں لڑکوں سے پیچھے رکھا جاتا ہے۔

یہ غذائی دوہرا معیار ...... جو کہ عموماً مائیں اپنی لڑکیوں سے روا رکھتی ہیں ...... عورتوں میں اضافی شرح اموات کا براہِ راست مؤجب بنتا ہے۔ نوبل انعام یافتہ ماہر معاشیات امرتیا سین کے مطابق 1990ء میں ایک چوتھائی دختران ہند پندرہ کے سن کو پہنچنے سے قبل ہی موت کا شکار ہوگئیں۔ (15) اسی طرح دنیا کے دیگر ممالک میں لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی شرح اموات کافی زیادہ ہے۔ 1991ء میں جاری کردہ اقوام متحدہ کی عورتوں پر ایک خصوصی رپورٹ

کے مطابق پاکستان میں دو سے پانچ برس کی آبادی میں لڑکوں کی سالانہ شرح اموات 36.9 جبکہ لڑکیوں میں 54.4 فی ہزار ریکارڈ کی گئی ہے اور ہیٹی میں یہ تناسب 47.8 لڑکوں کے لیے جبکہ 61.2 لڑکیوں کے لیے، تھائی لینڈ میں 17.3 اور 26.8 اور شام میں 9.3 اور 14.6 رہا۔(16) خواتین کے معاملات پر انھیں ''محض نسوانی مسائل'' قرار دے کر حجاب ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن ایسی کوششوں سے باتوں کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ لڑکیوں اور عورتوں کو کم غذا دینے سے لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کی ترقی پر برا اثر پڑتا ہے۔ یہ بات معروف ہے کہ ناقص خوراکی کی شکار خواتین کے ہاں پیدا ہونے والے بچوں کی صحت خراب ہوتی ہے اور ان کی دماغی نشوونما بھی ٹھیک سے نہیں ہو پاتی۔ لڑکیوں اور خواتین کے خلاف تغذیے اور علاج کے معاملے میں برتا گیا امتیاز تمام بچوں کو، خواہ وہ مذکر ہوں یا مئونث بہتر نشوونما کے ان کے پیدائشی حق سے محروم کر دیتا ہے۔

اس نوع کا جنسی امتیاز نہ صرف یہ کہ بہت زیادہ حزن و ابتلا اور ناسودگی کو جنم دیتا ہے بلکہ انسان اور انسان کی اقتصادی ترقی کی راہ میں بھی حائل ہوتا ہے۔ اس سے کسی معاشرے یا ملک کی افرادی قوت پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ اس سے بچوں اور بڑوں کی حالات سے تطابق و تسویے، ناکامی کو برداشت کرنے اور تشدد سے اجتناب و گریز کی صلاحیت بھی متاثر ہوتی ہے۔ یہ سب عوامل آگے جا کر فلاکت و افلاس اور مسلح تصادم کی راہیں ہموار کرتے ہیں اور ہم سب کے لیے ایک خوشحال اور پرامن دنیا کے خواب کو شرمندہ تعبیر ہونے سے روکتے ہیں۔

دنیا کے زیادہ تر ممالک میں توجہ و نگہداشت کے کام کی، جسے کہ روائتی طور پر خواتین ہی سرانجام دیتی ہیں، حوصلہ افزائی یا تو بالکل ہے ہی نہیں اور یا پھر نہ ہونے کے برابر ہے۔ معدودے چند ایسے ممالک ہوں گے جہاں سرکار بچوں والے گھرانوں کو کوئی الاؤنس دیتی ہو۔ نگہداشتی کام کے صلے میں گھر میں تو خیر کچھ ملتا ہی نہیں گھر سے باہر بھی اسے زیادہ اجرت کا سزاوار خیال نہیں کیا جاتا۔

اور اگر اس میں لڑکیوں اور عورتوں کے خلاف روا رکھے جانے والے تعلیمی، غذائی اور معاشی امتیاز کو بھی جمع کر لیں تو اس سے جو نتیجہ سامنے آئے گا اس کا تصور آپ بخوبی کر سکتے ہیں۔ عالمی جائزے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ آج کی دنیا میں بھی غرباء و مفلسین کا بڑا حصہ بچوں اور خواتین پر مشتمل ہے۔ میں کہوں گی کہ جب تک جنس پر مبنی معاشی دوہرے

معیار کا کوئی اپائے تلاش نہیں کر لیا جاتا عالمی غربت کی شرح میں کسی خاطر خواہ تبدیلی کی توقع کرنا بے سود اور غیر حقیقت پسندانہ ہوگا۔ جب تلک خواتین اور خواتین سے منسوب وظائف کی بے قدری کے سلسلے کا سدِ باب نہیں ہوتا عورتیں اور بچے مفلسین عالم کی صفیں سِوا کرتے رہیں گے۔

ان باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ جنس کی بنا پر روا رکھی جانے والی نا انصافیاں طبقات، نسل یا دیگر عوامل کی بنا پر کی جانے والی نا انصافیوں کی نسبت زیادہ توجہ طلب ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بات کرتے آ رہے ہیں انسانیت کی ''اعلیٰ'' و ''ادنیٰ'' میں تقسیم کا بنیادی سانچہ جو کہ تسلطی گھرانوں میں بچوں کے ذہنوں میں ابتدا ہی سے کوٹ کوٹ کر بھر دیا جاتا ہے، نوع بشر کا مرد برتر۔ عورت حقیر کا سانچہ ہے۔ اور جب تک لوگ اسی طرح کے تصورات کو ذہن میں بٹھاتے رہیں گے، مقامی بمقابلہ خارجی طرز کی اس سوچ میں تبدیلیوں کی آس لگانا غیر حقیقت پسندانہ ہوگا جو کہ دنیا میں نظر آنے والے اس قدر الم اور نا انصافی کا سبب ہے۔

اسی طرح اس وقت تک زیادہ عوامی سطح کی متوجہ معاشی و معاشرتی پالیسیوں کی توقع لگانا بھی بے کار اور غیر حقیقت پسندانہ ہوگا جب تک کہ خواتین و حضرات دونوں توجہ و نگہداشت کے معاون حیات وظائف کو ''محض ایک نسوانی کام'' قرار دے کر اس کی تحقیر کرنے کی روش کو بند نہیں کرتے اور یہ بات بھی ہے کہ اگر نگہداشتی عمل کی سماجی سطح پر حوصلہ افزائی نہیں ہوگی تو معاشی پالیسیوں میں بھی اسے خاطر خواہ قدر و قیمت نہیں ملے گی۔

یہاں میں یہ وضاحت بھی کرتی چلوں کہ میں جب توجہ و نگہداشت کو ''نسوانی کام'' کہہ کر بات کرتی ہوں تو در حقیقت میں ان زمانوں سے ورثے میں ملنے والے فرسودہ عقائد کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہو کہ جب جنس کی بنیاد پر معاشرتی وظائف کی تقسیم کا عمل بہت زیادہ سخت اور بے لچک تھا، ہمارا نصب العین ایک ایسا معاشرہ نہیں ہونا چاہیے کہ جہاں نگہداشت و دیکھ بھال کا فریضہ لازماً صرف خواتین ہی سرانجام دیں بلکہ ہمیں ایک ایسے سماج کے لیے تگ و دو کرنی چاہیے کہ جہاں خواتین کو کام کے یکساں اور مساوی مواقع میسر آئیں اور گھر میں خواتین و حضرات دونوں مل جل کر نگہداشت کے فرائض ادا کریں۔ بالفاظ دیگر ہمارا مقصود نظر ایک ایسا معاشی و معاشرتی نظام ہونا چاہیے جو عورتوں پر روائتاً مردوں کے لیے مختص شعبوں سے پرے رہنے کی قدغن نہ لگائے اور توجہ و نگہداشت کے بارے میں یہ خیال نہ کرے کہ یہ کام صرف خواتین کے لیے یا پھر ''زنانہ خصائل'' کے مالک مردوں کے لیے ہی مناسب ہیں۔

میں یہ بات بھی دہرانا چاہوں گی کہ توجہ ونگہداشت کی مناسب حوصلہ افزائی سے ہمارے عالمی مسائل آپ ہی آپ نہیں سدھر جائیں گے۔جیسا کہ ہم آئندہ اوراق میں دیکھیں گے تسلطی نظام سے شراکتی نظام کی طرف منتقلی ایک نہائت پیچیدہ عمل ہے۔لیکن سب باتیں ایک طرف جنسی دہرے معیار سے پیچھا چھڑانا نہائت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر تسلطی نظام سے شراکتی نظام کی طرف رخ موڑنا ناممکن ہے۔

جب میں خواتین اور''نسوانی'' کی بے قدری کا رونا روتی ہوں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں دنیا کے تمام مسائل کا الزام مردوں کے سردھرنے کے در پے ہوں بلکہ ہم تو ایسی کہنہ روایات کے خلاف نبرد آزما ہیں کہ جنھوں نے صرف خواتین کو ہی خراب نہیں کیا بلکہ مردوں کا ناس بھی مارا ہے۔انھوں نے خواتین پر جومنفی اثرات چھوڑے ہیں وہ ظاہر ہیں لیکن میں کہوں گی صرف خواتین ہی نہیں بلکہ ہم سب ان کے متاثرین میں شامل ہیں۔

نگہداشتی کارکن کا احساس بیگانگی

مارکس و اینجلز نے اشتراکیت کو سرمایہ دارانہ نظام کے متبادل کے طور پر پیش کرتے وقت مزدوروں کی بیگانگی کے بارے بھی بات کی۔انھوں نے یہ مئوقف پیش کیا کہ صنعتی اور زرعی کارکنوں کی بے قدری و استحصال معاشی ناانصافی کی جڑ ہے۔یہ کہتے وقت کہ ہمیں ایک ایسی معاشیات کی ضرورت ہے جو اشتراکیت اور سرمایہ داریت دونوں سے بالا ہو، میں نگہداشتی کارکنوں کی بیگانگی کی بات کروں گی اور یہ کہوں گی کہ اس اساسی خدمت کی بے قدری و استحصال ہی معاشی ناانصافی کا مرکزی اور سب سے بڑا محرک ہے۔(19)

توجہ ونگہداشت کی بے قدری و استحصال ہماری ان زمانوں سے ملنے والی وراثت ہے جب خواتین کے جسم اور محنت دونوں کو مرد کی ملکیت تصور کیا جاتا تھا۔(20) نتیجتاً خواتین اور خواتین سے منسوب چیزوں کو اقتصادی فکر میں کوئی حیثیت حاصل نہ ہوسکی کیونکہ اس کا مرکز و محور صرف اور صرف مردوں کا باہمی لین دین تھا۔

ایڈم سمتھ اور بعد میں مارکس نے نگہداشتی کام کا ذکر تو کیا لیکن انھوں نے بھی اسے پیداواری کھاتے میں ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور اپنی ضخیم تصانیف میں''نسوانی کام'' کو محض برائے نام جگہ ہی مرحمت فرمائی۔اور آج تک بھی معاشی نظریات اور سانچوں میں توجہ و

نگہداشت کو مناسب قدر و وقعت نہ دینے کی یہ کوتاہی معاشی پیمائشوں، روائتوں اور پالیسیوں کو براہِ راست متاثر کر رہی ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بات کر چکے ہیں کہ نگہداشتی پیشوں کو ان پیشوں کی نسبت کہ جن میں نگہداشتی عنصر نہیں ہوتا، کم قدر و قیمت دی جاتی ہے۔ سوویت یونین میں کارخانوں میں کام کرنے والے کارکنوں کو معلمین بلکہ ڈاکٹروں (زیادہ تر خواتین) سے بھی زیادہ اجرت دی جاتی تھی۔ اس کے برعکس امریکہ میں ڈاکٹروں (جن میں زیادہ تعداد مردوں کی تھی) کا شمار سب سے زیادہ تنخواہ حاصل کرنے والے پیشہ ور افراد میں ہوتا تھا۔ (21) آج بھی امریکہ میں نگہداشت اطفال اور چھوٹے بچوں کی تدریس کے شعبے میں خدمات سرانجام دینے والے افراد (جن میں غالب اکثریت عورتوں کی ہے) کو نل سازوں، مستریوں او انجینیئر وں (جن میں مردوں کی تعداد زیادہ ہے) کے مقابلے میں کم معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔ اور یہ اس حکائت کا فقط ایک جزو ہے۔

بازار محنت سے باہر کیے جانے والے نگہداشتی کام کی قدر اور بھی گھٹا دی جاتی ہے۔ اسے خام خانگی پیداوار (خ۔خ۔پ) جیسے معاشی پیداواریت کے پیمانوں میں کسی شمار میں ہی نہیں لایا جاتا۔ ہاں یہ پیمانے اسلحہ سازی، اسلحہ بازی، سگریٹ کی تیاری و فروخت اور ایسے دیگر کاموں کو شمار میں ضرور لاتے ہیں جو زندگی کو نمو دینے کی بجائے اس کا ناس مارتے ہیں۔ (22)

معاشی پیمانوں میں توجہ و نگہداشت کے کام کی بے وقعتی معاشی دہرے معیار کو دوام دینے میں مدد دیتی ہے جو خاص طور پر نسوانی خیال کیے جانے والے کام کو مردانہ کام کی نسبت بہت کم قدر و قیمت دیتا ہے خواہ اسے مرد سرانجام دیں یا خواتین، اور یہی دہرا معیار ہے جو ہماری دنیا کے بظاہر لاینحل مسائل کے پیچھے کارفرما ہے۔

سیاستدان ''ہمیں ایک زیادہ شفیق اور ملتفت دنیا'' اور ''ہمدردانہ قدامت پسندی'' جیسے دلفریب نعرے دیتے ہیں لیکن جب بچوں، بوڑھوں، بیماروں اور بے گھر افراد کی نگہداشت کی بات آتی ہے تو ان کی پالیسیوں میں نام کا شفقت و پیار بھی دیکھنے کو نہیں ملتا اور شفقت و پیار نظر بھی کیسے آئے توجہ و نگہداشت کے ''نسوانی کام'' کی بے قدری تو نہ صرف ہمارے تحت الشعور میں گھر کر کے بیٹھ چکی ہے بلکہ ان معاشی اصولوں اور آدرشوں میں بھی جن کی ہمارے بیشتر سیاستدان تقلید کرتے ہیں۔

بعض لوگ کہیں گے کہ بھئی ہم نگہداشت کی قدر افزائی کرتے تو ہیں۔ یوم مادر منایا جاتا ہے جس میں ہم اپنی ماؤں کو ٹافیاں اور پھول پیش کرتے ہیں۔ ماؤں کی قدر افزائی کے سلسلے میں بہت بلند بانگ دعوے کیے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ "ممتا اور ایپل پائی" امریکہ کی مرکزی اقدار ہیں لیکن فی الواقع ہم ماں یا ممتا کی کوئی قدر و در نہیں کرتے۔ اگر کرتے ہوتے تو امریکہ میں معمر خواتین جن کی اکثریت ماؤں پر مشتمل ہے، میں غربت کی شرح معمر مردوں میں غربت کی شرح سے دگنی نہ ہوتی۔ (23) اور نہ ہی کرہ ارض پر مفلسین کی اکثریت بچوں اور عورتوں پر مشتمل ہوتی۔

ہمارا ماحولیاتی بحران بھی جنسی دہرے معیار سے پیدا ہونے والی کج اقدار کا ہی شاخسانہ ہے۔ ہمارے معاون حیات قدرتی نظاموں کی اس تباہ کاری، جو کہ ہم اپنے ہاتھوں انجام دے رہے ہیں، کا الزام عموماً اٹھارھویں صدی میں زور پکڑنے والے سائنسی و صنعتی انقلاب کے سر منڈھا جاتا ہے۔ مگر "تسخیر فطرت" کا تصور اس سے بھی بہت پہلے کا ہے۔

دہرے معاشی معیار کے غیر مرئی اثرات

ہمارے نظام میں جنسی اور معاشی دہرا معیار کس قدر سرائت کر چکا ہے اس کا اندازہ حال ہی میں کی گئی ایک تحقیق سے کیا جا سکتا ہے جس میں مختلف النوع صنعتوں اور شعبوں سے منسلک 512 مختلف کاروباری اداروں میں کام کرنے والے 2178 خواتین اور مرد منیجروں کی تنخواہوں میں فرق کا جائزہ لیا گیا ہے۔ امریکی انجمن نفسیات کے جریدۂ اطلاقی نفسیات میں شائع ہونے والی اس تحقیق کا کہنا ہے کہ:

جب کسی جگہ عورتوں کی اکثریت ہو جائے تو خواتین اور مرد منیجر دونوں کی تنخواہ میں تیزی سے تخفیف واقع ہو جاتی ہے۔ ایک ایسی خاتون یا مرد منیجر جس کے نیچے کام کرنے والوں میں سے 80 فی صد خواتین ہوں، ایک ایسے منیجر کی نسبت کہ جس کے نیچے کام کرنے والے کارکنوں میں 80 فی صد مرد ہوں، تقریباً 7000 ڈالر سالانہ کم تنخواہ لیتا ہے۔ ایک ایسا منیجر جس کے نیچے صرف خواتین کام کرتی ہوں، ایک ایسے منیجر کی نسبت کہ جس کے عملے میں 50 فی صد خواتین ہوں، 900 ڈالہ سالانہ کم تنخواہ وصول کرتا ہے۔ ایک ایسا منیجر جس کا سپروائزر عورت ہو ایک ایسے منیجر کی نسبت کہ جس کی سپروائزر مرد ہو تقریباً 2000 ڈالر سالانہ کم تنخواہ لیتا ہے۔

ہمیں میراث میں ایک ایسی معاشیات موصول ہوئی ہے جس کی بنیاد یہ مفروضہ ہے کہ مرد کو عورت اور فطرت دونوں کے ممد حیات وظائف پر پورا ختیار ہے۔ بائیبل کی کتاب آفرینش 1:28 میں ہمیں یہ پڑھنے کو ملتا ہے کہ مرد کو اختیار ہے کہ وہ زمین کو تسخیر کرے اور ''ہر زندہ شے جو کہ زمین پر حرکت کرتی ہے پر حکومت کرے'' اس کتاب میں ایک اور جگہ لکھا ہے کہ مرد کو عورت پر حکمران بنایا گیا ہے جو کہ اس کے زیر فرمان ہے۔

یہاں میں اس بات کا اضافہ کرنا چاہوں گی کہ فطرت اور عورت پر مرد کے اختیار و تصرف کا یہ تصور دنیا میں پہلی بار بائیبل نے متعارف نہیں کرایا تھا بلکہ یہ بائبل سے ہزاروں برس قبل بھی دنیا میں موجود تھا۔

مثال کے طور پر بابلی اساطیر میں مذکور ہے کہ جنگ کے دیوتا مردوخ نے دنیا کو دیوی ماتا تمات کے جسم کو دو حصوں میں تقسیم کر کے تخلیق کیا تھا۔ یہ آفرینشی حکایت ایک ثقافتی تبدیلی کی جانب اشارہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ تبدیلی اس ماتا دیوی سے منسلک پہلے کی حکایات کہ جس میں اس نے فطرت کو اور انسانوں کو قدرت کے ایک جزو کے طور پر تخلیق کیا تھا، سے اس حکایت کی جانب تبدیلی ہے کہ جس میں دنیا ایک خدائے نرینہ کے ایک پر تشدد اور خونیں فعل کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔ اس نئی حکایت نے ان قدیم حکایات کی جگہ لے لی جن میں تخلیق عورت کے حیات آفریں قولے سے ظہور میں آئی تھی۔ یہ اس دور کے آغاز کا پتہ بھی دیتی ہے جب نسوانی خداؤں کو بشمول خواتین اور ان سے منسوب سب اشیاء کے محکوم بنایا گیا۔(25)

بلاشبہ ہمیں اس امر کی ضرورت ہے کہ اٹھارھویں صدی میں رواج پانے والے میکانکی سائنسی نظام کو اب ترک کر دیا جائے اور یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ جدید سائنس نے ایسی طاقتور حرفتوں کو جنم دیا ہے جنھوں نے ''تسخیر فطرت'' کے قاعدے پر چل کر شدید ماحولیاتی مسائل پیدا کیے ہیں مگر ہمارے ماحولیاتی مسائل کا سارا ملبہ نیوٹنی سائنس یا کارتیسی منطقیت پر ڈالنا ہزاروں برس کی انسانی تاریخ کو جھٹلانے کے مترادف ہوگا۔ جب سر فرانسس بیکن نے اپنا یہ مشہور جملہ ادا کیا تھا کہ انسان کو ایک زیادہ منطقی نظام کے قیام کی خاطر ''فطرت سے اس کے راز بزور اگلوانے ہوں گے'' تو وہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ محض ایک بہت ہی قدیم تصور کا اعادہ کر رہا تھا۔

MashalBooks.com

توجہ ونگہداشت کوشمار میں لانے والے معاشی پیمانے

سائنس اور ٹیکنالوجی مسئلہ نہیں ہے۔مسئلہ تسلط کی وہ ریت ہے جو ہمیں ورثے میں ملی ہے اور ہمارے تحت الشعور میں بیٹھ چکی ہے اور اس کے ساتھ وہ معاشی دہرا معیار مسئلہ ہے جو توجہ ونگہداشت کو کوئی قدر و قیمت نہیں دیتا خواہ یہ لوگوں کے لیے کی جائے یا ہمارے قدرتی مسکن کے لیے اور اگر دیتا بھی ہے تو فقط نام کی بس کھرچن۔

بعض لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ گھروں اور غیر مالی معیشت کے دوسرے مناطق میں توجہ و نگہداشت کو قدر وقعت دینے والا کوئی معاشی نظام کار آمد نہیں ہوگا۔چونکہ یہ کام منڈی سے باہر کیا جاتا ہے، وہ فرماتے ہیں، لہٰذا اس کی قدر ماپنا ناممکن ہے لیکن جہاں یہ کہنا برحق ہے کہ توجہ ونگہداشت سے منتج ہونے والے فوائد کی قدر کا تعین ڈالروں یا پاؤنڈوں میں نہیں کیا جا سکتا، یہ کہنا کہ اس کام کی معاشی قدر کو سرے سے ماپا یا آنکا ہی نہیں جا سکتا، حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔

اگر تھوڑا پیچھے یعنی 1930ء کے عشرے میں جائیں تو ماہر معاشیات مارگریٹ ریڈ ہمیں بتاتی ہے کہ گھروں میں سرانجام دیے جانے والے بلا معاوضہ کام کی اعدا وشمار میں پیمائش ممکن ہے۔(27) 1980ء کی دھائی میں آئیں تو ہماری ملاقات میریلین وارنگ سے ہوتی ہے جس کی تصنیف ''اگر خواتین کسی کھاتے میں آتی ہیں'' میں منڈی کے بیرون سرانجام دیے گئے کام کی پیمائش کے متعدد مقداری طریقے تجویز کیے گئے ہیں۔

1990ء کے عشرے کے اوائل میں تنظیم برائے ترقی وتعاون نے غیر بازاری گھریلو کام اور پیداوار کو آنکنے کے تین طرائق کا جائزہ لیا۔ایک تو ضیاع اجرت کا پیمانہ ہے یعنی اجرت کے اس نقصان کا تخمینہ لگایا جائے جو ایک عورت کو ملازمت کے مواقع تج کے اپنا وقت بچوں اور والدین کی دیکھ بھال اور دیگر ایسے بلا معاوضہ کاموں میں صرف کرنے کی صورت میں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ دوسرا طریقہ عالمی بدل کا ہے یعنی گھریلو نگہداشت کا وظیفہ سرانجام دینے والے کارکن کی بازاری اجرت کو معیار بنایا جا سکتا ہے۔ یہ طریقہ میں کہوں گی کہ بہت بودا ہے کیونکہ گھریلو کام کاج کی منڈی میں لگائی جانے والی قیمت تاحال بہت کم ہے۔ تیسرا طریقہ ''بدل متخصص'' کا میزان ہے یعنی باورچیوں، نرسوں اور مالیوں کی بازاری اجرتوں کو جمع

کیا جائے اور گھریلو دیکھ بھال کے کام کو آنکنے کے لئے اس مجموعی رقم کو معیار بنایا جائے۔
مذکورہ بالا طریقوں کو ہم ''لاگتی طریقے'' کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان میں گھریلو کام کاج کو بلحاظ لاگت (مثلاً اس پر صرف ہونے والے وقت کو) آنکا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کے عالمی ادارۂ تربیت وتحقیق برائے نسواں نے اس مقصد کے لئے ایک اور یعنی پیداواری طریقہ تجویز کیا ہے۔ اس طریقے میں خانگی پیداواریت کو آنکنے کے لئے گھر پر سرانجام دی جانے والی خدمات اور تیار کی جانے والی مصنوعات کی بازاری قیمت کو معیار بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً اس تخمینے میں ریسٹوران میں طعام پر اٹھنے والے مصارف اور بچوں کو کسی پیشہ ور معلم سے ٹیوشن پڑھوانے کے عوضانے کو تعین قدر کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ان بے معاوضہ معاشی خدمات کی قدر کے تعین کے بہترین طریقوں کی توضیع کرنا' انھیں جلا دینا اور ان کا اطلاق کرنا اور پھر ان پیمائشوں کو مروجہ پیمانوں سے جوڑنا کوئی سہل کام نہیں لیکن اب روز بروز زیادہ سے زیادہ ماہرین معاشیات اس کام کی اہمیت وضرورت کو تسلیم کرنے کی جانب آ رہے ہیں۔

لورڈیز بنیریا' نینسی فولبر اور ڈنکن آئرن مونگر سمیت بہت سے ماہرین نے ان معاملات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ آئرن مونگر مثال کے طور پر کہتا ہے کہ گھر کے افراد کے لیے کئے گئے بے معاوضہ کام سے معیشت میں شامل کی گئی قدر کو خام خاندانی پیداوار (خ۔خ۔پ) کا نام دیا جائے اور بازاری معیشت سے شامل کی گئی قدر کو خام بازاری پیداوار (خ۔ب۔پ) کے نام سے موسوم کیا جائے۔
خ۔خ۔پ اور خ۔ب۔پ دونوں مل کر پھر ایک زیادہ درست معاشی پیمائش تشکیل دے سکیں گے جسے وہ خام معاشی پیداوار (خ م پ) کا نام دیتا ہے۔30

بجٹ اور اقدار

> امریکہ کا نصف سے زیادہ صوابدیدی فنڈ فوج کو دیا جاتا ہے جبکہ تعلیم، صحت اور خدمات انسانی کے حصے میں صرف کھرچن آتی ہے۔
>
> 2005ء کا صدارتی بجٹ

پرانے فوجیوں کے امور رہائش وشہری ترقی

صحت اور انسانی خدمات

تعلیم

وفاقی اخراجات

> بنیر یا، فولبر، سکاٹ برنز، جولی نیلسن اور دیگر ماہرین معاشیات کی طرح آئرن مونگر بھی یہی موقف پیش کرتا ہے کہ جب تلک پیداواریت کی شماریاتی پیمائشوں میں گھر میں سرانجام دیے جانے والے نگہداشتی وظائف (جو کہ انسانی سرمائے کی پرورش و پرداخت کرتے ہیں) کو شامل نہیں کر لیا جاتا، ہماری معاشیات کی تصویر ادھوری اور ناقص ہی رہے گی۔ جیسا کہ ہلکا پاٹلا اور این چادیو کہتے ہیں کہ اگر خاندانی پیداوار کو کلی معاشیاتی حسابات کے نظام میں شامل کر لیا گیا ہوتا تو حکومتوں کی معاشی ترقی کی تصویر یکسر مختلف ہوتی اور انھوں نے قطعی مختلف معاشی و معاشرتی پالیسیوں کا نفاذ کیا ہوتا۔(31)

مارچ 2006ء میں کانگریسی ارکان لن ڈولسے اور باربرالی نے ایچ۔آر 4898 ایکٹ متعارف کرایا تاکہ پینٹاگون کے لیے مختص کردہ غیر ضروری فنڈز کو ایسی داخلی ترجیحات کے لیے استعمال کیا جا سکے جن کے لیے ناکافی رقم مختص کی گئی تھی۔ اس کے لیے 7 بلین ڈالر کی کٹوتی نیشنل میزائل ڈیفنس پروگرام سے تجویز کی گئی اور 13 بلین ڈالر جوہری بموں کی تعداد ایک ہزار تک کم کر کے بچانے کا مشورہ دیا گیا۔ دفاعی امور کے ماہر لارنس کورب، جو کہ ماضی میں صدر ریگن کے ساتھ افرادی قوت، تنصیب اور لاجسٹک کے شعبے کے سربراہ اور نائب وزیر دفاع کے طور پر بھی کام کر چکے ہیں، کے مطابق یہ 60 بلین ڈالر امریکہ کی سالمیت کو خطرہ میں ڈالے بغیر آرام سے بچائے جا سکتے ہیں۔32 یہ رقم ٹیکسوں میں بغیر کسی اضافے کے یوں خرچ کی جائے گی:

صحت اطفال: 10 بلین ڈالر سالانہ ایسے امریکی بچوں کے علاج معالجے پر خرچ کے لیے جن کی صحت کا بیمہ نہیں کروایا گیا۔

مدارس کی تعمیر: 10 بلین ڈالر 12 برس کے عرصے میں ملک کے ہر سرکاری سکول کی تعمیر نو اور اسے جدید ساز و سامان سے آراستہ کرنے پر۔

طبی تحقیق: 2 بلین ڈالر سالانہ علاج معالجے کے قومی اداروں کے بجٹ میں کی گئی کٹوتیوں کو پورا کرنے کے لیے۔

تربیت کارکنان: 5 بلین ڈالر سالانہ 250000 ان امریکی افراد کی ملازمت برقرار رکھنے کے لیے جنھیں غیر ملکی تجارت کے سبب ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔

عالمی بھوک: 13 بلین ڈالر سالانہ غریب اقوام کی امداد کے لیے تا کہ وہ ان 6 ملین بچوں کا پیٹ بھر سکیں جن کا ہر سال بھوک کے ہاتھوں مر جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

توانائی میں خود مختاری: 10 بلین ڈالر سالانہ تا کہ کار آمد اور قابل تجدید توانائی کے ذخائر پر سرمایہ کاری کر کے تیل درآمد کرنے کی حاجت سے چھٹکارا پایا جاسکے۔ داخلی سلامتی: 5 بلین ڈالر سالانہ ایمرجنسی تیاریوں کے فنڈ میں کمی کو پورا کرنے کے لیے۔

خسارے میں تخفیف: 5 بلین ڈالر 8.2 بلین ڈالر کے قومی قرضے کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے۔

نوٹ: یہ اعداد و شمار www.sensiblepriarities.org سے با قاعدہ اجازت کے تحت منتقل کیے گئے ہیں۔

آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ سے لے کر سوئٹزر لینڈ اور جنوبی افریقہ تک بہت سے ملک غیر بازاری گھریلو کام کے سرووں کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اس نوع کے سرووں میں پہل سکنڈے نیویا کے ممالک نے کی۔ ناروے نے پہلا سروے 1912ء میں کرایا اور اب تک اس عمل کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ جیسے کہ جولی ایسلا کسن اور شارلٹ کورن ناروے کے تجربے کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ان سرووں نے ناروے کی معاشی پالیسیوں کی تشکیل میں بہت اہم کردار ادا کیا جو سکنڈے نیویا کے دیگر ممالک کی طرح دنیا کے دوسرے حصوں کے ممالک کے مقابلے میں توجہ و نگہداشت کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔(33)

اس نوع کے تمام سروے ظاہر کرتے ہیں کہ بلا معاوضہ یا رضا کارانہ کام کی زری قدر بہت زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر 2004ء میں سوئٹزر لینڈ کی حکومت کے 2000ء کی مردم شماری سے حاصل ہونے والے اعداد و شمار پر مبنی سروے سے معلوم ہوا کہ وہاں رضا کارانہ کام کی قدر 250 بلین سوس فرانک تھی یعنی 190 بلین ڈالر۔ یہ رقم مبینہ سوس خ۔گ۔پ کا 70 فی صد تھی۔ ان اعداد و شمار میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ اس بلا معاوضہ کام کا سب سے بڑا حصہ گھروں میں سر انجام دیے جانے والے خواتین کے نگہداشتی وظائف پر مشتمل تھا۔ اس طرح تمام بلا معاوضہ کام کی کل قدر کا دو تہائی حصہ خواتین کا تھا۔(34)

MashalBooks.com

یہ سروے یہ بھی بتاتے ہیں کہ رضا کارانہ محنت پر صرف کیا گیا کل وقت اجرتی کام پر صرف کیے گئے وقت کے اوسطاً مساوی ہے یا پھر اس سے زیادہ ہے۔ مزید برآں یہ اس بات کی بھی تصدیق کرتے ہیں کہ اس وقت کا بیشتر حصہ اس وقت پر مشتمل ہے جو خواتین گھر پر بچوں، بوڑھوں اور بیماروں کی دیکھ بھال اور گھر کے ماحول کی صفائی، ستھرائی اور آرائش پر صرف کرتی ہیں۔

1985ء میں نیروبی میں منعقد کی جانے والی خواتین کی عالمی کانفرنس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ تمام قومی حسابات میں خواتین کی غیر اجرتی خدمات کو بھی شمار کیا جائے۔ 1995ء میں بیجنگ میں ہونے والی اس طرح کی کانفرنس میں بھی اس بات کا اعادہ کیا گیا۔ اقوام متحدہ کی 1995ء میں جاری کردہ انسانی ترقیاتی رپورٹ، جس میں اس سال ہونے والی خواتین کانفرنس کے سبب عورتوں پر بہت زیادہ توجہ دی گئی، میں بھی اس بات پر زور دیا گیا کہ خواتین کی بلا معاوضہ محنت کو قومی آمدنی کے ایک حصے کے طور پر شمار کیا جائے۔

اس رپورٹ میں یہ تخمینہ پیش کیا گیا کہ خواتین کی بلا معاوضہ محنت کی قیمت 11 ٹرلین ڈالر سالانہ تک جا پہنچتی ہے۔ اس رپورٹ کے اصل الفاظ میں ''اگر قومی اعداد و شمار خواتین کی اس غیر مرئی خدمت کو مکمل طور پر دکھانے لگیں تو ارباب اختیار کے لیے اپنے فیصلوں اور پالیسیوں میں خواتین کو نظر انداز کرنا ناممکن ہو جائے گا۔'' اس رپورٹ میں یہ بھی درج ہے کہ ''اگر خواتین کی غیر اجرتی محنت کو صحیح وقدر و قیمت دی جائے تو عین ممکن ہے کہ اکثر معاشروں میں خواتین کفالت کے معاملے میں مردوں سے بازی لے جائیں۔ یا کم از کم ان کے برابر تو آ ہی جائیں --- کیونکہ وہ مردوں کے مقابلے میں کام پر زیادہ وقت صرف کرتی ہیں''۔ (35)

خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والی مختلف تنظیموں اور خواتین کی عالمی کانفرنس کے ڈالے گئے دباؤ کے جواب میں اقوام متحدہ نے 1993ء میں ایک اہم حساباتی تبدیلی کی سفارش کرتے ہوئے کہا کہ قومی حسابات کا ایک نیا نظام وضع کیا جائے اور اس میں گھریلو محنت کو ''ذیلی'' حساب میں رکھا جائے۔ اس کے بعد یورپی کمیشن کے شماریاتی ادارے یوروسٹیٹ نے گھریلو پیداوار کے ذیلی حساب کے لیے ایک مینوئل شائع کیا ہے۔ اگرچہ ذیلی حسابات اب بھی خ گ پ اور خ ق پ سے الگ ہیں، یہ زیادہ مبنی بر حقیقت بین الاقوامی معاشی پیمائشوں کی طرف ایک اہم قدم ہے۔

یہ اس بات کو بھی عیاں کرتے ہیں کہ گھروں میں سرانجام دیے جانے والے غیر اجرتی نگہداشتی کام کی قدر و قیمت کو تسلیم کیا جاتا ہے یا نہیں ایک سیاسی مسئلہ ہے، شماریاتی اڑچنوں کا مسئلہ نہیں۔

معاشی دہرے معیار سے آگے

یقیناً دنیا میں ایسا کوئی پیمانہ نہیں کہ جس سے انسان کو اس وقت ملنے والی سرخوشی کو ماپا جا سکے جب اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہمیں قدر و وقعت دی جارہی ہے اور ہم قابل قدر ہیں، ہم توجہ کے قابل ہیں اور ہم دوسروں پر توجہ دے کر ان کی زندگیوں کو بھی متموّل بنا سکتے ہیں۔

ہم توجہ و مہربانی سے، احساس تحفظ سے اور چاہے جانے سے حاصل ہونے والے بے حد وحساب فوائد کی قدر کا تعین ڈالروں میں کیسے کر سکتے ہیں؟ ہم اپنی اصل شناخت ملنے پر حاصل ہونے والی مسرت اور ان رشتوں سے دل کو ملنے والی طاقت کی قدر کی مقدار بندی کیسے کر سکتے ہیں کہ جن سے ہماری اور دوسروں کی اصل انسانیت جھلملاتی نظر آتی ہے؟

ہم اس خوشی کی مقدار بندی نہیں کر سکتے جو ہم انسانوں کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کوئی ہمیں توجہ دیتا ہے اور ہم سے محبت جتاتا ہے۔ نہ ہی ہم اس طمانیت اور روحانی کیف کی مقدار بندی کر سکتے ہیں جو دوسروں کا خیال کر کے اور دوسروں پر توجہ وعنایت سے ہمیں حاصل ہوتی ہے گرچہ اس خوشی وطمانیت کے شواہد ہمیں شعر و فلسفہ سے لیکر نفسیاتی و عمرانی تحقیقات تک بہ افراط ملتے ہیں۔(36)

لیکن اس کے ساتھ ساتھ، جیسا کہ ہم نے باب سوم میں دیکھا، ہم توجہ و دیکھ بھال کے بہت سے معاشی فوائد کی ماپ تول کر سکتے ہیں۔ عصبی سائنس کے میدان میں کی گئی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بچوں کو کارآمد اور تخلیقی صلاحیتوں سے متصف شہری بنانے میں اچھی نگہداشت ایک اساسی کردار ادا کرتی ہے اور یہ کہ بچوں کی غلط اور ناقص نگہداشت اور ان کو عملی زندگی میں پیش آنے والے طبی، سماجی اور پیشہ ورانہ مسائل میں بہت گہرا تعلق ہے۔(37) ان تحقیقات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نگہداشت اطفال کے معیاری پروگراموں سے بہت دور رس فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر چھوٹے بچوں کی نشوونما کے معیاری پروگراموں میں شریک بچوں نے اس طرح کی نگہداشت سے استفادہ نہ کر سکنے والے

بچوں کی نسبت عملی زندگی میں جا کر بہت زیادہ مالی آمدن کمائی۔ (38) مزید برآں وہ افراد جنھیں دوسروں سے توجہ والتفات حاصل ہوتا رہتا ہے وہ زیادہ صحت مند رہتے ہیں اور زیادہ طویل عمر پاتے ہیں جس کا نتیجہ ڈالروں کی صورت میں ہونے والی بہت بڑی بچت کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس میں وہ بچت بھی شامل ہے جو ہسپتالوں اور دواخانوں کے چکروں سے بچنے سے ہوتی ہے۔ دوا دارو پر اُٹھنے والے یہ مصارف آج کے دور میں کاروباری اداروں اور حکومتوں کے لیے ایک بہت بڑا دَردِسر ہے۔

معاشی پیمانوں کو توجہ ونگہداشت کے کام سے معاشرے کو پہنچنے والے فوائد کو وزن دینا چاہیے۔ مزید برآں ہمیں اس نوع کی خدمات کی جزا کے ایسے ٹھوس طریقے اختیار کرنا چاہییں جن سے لوگوں کے دسترخوان پر کچھ رونق ہو سکے اور انھیں سر چھپانے کو چھت میسر آ سکے۔ جب ہم نگہداشتی خدمات کی سماجی سطح پر مادی جزا کی بات کرتے ہیں تو میرے بعض مہربان یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ اس نوع کے کام کو مادی لین دین سے آلودہ نہیں کرنا چاہیے اور یہ کہ ایسا کام صرف اور صرف محبت کے طور پر کرنا چاہیے۔ بلاشبہ اس طرح کے کاموں کے پیچھے اساساً محبت کا جذبہ ہی کارفرما ہوتا ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے لیکن اس سے اس حقیقت میں فرق نہیں آتا کہ سماج ان کاموں سے بے حدوحساب فوائد حاصل کرتا ہے بلکہ اگر یہ نہ کرے تو سماج کا نظام نہیں چل سکتا۔ اس سے اس حقیقت میں بھی کوئی فرق نہیں آتا کہ ان وظائف کو سرانجام دینے والی روحوں۔۔۔ خواتین۔۔۔ کی ایک بہت بڑی تعداد مفلسی وفلاکت کا شکار ہے۔ اور تو اور امریکہ جیسے خوابوں کے جزیرے میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ معمر خواتین معمر حضرات کی نسبت تقریباً دوگنا زیادہ تنگدست ہیں۔

نہ ہی اس سے اس حقیقت کو فرق پڑتا ہے کہ نگہداشتی کام کو مناسب قدر و قیمت تفویض نہ کرنے سے اقتصادی پالیسیوں پر ایسا لقوہ طاری ہوا ہے کہ جیلوں اور جنگوں پر تو کھل کر خزانے لٹائے جاتے ہیں لیکن جب نگہداشتی معاملات کی باری آتی ہے تو حکام کی مٹھیاں بھنچنا شروع ہو جاتی ہیں۔ میں نے اس تصنیف میں جا بجا اس بات پر زور دیا ہے کہ جب تلک توجہ و نگہداشت کی باقاعدہ بے قدری کا سلسلہ بند نہیں ہوتا، متوجہ پالیسیوں کی آس لگانا عبث ہوگا۔

ہم گھروں میں سرانجام دیے جانے والے دیکھ بھال کے کام کو کئی طرح سے نواز سکتے ہیں۔ اس کی صورت مثلاً یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نگہداشتی کارکنوں کی تربیت کا اہتمام کیا جائے،

انھیں ٹیکس میں رعایتیں دی جائیں اور انھیں سوشل سیکورٹی کی سہولیات فراہم کی جائیں۔ اس کے علاوہ حکومت اور کاروباری ادارے لچک دار اوقات کار، بچوں کی نگہداشت کے لیے وظائف، سب شہریوں کے لیے علاج معالجے کی سہولت اور دیگر خاندان دوست پالیسیوں کا اہتمام کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ حضرات کو اپنے بچوں کے قریب رہنے کا موقع ملے گا اور زیادہ خواتین کو اپنے انسانی امکانات کار کی نشو ونما اور اس کے اظہار کا موقع میسر آئے گا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ملازمت سے آمدن بھی حاصل کر سکیں گی۔

نگہداشتی پیشوں میں تنخواہیں اور دیگر سہولیات بھی زیادہ ہونی چاہییں۔ بعض مہربان نگہداشت کے شعبے میں کم اجرت کا جواز یہ کہہ کر فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نگہداشت کوئی مہارت یا ہنر نہیں ہے لیکن حقیقت کی بات تو یہ ہے کہ اچھی نگہداشت کثیر علم اور مہارت کے بغیر ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر اچھے معیار کی نگہداشت اطفال کے لیے بچوں کی نشو ونما (بشمول ذہنی نشو ونما) کے مختلف مراحل کا علم مطلوب ہے اور اس بات کی سمجھ بوجھ درکار ہے کہ بچے کس عمر میں کیا سمجھنے اور کیا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسی سمجھ بوجھ ہے جو کہ بچوں کی پرورش و پرداخت کے روائتی اور تادیبی طریقوں میں عنقا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض مہربان ایسے بھی ہوں جو یہ کہیں کہ خبر گیری والے شعبوں میں کام کرنے والے افراد میں خارجی کی بجائے داخلی جذبہ ہونا چاہیے اور شاید یہ بھی ارشاد فرمادیں کہ اچھی تنخواہ اس نوع کی خدمت کا درجہ گھٹا دیتی ہے۔ لیکن جیسا کہ جولی نیلسن اور دیگر ماہرین معاشیات نے اس امر کی تصدیق کی ہے، اگر مالی اجرت کو کارکنوں کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کے طور پر دیکھا جائے تو اس سے باطنی جذبوں اور طمانیتوں کو اور بھی تقویت و جلا ملتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں جس طرح کہ مثبت رویوں کو پروان چڑھانے کے لیے دیگر انعام و کرام سے فائدہ ہوتا ہے، نگہداشتی کارکن کو معقول تنخواہ دینے سے اچھی نگہداشت پروان چڑھے گی۔ (39)

خواتین، حضرات اور معیار زندگی

یہ سب عوامل ہماری توجہ قدر پیمائی کے اس مخفی نظام کی طرف مبذول کر دیتے ہیں جس میں خواتین اور توجہ ونگہداشت کے کام جسے کہ خواتین سے منسوب کیا جاتا ہے، کی قدر گھٹا دی

جاتی ہے۔ یہ ہماری توجہ کا رخ ان تحقیقات کی طرف بھی پھیرے دیتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جنس پر مبنی نظام اقدار کو تبدیل کرنے میں ہم سب کا بھلا ہے۔

ایک عددی تحقیق جسے میں نے ماہرین معاشرتی نفسیات ڈیوڈ لوپے اور کاری لوز گارڈ کی معاونت سے مرکز برائے شراکتی تحقیقات کی زیرسرپرستی سرانجام دیا، اس خیال کو تقویت دیتی ہے۔ اس تحقیق میں جسے کہ ''خواتین' حضرات اور عالمی معیار زندگی'' میں شائع کیا گیا ہم نے بین الاقوامی اداروں کے 89 ممالک سے جمع کردہ اعداد وشمار کو استعمال میں لاتے ہوئے خواتین کے سماجی مقام کی پیائشوں کا معیار زندگی کی پیائشوں سے موازنہ کیا۔ اس سے ہمیں یہ پتہ چلا کہ خ خ پ کی نسبت کسی خاص معاشرے اور کسی خاص وقت میں خواتین کو دیے جانے والا سماجی مقام وہاں متوقع معیار زندگی کا بہتر اشارہ فراہم کرسکتا ہے۔

مثلاً کویت اور فرانس کی فی کس خ خ پ کم وبیش ایک جیسی تھی مگر ان دو ممالک میں بچوں کی شرح اموات جسے کہ عام معیار زندگی کے سب سے بنیادی پیانوں میں شمار کیا جاتا ہے، میں بہت زیادہ تفاوت تھا۔ فرانس میں بچوں کی شرح اموات 6 بچے فی ہزار ریکارڈ کی گئی جبکہ کویت میں جہاں کہ خواتین کی سماجی حیثیت فرانس کی نسبت بہت پست ہے، یہ شرح 19 بچے فی ہزار تھی جو کہ فرانس کی شرح کی دگنی سے بھی زیادہ بنتی ہے۔

ایسے ممالک جن کی خ خ پ ایک سی ہے، میں جنسی انصاف میں اختلاف کی بنا پر بنیادی معیار زندگی کے تول میں اس قدر تفاوت ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ عوام کے معیار زندگی کو اعلیٰ یا پست بنانے میں جنسی عدل بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔

زیرذکر تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ خ خ پ بھی جنسی مساوات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے مگر اس سے اس امر کا پتہ بھی چلا کہ ایک جیسی خ خ پ کے خاص معاشروں میں جنسی روابط کے اعتبار سے بہت زیادہ تفاوت بھی ہوسکتا ہے اور ان روابط کی نوعیت کا عام معیار زندگی کے اتار چڑھاؤ سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔

اس باہمی تعلق کے پیچھے بہت سے اسباب ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ ان ممالک میں جہاں خواتین کی سماجی حیثیت بہتر ہے توجہ ونگہداشت کو زیادہ قدر و قیمت دی جاتی ہے، سرانجام خواہ اسے خواتین دیں یا مرد۔ مثلاً سویڈن، ناروے اور فن لینڈ جیسے ممالک میں بچوں کی دیکھ بھال، مریضوں کی خدمت اور تدریس جیسے پیشوں کو زیادہ مقام دیا جاتا ہے۔

نگہداشت افراد اور نگہداشت ماحول فطری کو یہاں کے میزانیوں اور پالیسیوں میں بھی زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ سب عوامل مل کر تمام معاشرے کے افراد کے معیار زندگی کو بلند کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

خواتین کی سماجی حیثیت اور کسی سماج کے عمومی معیار زندگی کے درمیان اس تعلق کی تصدیق اور بہت سی تحقیقات سے بھی ہوتی ہے۔ ان تحقیقات میں اقدار اور رویوں کے وہ بین الاقوامی سروے بھی شامل ہیں جو اس بات کو جانچنے کے لیے کیے گئے ہیں کہ ان کا معاشی ترقی اور سیاسی نظام سے کیا باہمی تعلق ہوتا ہے۔(43) عالمی اقدار کے ان سروں میں 2000ء میں پہلی بار توجہ جنسی انصاف سے متعلق رویوں کی طرف مرکوز کی گئی۔ 2000ء کے اس سروے کے لیے 65 ایسے معاشروں سے اعداد وشمار جمع کیے گئے جو دنیا کی کل آبادی کے 80 فیصد حصے پر مشتمل ہیں اور اس سے یہ بات سامنے آئی کہ سیاست میں جنسی انصاف کی پاسداری اور کسی معاشرے میں سیاسی حقوق اور شہری آزادیوں کے درمیان بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ (44) اس سے اس چیز کا بھی پتہ چلا کہ اس بعد الصنعتی معیشت میں کامیابی کے لیے خواتین کی طاقت افزائی بہت اہم ہے۔

رونالڈ انگل ہارٹ، پپا نورس اور کرسٹیان وائزل ''جنسی مساوات اور جمہوریت'' میں لکھتے ہیں کہ ''ترقی یافتہ صنعتی معاشروں میں حاکمیت کا نظام روایتی درجاتی انداز سے ایک زیادہ شراکتی انداز کی طرف جا رہا ہے اور معاشرتی تعامل کے مردانہ اور زنانہ انداز کے متوازی چل رہا ہے۔(46) وہ مزید لکھتے ہیں کہ خواتین کی اعلیٰ سماجی حیثیت سے مربوط دیگر ثقافتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ قائدانہ طریق کار کی نسوانیت'' کا بھی جمہوری اداروں کے فروغ سے بہت گہرا تعلق ہے۔(47)

خواتین، حضرات اور معیار زندگی

مرکز برائے شراکتی تحقیقات نے اپنی تحقیق ''خواتین، حضرات اور عالمی معیار زندگی'' میں اس بات سے پردہ اٹھایا کہ خواتین کی سماجی حیثیت خ ق پ اور خ خ پ جیسے معیار زندگی کے روایتی معاشی پیمانوں سے بھی زیادہ بہتر پیشین گو ہے۔''

جنسی انصاف کے متغیرات کی مجموعی شرح خواندگی سے خ خ پ کے مقابلے میں

> باہمی نسبت زیادہ ہے۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان خواندگی کی وسیع خلیج کا کم عمر بچوں کی زیادہ شرح اموات سے بھی گہرا باہمی تعلق پایا گیا۔ اس میں خاص دلچسپی کی بات یہ نوٹ کی گئی کہ مانع حمل ادویہ کی آسان دستیابی کی طویل العمری اور بچوں کی شرح اموات جیسے بنیادی معیار زندگی کے پیمانوں سے خ خ پ کے مقابلے میں نسبت زیادہ ہے۔(49)
>
> اس کا یہ مطلب نہیں کہ پست خ خ پ کا بچوں کی شرح اموات، پینے کے پانی کی قلت، مناسب طبی سہولتوں کی کمی، مانع حمل ادویات کی عدم دستیابی اور کم شرح خواندگی جیسے بنیادی معیار زندگی کے پیمانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ تعلق لامحالہ ہے۔ پست خ خ پ کے حامل ممالک کے پاس ان شعبوں کو بہتر بنانے کے لیے وسائل کم ہیں۔ تاہم کسی ملک میں بلند معیار زندگی کا لازم مطلب یہ نہیں ہے کہ اس ملک کی خ خ پ بہت زیادہ ہوگی۔

(''خواتین، حضرات اور عالمی معیار زندگی'' پر مزید معلومات کے لیے دیکھیے www.partnership.org)

عالمی اقدار کا جائزہ لینے کے لیے 2000ء میں کیے گئے سروے سے معلوم ہوا کہ دنیا میں بہت سے مقامات پر بچوں کی پرورش کے حاکمانہ انداز سے ان اقدار کی جانب منتقلی عمل میں آرہی ہے جن میں بچوں کی تربیت و تدریس میں تخیل اور تحمل پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اس منتقلی کا تعلق اس عقیدے سے بھی ہے کہ آیا عورت اور مرد کو برابر ہونا چاہیے یا کہ نہیں۔ جنس اور پرورش اطفال سے متعلق رویوں میں ان تبدیلیوں کا تعلق بہتر بین الاشخاصی اعتماد، بیرونی اتھارٹی پر انحصار میں کمی، داخلی خوشحالی کے احساس میں اضافے، اعلیٰ معیار زندگی اور ان دیگر پہلوؤں سے بھی ہے جنھیں انگل ہارٹ، نورس اور وائزل ''بقا'' کی روایتی اقدار کی بجائے بعد الجدیدی ''اظہار خودی'' سے تعبیر کرتے ہیں۔(50)

یہ تحقیقات بتاتی ہیں کہ دیگر اہم ثقافتی معاملات پر توجہ دیے بغیر معاشی منہاجات کو نہ تو صحیح طرح سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان میں کوئی مؤثر تبدیلی لائی جا سکتی ہے اور ایک مرکزی ثقافتی چیز انسانیت کے مذکر اور مؤنث حصوں کے مناصب اور تعلقات کی تشکیل ہے۔ یہ تحقیقات معاشرے کو ملنے والے ان ثمرات سے پردہ اٹھاتی ہیں جو خواتین اور خواتین سے منسوب وظائف کو بہتر مقام تفویض کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ جب توجہ و نگہداشت کی

نوع بشر کے نصف ''ناقص'' سے منسوب ہونے کے طفیل بے قدری ہوتی ہے تو پالیسیوں اور روایتوں سے بھی عام طور پر توجہ واحساس کا عنصر اڑ جاتا ہے۔ اگر ہم معاصر انسانی معاشرے کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ نہ صرف بچوں، بیماروں اور معمر افراد کی دیکھ بھال کے ''نسوانی کام'' کی سرپرستی کم کی جاتی ہے، ہمارے قدرتی ماحول کی نگہداشت اور ان پالیسیوں اور روایات کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی جاتی جو بہتر معاشی و معاشرتی انصاف کی منزل کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

توجہ واحساس اگر پالیسیوں سے نکل جائے تو اس کی بہت زیادہ معاشی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ اس قیمت میں پولیس اور تھانے کچہری کے سارے نظام پر آنے والی لاگت اور کاروبار و تجارت کو پیداوایت کے زیاں کی صورت میں پہنچنے والا خسارہ بھی شامل ہے۔ یہ سب خسائر ایک طرف معیشت کو پہنچنے والا بہت بڑا خسارہ تو وہ ہے جو انسانی زندگیوں کے ضیاع کی صورت میں ہوتا ہے۔

اس معاشی دہرے معیار نے کہ جس کا ہم جائزہ لیتے آ رہے ہیں معاشی خوشحالی کے غیر حقیقی تخمینوں کو جنم دیا ہے۔ اس نے ایسے معاشی پیمانوں کو جنم دیا ہے جو توجہ ونگہداشت جیسے اہم کام سے معاشرے کو ملنے والے بے پناہ فوائد دھندلا دیتے ہیں خواہ یہ کام عورتیں سرانجام دیتی ہوں یا کہ مرد۔ ان فوائد کو سمجھے بغیر پالیسیاں بنانے والے صحیح اندازہ نہیں کر پاتے کہ معاشی طور پر کارآمد وظائف کون سے ہیں اور اس کا نتیجہ بے ڈھنگی اور بے مہر پالیسیوں اور روایتوں کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔

ہمیں یہ ثابت کرنے کے لیے کسی اعداد وشمار کی ضرورت نہیں کہ توجہ ونگہداشت سب سے زیادہ قابل قدر، اہم اور ضروری انسانی وظیفہ ہے۔ اس کے بغیر ہماری موت ہے اور اس کے ساتھ ہماری بقا اور نشوونما ہے لیکن اگر ارباب اختیار ماپ تول کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں تو توجہ ونگہداشت کے ثمرات کو اعداد وشمار میں جمع کرنا ضروری ہوگا۔

توجہ ونگہداشت کو موزوں قدر و قیمت تفویض کرنے سے ہماری دنیا کے تمام مسائل حل نہیں ہو جائیں گے مگر اس سے انسانی خوشی وطمانیت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگا اور یہ اقدام ایک زیادہ خوشحال، پرعدل اور مستحکم مستقبل کے لیے بہت ضروری ہے۔

MashalBooks.com

Page No. 125

پہلا پروف۔ فائل چیک ہو چکی ہے۔حافظ محمد ناصر رشید۔24 دسمبر 2008ء
دوسرا پروف۔ فائل چیک ہو چکی ہے۔عاصم۔21 جنوری 2009ء

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

باب پنجم

نقطوں کا اتصال

تین اندھوں اور ہاتھی والی قدیم حکایت شاید آپ نے بھی سن رکھی ہو۔ ان تینوں نے باری باری ہاتھی کے جسم کو ہاتھ سے چھوکر ہاتھی کی ہیئت کا اندازہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک کا ہاتھ ہاتھی کی سونڈ پر لگا تو وہ کہنے لگا کہ یہ جانور سانپ کی طرح کا ہے۔ دوسرا اس کی ٹانگ پکڑ کر بولا کہ یہ درخت جیسا ہے اور تیسرے اندھے کے ہاتھ ہاتھی کی دم آئی اور وہ بولا کہ یہ تو رسے کی مانند ہے۔ یہ واقعہ سچا ہے یا نہیں لیکن یہ معاشی و معاشرتی تبدیلیوں کی راہ میں حائل دیوار کی نشاندہی ضرور کرتا ہے۔

آج کے دور میں ہزاروں ماہرین اور سیانے اپنے اپنے طور پر اور اپنے اپنے زاویے سے آج کے معاشی و معاشرتی اور ماحولیاتی مسائل کے تجزیات میں سرگرداں ہیں لیکن ان کا اس بات پر اتفاق نہیں ہو پاتا کہ ان مسائل کے پیچھے اصل محرکات کیا ہیں۔ جس طرح پورے ہاتھی کا مشاہدہ کیے بغیر اس کے محض ایک عضو یا جزو سے ہاتھی کو نہیں سمجھا جا سکتا، ہمارے عالمی مسائل کے پیچھے کارفرما اسباب کو بھی اس وقت تک سمجھنا ممکن نہیں جب تک کہ ہم پورے نظام کا جائزہ نہیں لے لیتے۔

جیسا کہ باب دوم میں بات ہو چکی ہے، ہم معاشی نظاموں کو صرف معاشیات پر توجہ مرتکز کر کے تبدیل نہیں کر سکتے۔ معاشی نظام ان پر حاوی و محیط معاشرتی نظام کے چھوٹے اعضاء کی طرح ہوتے ہیں۔ بیمار اور فرسودہ معاشی پالیسیوں اور وتیروں میں کوئی مؤثر تبدیلی عمل میں لانے کے لیے ہمیں ان کے وسیع تر معاشرتی سیاق وسباق کو سمجھنا ہوگا۔

معاشرتی حرکیات کا شراکت/تسلط کے تجزیاتی عدسے سے جائزہ لینے سے ہمیں نقطوں کے اتصال میں مدد مل سکتی ہے۔ یہ عمل اس چیز کو دیکھنا ممکن بناتا ہے جسے سائنس دان نظام کی ''خود تنظیمی'' کہتے ہیں۔ کسی نظام کے مرکزی اجزاء کے مابین وہ تعاملات جو اس کے اساسی وصف کو برقرار رکھتے ہیں۔ باب ہذا میں انھی معاملات کی بات کی گئی ہے۔ اس میں شراکتی نظام اور تسلطی نظام کے متضاد سانچوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان معاشروں کی حقیقی مثالیں پیش کی گئی ہیں جو خط شراکت/تسلط کے کسی ایک سرے کی جانب سرکتے دکھائی دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں اس نکتے پر بھی بات کی گئی ہے کہ یہ نظام معاشیات پر کیا اور کیسے اثرات مرتب کرتے ہیں۔

جدید معاشی و معاشرتی ڈھانچہ

میں نے اس وقت کے یورپ میں آنکھ کھولی جب تسلطی نظام کی طرف ایک بہت بڑی مراجعت رونما ہو رہی تھی۔ میری مراد نازیوں کے عروج سے ہے، جنھوں نے پہلے جرمنی میں قدم جمائے اور پھر میرے وطن آسٹریا پر آ مسلط ہوئے۔ میں اتنی چھوٹی تھی کہ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن جب نازیوں نے آسٹریا پر قبضہ کیا تو میری زندگی یکسر بدل کر رہ گئی۔ ہر وقت کا خوف ہمارے ہمرکاب ہو گیا۔ 10 نومبر 1938ء کی شب یعنی شب شیشہ میں ...... شب شیشہ اسے اس لیے کہتے ہیں کہ اس شب یہودیوں کے گھروں، دکانوں اور عبادت خانوں کے سب شیشے چکنا چور ہو گئے تھے ...... نازیوں کا ایک جتھا ہمارے گھر گھسا اور میرے والد کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گیا۔ پتہ نہیں کیا معجزہ ہوا کہ میری والدہ انھیں نازیوں کے چنگل سے رہا کرانے میں کامیاب ہو گئی اور پھر ہم بغیر پیچھے دیکھے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اگر نہ بھاگتے تو ہم بھی بقیہ 60 لاکھ یورپی یہودیوں کی طرح رگڑے جاتے اور ہمارے ساتھ بھی وہی ہوتا جو میرے دادا، دادی اور میرے قریب کے کئی دوسرے ان عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ ہوا جن کی ہلاکتوں کی روح فرسا خبریں مجھے جنگ عظیم دوم کے خاتمے کے بعد موصول ہوئیں۔

بچپن کے ان اندوہناک تجربات نے میرے قلب و ذہن پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے اور انھی تجربات نے میرے اندر یہ جاننے کی جستجو کو جنم دیا کہ ایسے حوادث کیونکر رونما ہوتے

MashalBooks.com

ہیں اور ہم انھیں دوبارہ رونما ہونے سے روکنے کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ پھر اس جستجو نے ایک وفادار سہیلی کی مانند ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ سفر کیا۔ ان تجربات نے مجھے اس کثیر الجہتی اور کثیر الثقافتی تاریخی تحقیق پر مائل کیا جو آگے چل کر شراکتی اور تسلطی نظام کے نئے عمرانی زمروں کی دریافت پر منتج ہوئی۔

سرمایہ دارانہ بمقابلہ اشتراکی، مغربی بمقابلہ مشرقی، صنعتی بمقابلہ قبل الصنعتی یا بعد الصنعتی جیسے زمرے ان وقتوں کی پیداوار تھے جب اس دہرے معیار کو کہ جس کا ہم جائزہ لیتے چلے آ رہے ہیں۔ لوگوں میں عمومی طور پر مقبولیت حاصل تھی۔ نتیجۂ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ جنس پر مبنی مناصب اور روابط کی تشکیل پورے سماجی نظام کو کیسے متاثر کرتی ہے؟ صرف یہی نہیں یہ زمرے تو ابتدائی عمر کے تعلقات کو بھی کسی شمار میں نہیں لاتے۔ اگرچہ یہ تعلقات اس بات پر بہت گہرا اثر ڈالتے ہیں کہ لوگ مل کر کس نوع کے معاشرے پروان چڑھاتے ہیں۔ 2

اس کے برعکس شراکتی نظام اور تسلطی نظام کے زمرے پوری انسانیت کو پیش نظر رکھتے ہیں ...... مذکر نصف کو بھی اور مؤنث نصف کو بھی اور ہماری پوری زندگیوں کو بھی بیرونی حلقے کو بھی جسے ماضی قریب میں ''مردوں کی دنیا'' کہا جاتا تھا اور نجی گھریلو حلقے کو بھی جس میں روایت بچوں اور عورتوں کو مقید رکھا جاتا تھا۔

اس بڑی تصویر کا مشاہدہ ان نقوش کو دیکھنا ممکن بناتا ہے جنھیں اس سے قبل تک شناخت نہیں کیا گیا تھا۔ یہی نقوش شراکتی نظام اور تسلطی نظام کی صورت گری کرتے ہیں اور یہ اس وقت دکھائی نہیں دیتے جب تک کہ ہم ان مناصب و روابط کی پوری سرگم ملاحظہ نہ کر لیں کہ جن پر انسانی معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

کوئی سماج کس درجے تک ان میں سے کسی ایک نظام کی طرف جھکاؤ اختیار کرتا ہے، یہ اس بات پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے کہ ہمارے کون سے انسانی خصائل و اطوار کو جلا ملتی ہے اور کون سے دبا دیے جاتے ہیں۔ شراکتی نظام ہماری آگہی کی صلاحیتوں کو جلا بخشتا ہے۔ تسلطی نظام ان صلاحیتوں کو نمو پانے سے روکتا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ نظام بے حسی، ظلم و جور اور تخریبی ذہنیت کو نشوونما دیتا ہے۔ انسان میں ان تمام خصائل و شمائل کے لیے حیاتیاتی صلاحیتیں موجود ہیں۔ مختلف افراد مختلف نوع کے خصائل و میلانات وراثت میں لے کر اس دنیا میں آتے ہیں مگر نفسیات اور عصبیات جیسے علوم ہمیں بتاتے ہیں کہ انسان کو زندگی میں پیش

آنے والے تجربات خصوصاً ابتدائی عمر کے روابط اس کی شخصیت کی تشکیل وتعین میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں اور اس چیز کا فیصلہ کرتے ہیں کہ میلانات و رجحانات دب جائیں گے یا کہ ان کا اظہار ہوگا اور علم بشریات اور علم عمرانیات ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ کسی معاشرے کی ثقافت ہی ہوتی ہے جو ان تجربات اور تعلقات کی صورت گری کرتی ہے۔

یہ امر کہ کسی ثقافت یا ذیلی ثقافت کا شراکتی نظام یا تسلطی نظام کی طرف کس قدر جھکاؤ ہے۔ مختلف تجربات کو جنم دیتا ہے اور مختلف قسم کے تعلقات کو فروغ دیتا ہے۔ تسلطی نظام کی ترکیب تسلط کی درجہ بندی پر مبنی تعلقات کو تقویت دیتی ہے۔ جنھیں خوف اور طاقت کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ شراکتی نظام کی ترکیب باہمی احترام، جوابدہی اور منفعت پر مبنی تعلقات کو فروغ دیتی ہے۔ لہٰذا شراکتی نظام اور تسلطی نظام کی تراکیب کی تفہیم اس رویے میں مثبت تبدیلیاں عمل میں لانے کی طرف ایک اہم قدم ہے جس سے ہم خود سے، دوسروں سے مادر ارض سے پیش آتے ہیں۔

تسلطی ترکیب:

بیسویں صدی کے انتہائی سفاک، متشدد اور جابر معاشروں میں ہٹلر کا جرمن (بلحاظ حرفت بہت آگے، مغربی، دائیں بازو کا معاشرہ)، اسٹالن کا سوویت یونین (لادین، بائیں بازو کا معاشرہ)، خمینی کا ایران اور طالبان کا افغانستان (مشرق کے مذہبی معاشرے) اور عیدی امین کا یوگنڈا (ایک قبائلی معاشرہ) شامل ہیں۔ ان میں بعض بہت واضح فرق موجود تھے لیکن ایک بات ان سب میں مشترک تھی اور وہ یہ کہ ان سب کا جھکاؤ تسلطی نظام کی طرف رہا اور ان میں ایسے آمرانہ معاشی ادارے اور دساتیر مروج رہے کہ جو متوجہ کی بجائے غیر متوجہ اقدار پر استوار کیے گئے تھے۔

تسلطی ترکیب کا پہلا مرکزی جزو مراتب صعودی کا وہ ڈھانچہ ہے جسے نفسیاتی، جسمانی اور معاشی کنٹرول سے برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ تحکمانہ ڈھانچہ گھر اور ریاست یا قبیلے دونوں میں موجود پایا جاتا ہے اور یہ تمام سماجی اداروں کے لیے ایک ماڈل کا کام کرتا ہے۔

دوسرا مرکزی جزو شدید درجے کا جبر اور ظلم و جور ہے جو بیوی بچوں کی مار پیٹ سے لے

کر جنگ و جدال تک میں اظہار پاتا ہے۔ تھوڑا بہت جبر اور تشدد تو خیر ہر معاشرے میں ملے گا لیکن تسلطی نظام میں جبر و تشدد ایک باقاعدہ اور منظّم ریت کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور تسلطی درجہ بندیوں کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔

تسلطی نظام کا تیسرا اہم جز و نصف نوع بشر کا اس کے دوسرے نصف پر تفوق ہے؟ جب جرمنی میں ہٹلر برسر اقتدار آیا تو نازیوں نے یہ نعرہ بلند کیا کہ ''ہم عورتوں کو ان کے روایتی مقام پر واپس بھیج دیں گے۔'' ایران میں آیت اللہ خمینی اور افغانستان میں طالبان نے بھی اس طرح کی صدائیں بلند کیں۔ سٹالن کی پالیسیوں میں بھی مرد و زن کی مساوات کے ابتدائی نظریے سے انحراف نظر آنے لگا۔ عیدی امین کے یوگنڈا میں خواتین اس قدر پیچھے چلی گئیں کہ 1980ء کی دہائی میں بھی یوگنڈا کے دیہی علاقوں میں عورتوں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ گھٹنوں کے بل جھک کر مرد سے بات کریں۔

اعلیٰ/ادنیٰ کے ہمارے اس تصور کو بے عدل، جابر اور متشدد معاشروں کی ریڑھ کی ہڈی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ تصور بچوں کو یہ ذہن نشین کراتا ہے کہ وہ تمام طرح کے امتیازات و تفریقات کو...... خواہ ان کی بنیاد نسل پر ہو یا قوم پر ہو یا مذہب پر...... برتری اور کمتری کے تناظر میں دیکھیں۔

درجاتی تصور ایک کج مدار نظام اقدار میں مترشح ہوتا ہے۔ مرد کے عورت پر تفوق کے ہمراہ اوصاف و خصائل کی دیگر درجہ بندیاں بھی چلی آتی ہیں جنھیں ''قوی'' یا مردانہ اور ''نازک'' یا نسوانی کے زمروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ جنگ و جدال، تشدد و فساد اور جبر و تسخیر کے ''مردانہ'' افعال کو توجہ و نگہداشت اور امن و صلح جوئی کی نسبت زیادہ قدر و وقعت دے دی جاتی ہے۔ ان ''زنانہ'' اقدار و وظائف کو خواتین اور ''زنانے'' مردوں کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے اور ان کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا جاتا ہے۔

یہ سب تسلطی نظام کے اگلے یعنی چوتھے اہم رکن کی راہ ہموار کرتا ہے یعنی ان حکایات و اعتقادات کی راہ جو جبر و تسلط کو ناگزیر اور اخلاقی قرار دے کر ان کا جواز مہیا کرتے ہیں۔ جبری معاشروں اور ثقافتوں میں ان عقیدوں کا پرچار کیا جاتا ہے کہ سرحدوں کے پار بسنے والے قبائل اور اقوام کے افراد کو مارنا، عورتوں کو سنگسار کرنا، اپنے سے ''کمتر'' لوگوں کو غلام بنانا اور اپنی مرضی مسلط کرنے کے لیے بچوں کو مارنا پیٹنا جائز ہے اور غیرت و اخلاقیات کے تقاضوں

MashalBooks.com

کے عین مطابق ہے۔ جنگ و جدال کو تقدس کا رنگ دے دیا جاتا ہے اور یہ محض مذہبی تسلطی معاشروں کا ہی خاصہ نہیں بلکہ مطالعے پر آپ کو یہ خاصہ لادین تسلطی سماجوں میں بھی نظر آئے گا۔ نازی غنڈوں کے لیے دشمنوں کو چن چن کر اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر موت کے گھاٹ اتارنا ایک مقدس مشن کے مترادف تھا جس طرح کہ آج کے دور میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے فسادی اپنے قتل و غارت کا جواز پیدا کرنے کے لیے خدا کا نام استعمال کرتے ہیں۔

القصہ یہی وہ چار مرکزی ارکان ہیں جو تسلطی نظام کے معاشی و معاشرتی اداروں کی بنیاد بنتے ہیں اور جن کا لب لباب مرقوم الذیل ہے:

(الف) سخت درجہ بندیوں پر مبنی سماجی ڈھانچہ

(ب) جبر و تشدد کی زیادتی

(ج) نر۔اعلیٰ/ مادہ۔ادنیٰ کا تصور

(د) جبر و تسلط کو ضروری اور اخلاقی قرار دے کر اس کا جواز پیدا کرنے والے اعتقادات

تسلط اور معاشیات:

تسلطی معاشیات ''اعلیٰ'' کے ''ادنیٰ'' پر تفوق پر مبنی ہے۔ اس معاشی نظام کے اصول، پالیسیاں اور وتیرے اوپر والوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور ان میں زیریں طبقات کو شاذ ہی درخور اعتنا سمجھا جاتا ہے یا قطعاً سمجھا ہی نہیں جاتا اور ان کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ''قدرتاً'' نیچ ہیں یا پھر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ زیادہ محنت نہ کرنے کے سبب انھیں جو تھوڑا بہت مل رہا ہے وہ اسی کے ہی مستحق ہیں۔

تسلطی نظام کے تطابق میں ڈھلے معاشی ادارے معاشی طاقت کو اربابِ اقتدار کے ہاتھوں میں مرتکز کر کے مراتب صعودی کو قائم رکھتے ہیں۔ ان اداروں کی تشکیل و تطویل نہ صرف خالصتاً معاشی اصول و قوانین سے بلکہ اصول و قوانین اور عادات و اعتقادات کے وسیع تر سماجی نظام سے عمل میں آتی ہے۔

فطرت انسانی......حقائق اور حکایات:

تسلطی ماحول کے طفیل انسانی ذہن جو اثرات قبول کرتا ہے اس نے فطرت انسانی کے

> بارے میں ہماری تصویر کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ فرائڈ نے اپنے ایڈیپس الجھاؤ کے نظریے سے مردانہ تسلط کی نفسیات کی بڑی اچھی تصریح کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ غلبے کی اس بے انت جہد میں ہر پسر اندر سے اپنے باپ کو قتل کرنے اور اس کی جگہ لینے کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس نظریے کو فرائڈ کے زمانے کی کڑی تسلطی ثقافت کی بجائے مردانہ ذہنیت کی وضاحت کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے۔ عورتوں سے متعلق فرائڈ کے ''رشک آلت'' کے نظریے کو بھی نسوانی ذہنیت کی تصریح کے طور پر قبول کیا گیا ہے جس سے اس حقیقت پر بھی ابہام کا لبادہ چڑھ گیا ہے کہ کسی تسلطی نظام کی پروردہ عورت کسی مردانہ عضو کے نہیں بلکہ مردانہ تفوق اور تمکنت و اختیار کے رشک میں مبتلا ہوتی ہے۔ اگرچہ فرائڈ کے ان نظریات کی وہ پہلے سی وقعت نہیں رہی، متعدد تسلطی عقیدے اور ادارے دنیا میں اب بھی جاری و ساری ہیں۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان عقیدوں کا قلع قمع کریں اور ان اداروں میں تبدیلیاں عمل میں لائیں۔

خاندان، تعلیم، مذہب اور حکومت جیسے تمام ادارے کسی معاشرے کے بنیادی سبھاؤ کو برقرار رکھنے کے لیے اس کے معاشی اداروں سے مسلسل تعامل کرتے رہتے ہیں اور جیسا کہ میں نے پہلے بات کی کم سنی اور بین الجنسیاتی تعلقات کی ثقافت اقدار و روایات خاص اہمیت کی حامل ہوتی ہیں کیونکہ یہ روابط ہی انسان کو سب سے پہلے یہ سکھلاتے ہیں کہ کون سے تعلقات، سماجی ڈھانچے اور رویے عادی اور پسندیدہ تصور کیے جاتے ہیں۔

''مردانہ کام'' اور ''زنانہ کام'' کے لیے دہرے معیار سے رسنے والی تسلطی معاشیات خواتین اور قدرت دونوں کے ممد حیات وظائف کی بے قدری و استحصال پر انحصار کرتی ہے۔ اگرچہ اس دہرے معیار سے مردوں کو کچھ فوائد ضرور حاصل ہوتے ہیں مگر ان سے حاصل ہونے والے نقصانات ان سب فوائد کو برابر کر دیتے ہیں۔ مردوں کو تسلطی نظام سے پہنچنے والے نقصانات کی فہرست بہت طویل ہے۔ زیادہ تر یہ مرد ہی ہوتے ہیں جو لڑائیوں اور جنگوں میں گھاؤ کھاتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔ جہاں رہی بات جبر و استبداد کی تو زور والوں کے ہاتھوں مردوں کو بھی کوئی کم جبر و استبداد برداشت نہیں کرنا پڑتا۔

جب بچوں کو یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ نوع بشر کے نصف حصے کو خادموں کے طور پر زمین پر اتارا گیا ہے اور نصف کو مخدوموں کے طور پر تو ان کے اذہان میں معاشی بے

انصافی کا عنکبوت جڑ پکڑنے لگتا ہے جس کا اطلاق وہ بعد ازاں دیگر روابط پر بھی کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ تمام ''ادنیٰ'' خارج از گروہ کی ''اعلیٰ'' داخل در گروہ کے ہاتھوں محکومیت و استحصال کو جائز سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔

مرد کے عورت پر تفوق اور غیر منصفانہ معاشی نظام کا ایک دوسرے کی قوت افزائی کرنے والا باہمی تعلق جاگیرداری اور بادشاہت کے وقتوں میں بہت عریاں تھا۔ سخت مردانہ تسلط کے ان ایام میں سلاطین، شہنشاہ اور امراء تو عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے مگر ان ''اعلیٰ'' شخصیات کے دسترخوان سجانے والے اور ان کی تجوریوں کو زر و جواہر سے بھرنے والے مردوں اور خواتین کو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے دو وقت کی روٹی بھی بمشکل جڑتی تھی۔

ہمیں یہ ربط و ارتباط مؤخراً ان ایام میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے جب انسانی معاشرے مین خواتین کی کمتری کے عقائد نے دوبارہ نمودار ہونا شروع کیا۔ یہ عین اس نوع کے ایام ہیں جب بڑوں اور چھوٹوں کے درمیان کی معاشی خلیج کا پاٹ بہت وسیع ہو چلا تھا۔ مثلاً اوائل کی صنعتی سرمایہ داریت کے ''قزاق ٹھاکر'' ایام میں جب مزدوروں اور محنت کشوں کا بڑی بے رحمی سے استحصال کیا جاتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب معاشرتی ارتقائیت کے پجاری حقوق نسواں کے لیے جدوجہد کرنے والوں کا یہ دلیل دے کر ناطقہ بند کر دیتے تھے کہ جناب عورت تو فطری طور پر ہی مرد سے کمتر ہے۔ عصر حاضر کو ہی دیکھ لیں۔ اس میں جہاں معاشرتی حیاتیات کے ماہرین نر کی مادہ پر فوقیت کو ایک ارتقائی ضرورت قرار دے رہے ہیں وہاں معاشی تفریق و تفاوتات بھی شدید سے شدید تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک طرف تو بڑی کمپنیوں کے وہ اعلیٰ افسر ہیں جو پہلی کو نوٹوں کے تھیلے بھر کر گھر لاتے ہیں اور دوسری طرف وہ بے کس اور بے نوا ہیں جنھیں پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے دو وقت کا کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا۔

میں اس بات کا ایک مرتبہ پھر اعادہ کرنا چاہوں گی کہ معاشی ناانصافی فقط بے ضابطہ سرمایہ داریت کا ہی خاصہ نہیں بلکہ درحقیقت اسے تسلطی معاشیات کا خاصہ کہنا چاہیے۔ سرمایہ داریت تو سرمایہ داریت، اشتراکیت بھی کیا ہے؟ سابق سوویت یونین کی اشتراکی انتظامیہ کے لچھن اب کس سے پوشیدہ رہے ہیں۔ اس اشتراکی حکومت کے زیر سایہ ارباب اختیار کو تو کھانے کو کھابے ملتے تھے اور رہنے کو صاف ستھرے علاقوں میں پرتعیش ایوان میسر تھے۔ مگر عام لوگوں کی حالت کیا تھی؟ ان بے چاروں کو تنگ و غلیظ فلیٹوں میں زندگی کے دن پورے کرنا

پڑے تھے اور خواتین کو دال روٹی کی خرید کے لیے گھنٹوں لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے رہنا پڑتا تھا۔

تسلطی معاشیات کا ایک اور خاصہ رشوت و بدعنوانی ہے۔ اکثر سننے کو ملتا ہے کہ طاقت و اقتدار انسان کو بدعنوانی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اگر یہ ضروری نہیں تو ہم کم از کم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں خصوصاً نیچے والوں کا خیال کیے بغیر اپنے لیے یا اپنے گروہ کے لیے فائدہ اٹھانے کے معانی میں بدعنوانی کا تسلطی نظام سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کاروباری اور حکومتی اداروں میں بددیانتی کی روایات بہت قدیم سے چلی آتی ہیں اور یہ فقط شراکتی نظام میں ہے کہ جس کی طرف پیش رفت سے کاروباری اور حکومتی ''شفافیت'' جیسے تصورات نے قدم جمانا شروع کیے ہیں۔(8)

تسلطی معاشروں میں ادنیٰ سے ادنیٰ مقامی ملازم سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ انتظامی عہدے دار تک حکومت کی ہر سطح پر رشوت کو ایک معمول سمجھ کر قبول کیا جاتا ہے۔ امریکہ جیسے ملک میں بھی بڑے سرمایہ دار سیاسی جماعتوں اور ان کے قائدین کو بڑی بڑی رقوم بطور چندہ دیتے ہیں اور پھر اپنے قلم سے ایسی قانون سازی کرتے ہیں کہ جس سے انھیں اور ان کے اداروں کو تو نفع ملے اور ٹیکس دہندہ عام شہریوں کو خسارہ پہنچے۔ یہاں اب یہ بھی عام چلن ہو گیا ہے کہ بڑی بڑی ادویہ ساز کمپنیاں اور دیگر کارپوریشنیں سائنسی تحقیقات و مطالعات پر مال لگاتی ہیں اور پھر اپنے مفادات کے لیے ان تحقیقات و مطالعات کے نتائج پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ ایران میں کیا ہوا تھا؟ ورلڈ کام اور ٹائیکو میں کیا ہوا تھا؟ اس طرح کے کاروباری اداروں کے اعلیٰ عہدیداران کمپنیوں کے حساب میں ہیرا پھیری کر کے اپنے کھیسے تو بھرتے چلے جاتے ہیں اور چھوٹے ملازمین اور حصص میں پیسہ لگانے والے منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یہ سب میں نہیں مانتی کہ ''فطرت انسانی'' میں کسی خلقی نقص کا شاخسانہ ہے۔ لیکن یہ تجارت وحکومت کے تالاب میں چند ''گندی مچھلیوں'' کے سبب بھی نہیں۔ اصل میں یہ بدعنوانی کی ان روایات کی تہہ میں موجود ہے جو اس تسلطی نظام میں خلقی طور پر پائی جاتی ہیں جس میں احساس و ہمدردی پر جان بوجھ کر قدغن لگا دی جاتی ہیں۔

تسلطی معاسیات ان طریقوں سے اور بعض دوسرے ذرائع سے منڈی کے عمل میں دخل انداز ہوتی ہے۔ بجائے طلب و رسد کے درمیان ثالث کا کردار ادا کرنے کے، کسی معاشرے

کا جھکاؤ جس قدر تسلطی نظام کی ہوتا ہے، یہ منڈیاں اسی قدر کجی کا شکار ہوتی چلی جاتی ہیں جس سے اوپر والوں کو فائدہ ہوتا ہے اور نچلے طبقات سے متعلق افراد کو خسارہ پہنچتا ہے۔

دوسروں سے ان کی املاک ہتھیا لینا تسلطی معاشرے کا ایک اور بنیادی وتیرہ ہے۔ سٹالن نے اپنے عہد حکومت میں ناحق قتل کیے جانے والے لاکھوں چھوٹے کاشتکاروں کی جائیدادوں پر قبضہ کیا۔ خمینی حضور نے بھی لاتعداد کردوں اور بہائیوں کی املاک قرق کیں۔ اس کی بنیاد پرست حکومت کے دوران ان اقلیتی حلقوں کے افراد کو اس قدر وحشت زدہ کیا گیا کہ انھیں بھاگنا پڑا اور جو نہیں بھاگ پائے، ان کو دین واخلاق کے نام پر قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح کے ایک اور ناپسندیدہ اقلیتی گروہ یعنی قوم یہود کے ضبط شدہ اثاثہ جات کو نازی عہد میں جرمنی کی اقتصادی بحالی کے لیے استعمال کیا گیا۔ نازی حکمرانوں نے یہودی خاندانوں کے گھروں، دفتروں، کمپنیوں اور کھاتوں پر زبردستی قبضہ کیا...... اور ان میں میرے والدین کی املاک بھی تھیں۔ قانون کی آڑ میں کی گئی ان مسلح ڈکیتیوں سے حاصل ہونے والے مال غنیمت سے نازی جماعت کے اراکین کو انعام واکرام دیے جاتے تھے اور یہودی خواتین، مردوں اور بچوں کو اکٹھا کر کے عقوبت خانوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے لیے بند کر دیا جاتا تھا یا پھر میرے اور میرے والدین جیسے افراد کو اپنے وطن سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔

☆ آزاد منڈیاں ......حقائق وحکایات:

نوکلاسیکی اقتصادی نظریے کا ایک اصول یہ ہے کہ جب منڈیوں کو سرکاری کنٹرول سے آزاد کر دیا جاتا ہے تو وہ طلب و رسد کے توسط معاشرے کے وسائل کی خود بخود ہی قرار واقعی طریقے سے تخصیص کرنے لگتی ہیں۔ اس نوع کے نظریات کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ''آزاد منڈی'' کا منتر سرکاری ضوابط کے خلاف ایک نعرے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

لیکن اصلیت یہ ہے کہ تسلطی نظام کے تحت منڈیاں آزاد اور غیر جانبدار ہو ہی نہیں سکتیں۔ بجائے طلب و رسد کے توسط مناسب قیمتوں اور اجرتوں کو یقینی بنانے کو منڈیوں کا درج ذیل عوامل کی وساطت مسخ کر دیا جاتا ہے۔

(ا) گمراہ کن تشہیری مہمات

(ب) کارکنوں کو کارگاہ میں خراب اور غیر معیاری ماحول کی فراہمی

(ج) مزدوروں کے سودابازی کے اختیار میں مداخلت

(د) صارف کے تحفظ کا فقدان اور ایسی حکومتی پالیسیاں جو امیر اور طاقت ور افراد کو مکمل ڈھیل دے دیتی ہیں کہ وہ جو چاہیں کریں۔

تسلطی نظام ہائے معیشت میں اجارہ داریوں کو پنپنے کا موقع ملتا ہے اور چھوٹے مدمقابل بوریا بستر گول کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دوم ایسے نظام مصنوعی قلتیں اور مصنوعی ضرورتیں پیدا کرتے ہیں اور سونے پر سہاگہ توجہ ونگہداشت اور ''نازک'' اور ''نسوانی'' خیال کی جانے والی دیگر اشیاء کی بے وقری کر کے پھیرا جاتا ہے۔

الغرض کوئی سماج جس قدر تسلطی نظام کی طرف جائے گا اس کی منڈیوں پر طاقتور افراد کا اختیار اسی قدر بڑھتا چلا جائے گا، خواہ نجی ذرائع سے یا حکومتی ذرائع سے۔ سچ پوچھیں تو تسلطی نظام میں ارباب اختیار بیشتر اوقات آزادی کو اپنے اختیار و طاقت کو بغیر کسی جوابدہی کے عمل میں لانے کے لیے ایک کوڈ ورڈ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

یہ سب کچھ نسلی تطہیر، رضائے خداوندی، نجی ملکیت سے پیدا ہونے والی برائیوں کے خلاف جدوجہد اور بے حسی، درندگی اور حرص کا جواز مہیا کرنے والے دیگر نعروں کی آڑ لے کر کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ نعرے صرف اس بنیادی حقیقت کو لوگوں کی نظروں سے اوجھل کرنے کے لیے لگائے جاتے ہیں کہ دوسروں کو نقصان پہنچانا اور دوسروں پر جبر کرنا ایک غیر انسانی اور غیر اخلاقی عمل ہے۔

دراصل تسلطی نظام خود کو انکار کے بل پر برقرار رکھتا ہے۔ یہ انسان کے شعور میں انقباض پیدا کر کے اس کے لیے اس مضرت کو دیکھنا مشکل بنا دیتا ہے جو وہ دوسروں کو پہنچاتا ہے بلکہ خود کو بھی۔ شعور کی یہ کمی داخل در گروہ بمقابلہ خارج از گروہ کی درجہ بندیوں کے نفاذ واستقرار کے لیے ایک لازمے کی حیثیت رکھتی ہے۔

وہ معاشرے جن میں تسلطی رنگ اس قدر گہرا نہیں ہوتا جتنا کہ ان معاشرں میں کہ جن کی بات ہم مرقومہ بالا سطور میں کر رہے تھے، ان میں بھی اسی طرح کی کچھ حرکیات ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ گو نسبتاً کم عریاں اور سفاک صورت۔ میں گذشتہ کچھ عشروں سے امریکہ اسی پرانے تسلطی ڈھانچے کی طرف مراجعت کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کا مظہر اولاً تو معاشی قوت کا بالائی طبقے میں دوبارہ ارتکاز ہے۔ پھر یہ کہ ہمیں ایک بار پھر پدر سالاری خاندان کی طرف

واپس لے جانے کی کوششیں ہو رہی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ خارجی تعلقات میں تشدد میں بھی اضافہ مشاہدے میں آ رہا ہے۔ ان عوامل سے اس سے قبل مروج معاشی تحفظ کی پالیسیوں سے پسپائی عمل میں آ رہی ہے اور اس نوع کی پالیسیاں، اصول اور وتیرے رواج پاتے نظر آ رہے ہیں جو داخل در گروہ طاقتور افراد کو فائدہ پہنچا رہے ہیں اور خارج از گروہ بے کس افراد کی طرف بہت کم توجہ دی جا رہی ہے بلکہ دی ہی نہیں جا رہی۔ اگر چہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ امریکی حکمران طبقے کے افراد نے اپنے قریبی لوگوں کو نوازنے کے لیے براہِ راست خارج از گروہ ''حقیر'' لوگوں کی جائیدادیں ضبط کی ہیں لیکن اگر دیکھا جائے تو انھوں نے اس سے کچھ کم بھی نہیں کیا۔ کیا یہ غلط ہے کہ محصولات سے آنے والی آمدن سے زیادہ تر بالائی طبقہ ہی فیض یاب ہو رہا ہے اور سرکاری ٹھیکے صرف ان منظور نظر کاروباری اداروں کو تفویض کیے جاتے ہیں جن کی کارکردگی کو تسلی بخش قرار نہیں دیا جا سکتا اور جو ان ٹھیکوں کے مستحق نہیں ہوتے اور کیا یہ بات صحیح نہیں کہ حکومت ان سماجی پروگراموں سے ہاتھ کھینچ رہی ہے جن سے غرباء و مساکین کو بنیادی ضروریات زندگی مہیا ہوتی ہیں۔ ہم نے اس رجعتی عہد میں دیکھا کہ نادار بچوں اور گھرانوں کو امداد کے لیے دی جانے والی رقوم میں کٹوتی کی گئی۔ ٹیکسوں سے حاصل ہونے والی آمدن کو بڑی کارپوریشنوں اور سیاسی جماعتوں کو بطور چندہ رقوم فراہم کرنے والے افراد کو نوازنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ انھیں بغیر کسی بولی کے ٹھیکے دیے گئے، ٹیکس میں رعایت دی گئی اور ان کے ساتھ ماحول اور صارف کو تحفظ فراہم کرنے والے قوانین کے سلسلے میں رعایت برتی گئی۔ (9)

ان شواہد کو محض اتفاقیہ حوادث قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انھیں تسلطی وتیروں کا ہی شاخسانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جس کا جھکاؤ بنیادی طور پر تسلطی نظام کی طرف ہوتا ہے، عادلانہ معاشی پالیسیوں کا تصور کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ایک متوجہ اور پائیدار معاشی نظام اس صورت میں ہی پنپ سکتا ہے کہ جب معاشرہ خط معیشت کے شراکتی سرے کی طرف رخ اختیار کر لے۔

شراکتی ترکیب:

وہ معاشرہ جس کا رخ خط تسلط/شراکت کے شراکتی سرے کی طرف ہوتا ہے وہ مذہبی یا

غیر مذہبی، مشرقی یا مغربی، صنعتی، قبل الصنعتی یا بعد الصنعتی جیسے روایتی زمروں سے بھی آزاد ہو جاتا ہے۔ ایسے معاشرے کیلیفورنیا یونیورسٹی کے ماہر بشریات سٹوارٹ شلیگل کے مطالعہ میں آنے والے فلپائن کے ٹیڈ یورے جیسے قبائلی، پنسلوانیا یونیورسٹی کے ماہر بشریات پیگی ریوز سینڈی کے زیر مطالعہ رہنے والے ساٹرا کے منا نگ کباؤ کی طرح کے زرعی اور سویڈن، ناروے اور فن لینڈ جیسے حرفتی طور پر انتہائی ترقی یافتہ معاشرے بھی ہو سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں بہت سے ممالک میں شراکتی نظام کی طرف پیش رفت دیکھنے میں آ رہی ہے۔

شراکتی نظام کا پہلا مرکزی رکن خاندان اور معاشرے کی بہ حیثیت مجموعی جمہوری اور مساویانہ ساخت ہے۔ تاہم شراکتی نظام کی جانب جھکاؤ کا مطلب کوئی بالکل بے نظم اور بے قاعدہ ساخت بھی نہیں۔ شراکتی نظام میں بھی والدین اپنے بچوں کے، اساتذہ اپنے طلباء کے اور ناظمین اپنے کارکنوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں لیکن اس میں ایک بڑا فرق ہے۔ یہ فرق چوہدراہٹ اور خوف پر مبنی نظام مراتب اور اس نظام مراتب کا ہے کہ جس میں والدین، اساتذہ اور مینیجر دوسروں کو قوت سے محروم کرنے کی بجائے انھیں قوی تر بناتے ہیں۔ آگے چل کر اس موضوع پر مزید بات ہوگی۔

شراکتی نظام کا دوسرا مرکزی رکن یہ ہے کہ اس میں جور و جبر کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور اعتماد اور احترام باہمی کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جور و جبر یکسر ختم ہو جاتا ہے لیکن چونکہ تسلط کی سخت درجہ بندیوں کو برقرار رکھنے کے لیے ان اجناس کی حاجت نہیں رہتی لہٰذا انھیں اداروں یا آدرشوں کی شکل دینے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔

تیسرا مرکزی رکن مردوں اور خواتین کے مابین مساویانہ شراکت ہے۔ اس کی بدولت ایک ایسا نظام اقدار فروغ پاتا ہے جس میں خواتین اور مردوں دونوں میں توجہ و نگہداشت، امن پسندی جیسے اوصاف اور رویوں کہ تسلطی نظام میں جن کو حقیر سمجھا جاتا ہے، کی قدر افزائی ہوتی ہے۔

یہ اقدار ایک ایسے معاشی نظام کے لیے اساسی اہمیت کی حامل ہیں کہ جو باہمی منفعت، باہمی محاسبے اور باہمی احساس پر مبنی ہو۔ میں ایک بار پھر اس کی وضاحت کر دوں کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسے نظام کے حامل معاشرے میں ہر ایک کی معاشی حالت بالکل ایک سی ہو

لیکن شراکتی نظام والے معاشروں میں تونگر و نادار افراد کے درمیان کا فرق اتنا زیادہ نہیں ہوتا ۔ ایسے معاشروں میں توجہ ونگہداشت کی بے قدری نہیں کی جاتی اور کاروباری وتیرے اور معاشی پالیسیاں اپنے، دوسروں کے اور ہمارے اس قدرتی مسکن کے احساس اور درد کی بنا پر استوار ہوتی ہیں۔

اب آتے ہیں ہم چوتھے مرکزی رکن کی جانب۔ وہ یہ ہے کہ شراکتی نظام میں ایسی حکایات اور اعتقادات فروغ پاتے ہیں جو فطرت انسانی کی ایک متوازن اور مثبت تصویر پیش کرتے ہیں۔ یہ نظام جبر وتشدد اور ظلم و جور کو انسانی امکانات کے طور پر تسلیم کرتا ہے مگر اس میں یہ ناگزیر متصور نہیں ہوتے اور لوگ انھیں اخلاقی خیال نہیں کرتے۔ نیز ثقافتی اقدار وا عتقادات، احساس و ہمدردی اور احترام باہمی پر مبنی تعلقات کو فروغ دیتے ہیں۔ مزید برآں یہ نظام منفی کی بجائے مثبت انسانی عزائم پر زیادہ انحصار کرتا ہے۔

ان معاشروں کو کہ جن کا خط تسلط/شراکت پر جھکاؤ شراکتی سرے کی جانب ہوتا ہے، مثالی معاشرے قرار نہیں دیا جا سکتا مگر ان کے عقائد اور ادارے...... خاندان اور تعلیم سے لے کر سیاست و معاشیات تک...... انسانی حقوق اور قدرتی ماحول کے احترام کو فروغ دیتے ہیں۔ یہ ایسے جمہوری معاشرے ہوتے ہیں جن میں امراء و مساکین کے درمیان زیادہ تفاوت نہیں ہوتا اور امن و صلح جوئی کے رویے کو مرد و عورت دونوں کے لیے موزوں تصور کیا جاتا ہے اور معاشرتی سطح پر ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

تسلطی اور شراکتی نظام کا موازنہ		
	تسلطی نظام	شراکتی نظام
(1) ساخت	تسلط کے بے لچک نظام ہائے مراتب کی حاصل حاکمانہ اور غیر منصفانہ معاشی و معاشرتی ساخت۔	جمہوری اور معاشی طور پر منصفانہ ساخت۔

MashalBooks.com

(2) تعلقات	انتہائی درجے کا خوف، زیادتی اور تشدد جو بیوی بچوں کی مار پیٹ سے لے کر گھروں، دفتروں اور معاشرے میں ''اعلیٰ'' حیثیت کے حامل افراد کے جبر میں اظہار پاتا ہے۔	باہمی اعتماد اور عزت واحترام بہت کم خوف اور تشدد دیکھنے میں آتا ہے کیونکہ اس نظام میں نہ تو تسلطی نظام جیسی بے لچک درجہ بندیاں ہوتی ہیں اور نہ خوف و تشدد جیسی چیزوں کی ضرورت۔
(3) جنس	نوع بشر کے مردانہ نصف کا زنانہ نصف پر اور مردانہ تصور ہونے والے خصائل و وظائف کا توجہ ونگہداشت جیسے زنانہ خیال کیے جانے والے اوصاف و وظائف پر تفوق۔	نوع انسانی کے مردانہ نصف اور زنانہ نصف کی یکساں قدر و قیمت اور مردوں، خواتین اور معاشی و معاشرتی پالیسی میں احساس، توجہ، نگہداشت اور امن وصلح جوئی کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی۔
(4) عقائد	اس نظام کے تحت اعتقادات و حکایات تسلط وتشدد کا جواز مہیا کرتے ہیں اور انھیں سماج میں معیار کی حیثیت دلاتے ہیں اور انھیں ناگزیر، اخلاقی اور پسندیدہ رویوں کے طور پر پیش کرتے ہیں۔	شراکتی نظام میں مروج اعتقادات و حکایات ہمدردانہ اور باہمی طور پر منفعت بخش اور پُر احساس تعلقات کو بہت زیادہ قدر و قیمت دیتے ہیں جنھیں اخلاقی اور پسندیدہ تصور کیا جاتا ہے۔

کسی بھی انسانی عمل (یا بے عملی) کے بنیادی طور پر دو بڑے محرکات ہوتے ہیں۔ ایک تکلیف سے پرہیز اور دوسرا تلاش مسرت۔ یہ بنیادی مقاصد تسلطی اور شراکتی دونوں نظاموں میں کارفرما ہوتے ہیں لیکن ان دونوں نظاموں میں زور مختلف چیزوں پر دیا جاتا ہے۔

خط شراکت وتسلط کی حرکیات

شراکتی نظام

باہمی احترام اور اعتماد
تشدد میں کمی

ہمدردانہ اور پر احساس تعلقات کی قدر افزائی کرنے والی حکایات اور اعتقادات

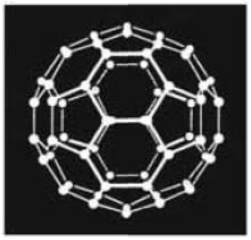

جمہوریت اور منصفانہ معیشت کی ساخت

عورتوں اور مردوں کی ہمسری اور خاص طور پر نسوانی خیال کی جانے والی اقدار کا احترام

تسلطی نظام

جبر وتشدد میں اضافہ

تسلط وتشدد کو جواز فراہم کرنے والے عقائد وحکایات

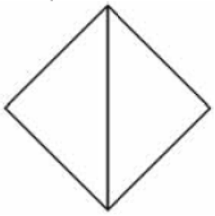

حاکمانہ اور غیر منصفانہ معاشی ومعاشرتی ساخت

مردانگی کی عورتوں اور نسوانیت پر فوقیت

ان دونوں نظاموں کے ارکان ایک دوسرے پر باہمی طور پر اثرانداز ہوتے ہیں اور چاروں کے چاروں ارکان ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔ یہ تعاملات معاشی تعلقات سمیت تمام معاشرتی اداروں اور روابط کی تشکیل کرتے ہیں۔

تسلطی نظام میں خوفِ کلفت کو انسانی سرگرمیوں کا ایک بڑا محرک تصور کیا جاتا ہے۔ یہ اپنے سے اوپر کے افراد سے سزا کا خوف بھی ہوسکتا ہے اور اقتدار ومرتبے کے کھو جانے کا بھی۔ اس کے ماحصل کے طور پر ایک زیادہ منفعت بخش دفتر یا کارخانے کے متعلق بیشتر ابتدائی فکر کی بنیاد یہ عقیدہ بنا کہ ملازمین جس قدر زیادہ خوف میں مبتلا ہوں گے، وہ اس قدر زیادہ محنت کریں گے۔

MashalBooks.com

آج آ کے اکثر کاروباری ماہرین اس نظریے سے اتفاق کرنے لگے ہیں کہ لوگ زیادہ دلجمعی سے کام تب کرتے ہیں جب ان کے سر پر خوف سوار نہ ہو۔ جب وہ خود کو محفوظ محسوس کر رہے ہوں اور محسوس کر رہے ہوں کہ وہ محفوظ اور مامون ہیں، ان پر توجہ دی جا رہی ہے اور ان کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان اصولوں کی بنیاد پر چلنے والا ادارہ نہ صرف زیادہ پیداواریت اور وفاداری کو فروغ دیتا ہے بلکہ اختراع وتجدد اور رسک جوئی کی آبیاری بھی کرتا ہے۔ 10 اب بہت سے کامیاب اداروں نے یہ نظریہ قبول کر لیا ہے بلکہ وہ کامیاب ہی یہ نظریہ اپنانے سے ہوئے ہیں کہ جب ملازم کو یہ احساس ملے کہ اس کا احساس کیا جا رہا ہے تو وہ اور زیادہ اچھا کام مزید باقاعدہ طریقے سے سرانجام دینے لگتا ہے۔

لیکن کلفت کے محرک سے فرحت کے محرک کی طرف یہ پیش رفت ایسے خلا میں رونما نہیں ہو گی۔ یہ ایک اور وسیع تر معاشرتی تحریک یعنی تسلطی نظام میں شراکتی نظام کی طرف منتقلی کی تحریک کا فقط ایک جزو ہے اور اس تحریک کا تعلق فقط کاروباری شعبے سے نہیں بلکہ تمام شعبوں، اداروں اور روابط سے ہے۔

شراکتی ساختیں، اقدار اور روابط

شراکتی نظام کے مرقومہ بالا چاروں مرکزی ارکان ہی تمام سماجی اداروں اور تعلقات و تعاملات کی تشکیل کرتے ہیں۔ جن میں معاشی تعلقات وتعاملات بھی شامل ہیں۔ اعادے کے لیے ہم ان کا لب لباب پھر لکھے دیتے ہیں:

(ا) ایک جمہوری اور مساویانہ خاندانی اور سماجی نظام
(ب) جبر وتشدد میں کمی
(ج) مردوں اور عورتوں میں برابری کی بنیاد پر شراکت
(د) باہمی فائدے، محاسبے اور احساس پر مبنی تعلقات کو فروغ دینے والے اعتقادات و حکایات

ہم ان ارکان کے باہمی تعاملات کو ٹیڈیورے جیسے کم پیچیدہ معاشروں کے مطالعے سے زیادہ صراحت سے دیکھ سکتے ہیں۔ مجھے اس قبائلی معاشرے کے بارے میں پہلی بار علم علم بشریات کے محقق سٹوارٹ شلیگل سے حاصل ہوا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ کئی برسوں سے

فلپائن کے ایک قبائلی گروہ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ''میں انھیں انتہائی مساوات پسند قرار دیتا تھا'' وہ کہنے لگے ''مگر آپ کی تصنیف پڑھنے کے بعد اب میرا ذہن یہ کہتا ہے ہ وہ بن باسی ٹیڈیورے معاشرہ تو سیدھا سیدھا شراکتی معاشرہ ہے۔''

جناب شلیگل اپنی کتاب ''برساتی جنگل کی حکمت'' میں لکھتے ہیں کہ ٹیڈیورے سماج میں ''تمام کے تمام افراد، خواہ وہ مرد ہیں یا خواتین، خواہ بڑے ہیں یا بچے ایک ہی درجے اور قدر و وقعت کے حامل متصور ہوتے ہیں۔''(11) ہر فرد کی قدر افزائی کا یہ وتیرہ زندگی وعمل کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔

جناب شلیگل رقم طراز ہیں:

> اگرچہ بچے کا حمل و پیدائش خواتین کا تخصص ہے، عورتیں اور مرد دونوں مل کر بچوں کو پالتے پوستے ہیں۔ میں ان میں مرد کو زیادہ قوی تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مرد کو عورت پر کس نوع کی بالا دستی حاصل ہے اور نہ ہی اس سے کسی قسم کے معاشرتی جبر، منظم جنگ و جدال یا نجی جائیداد کے ارتکاز کا جواز فراہم ہوتا ہے۔ جڑی بوٹیاں صاف کرنا، درخت کاٹنا، ٹوکریاں بننا، سؤر مارنا، بچے جننا اور ان کو پالنا پوسنا، یہ سب کے سب وظائف یقیناً ایک دوسرے سے ممیّز اور مختلف ہیں مگر ان کے ہاں ان سب کو برابر تصور کیا جاتا ہے۔
>
> خاندانی اور سماجی ڈھانچہ مساویانہ اصولوں پر قائم ہے اور سماجی تعلقات نہایت پرامن ہیں اور ان میں کوئی درجہ بندی یا تفریق دیکھنے میں نہیں آتی ہے۔ ان میں فیصلے بھی مل جل کر کیے جاتے ہیں۔ ''نسوانی'' متصور ہونے والے نازک اوصاف کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور قبیلے کی خوشحالی کا خیال محنت اور دیگر سرگرمیوں کا بڑا محرک ہے۔ فطرت اور جسم انسانی کو بہت زیادہ احترام دیا جاتا ہے اور حرفت کو زندگی کی افزودگی کے ایک ذریعے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔(12)

بے شک ٹیڈیورے ہر وقت دوسروں کے لیے احساس وفکرمندی کی روش پر نہیں رہتے۔ شلیگل صاحب لکھتے ہیں۔ ''اگرچہ ان کے ادارات اور اعتقادات سبھی تشدد و فساد سے مانع ہیں وقتاً فوقتاً وہ اپنے معاملات طے کرنے کے لیے فساد پر بھی اتر آتے ہیں۔''(13) لیکن ان کی ثقافت میں لڑائی اور فساد کی روک تھام کے لیے بڑا مفصل انتظام ہے۔ قبیلے کے پنچ اور

سیانے دونوں فریقوں کو بٹھا کر معاملہ حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان پنچوں میں مرد اور خواتین دونوں شامل ہوتے ہیں۔

بیس لاکھ کی تعداد سے متجاوز افراد پر مشتمل زرعی ثقافت منانگ کباؤ اس مظہر کی ایک مثال ہے جو اس امر کی صراحت کرتا ہے کہ شراکتی نظام کے چاروں بڑے ارکان کس طرح باہم ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔ پیگی ریوز سینڈی کو بیس سال پر محیط عرصے میں متعدد بار ایک منانگ کباؤ گاؤں بیلبس میں رہنے اور ان باشندوں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس گروہ کا عائلی و سماجی ڈھانچہ تسلط و اتباع کی درجہ بندیوں کی بجائے باہمی احساس و احترام پر مبنی ہے۔(14) چونکہ منانگ کباؤ معاشرے کا جھکاؤ شراکتی نظام کی طرف ہے، وہاں نہ مرد دوسروں پر حاکمیت قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی عورتیں۔ عائلی اور سماجی ڈھانچہ بہت زیادہ مساویانہ بنیادوں پر استوار ہے اور تشدد کو ادارے یا آدرش کی حیثیت کبھی بھی حاصل نہیں ہو پاتی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ منانگ کباؤ نسل کے لوگوں میں بچوں کی پرورش و پرداخت میں جبر یا تشدد نام کی کوئی چیز مشاہدے میں نہیں آتی۔ ''بچوں کی دیکھ بھال میں کوئی حاکمانہ یا تادیبی عنصر دیکھنے کو نہیں ملتا۔'' سینڈی رقم طراز ہیں۔ ''انھیں مارا پیٹا نہیں جاتا۔ میں نے کبھی کسی ماں کو اپنے بچے پر چیختے چلاتے نہیں دیکھا...... ان کی سوچ یہ ہے کہ وہ جلد یا بدیر خود ہی ایک صحیح منانگ کباؤ کی طرح پیش آنا سیکھ جائیں گے۔''(15)

اگرچہ ان میں مرد اور عورت کو یکساں مقام اور قدر و قیمت حاصل ہے۔ منانگ کباؤ اپنا نسب ماں سے لیتے ہیں۔ مرد کے جائیداد کے توارث کا باپ کے خونی رشتے سے کوئی سروکار نہیں۔ سماجی حیاتیات کے حکماء کے دلائل کو پیش نظر رکھیں تو اندریں حالات باپ کا اپنے بچوں کی زندگی میں ادا کرنے کا کوئی زیادہ کردار باقی نہیں بچتا لیکن حقیقت میں ان کا کردار ہے۔ تاہم باپ کا بچے کے ساتھ تعلق زمین و اماکن کے ایصال و توارث پر عائد نہیں ہوتا۔ باپ اور بیٹے میں مادی نہیں بلکہ جذباتی رشتہ ہوتا ہے۔ ایک منانگ کباؤ بزرگ کا کہنا ہے کہ ''باپ کے خونی رشتے کے تردد سے بچے کی اچھی نشوونما کے زیادہ اہم کام سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔'' (16)

منانگ کباؤ معروف ماہر بشریات کلاڈ لیوی سٹراس کے اس دعوے کی بھی نفی کرتے ہیں

MashalBooks.com

کہ مردعورتوں کا تبادلہ خاندانوں یا گروہوں کے درمیان سماجی روابط کو مضبوط کرنے کے لیے سماجی تعلقات کو استوار کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ منا نگ کباؤ قبائل میں سماجی روابط کو مضبوط کرنے کے لیے مائیں اپنے بیٹے شادی میں دوسرے خاندانوں کو دیتی ہیں۔ تسلطی معاشروں کے تبادلۂ ازدواج کے برعکس یہ تعلقات جہیز یا دلہن کی قیمت لے یا دے کر مضبوط نہیں کیے جاتے۔ اس معاشرے کی شراکتی اقدار کے عین مطابق یہ تبادلہ دوطرفہ بنیادوں پر ہوتا ہے اور لڑکی والے اور لڑکے والے دونوں مل کر شادی کی ضیافت کا اہتمام کرتے ہیں۔

البتہ شراکتی نظام کے حامل دیگر معاشروں کی طرح منا نگ کباؤ لوگوں کی زندگی کو ہر عیب یا نقص سے پاک قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم ان میں سے بیشتر افراد آپ کو ایسے ملیں گے جن میں دوسروں کے لیے احساس اور خبر گیری کا جذبہ ضرور ہوگا۔ سینڈی کے مطابق تعاون (تسلط نہیں) وہ پہلا سماجی سبق ہے جو منا نگ کباؤ فطرت سے سیکھتے ہیں۔ نتیجتاً سماجی ادارے کمزوروں کو آسرا دیتے ہیں اور توجہ و التفات کو فروغ دیتے ہیں۔ ٹیڈیورے اور منا نگ کباؤ قبائل میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ دونوں تشدد کے سدباب اور پرامن زندگی کے فروغ کے لیے مراقبے سے استفادہ کرتے ہیں۔

سکنڈے نیویا اقوام کا شراکتی نظام:

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ کہیں کہ ان دونوں مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شراکتی اقدار فقط ٹیڈیورے اور منا نگ کباؤ جیسے حرفتاً غیر ترقی یافتہ معاشروں میں ہی چل سکتی ہیں اور یہ کہ زیادہ پیچیدہ صنعتی معاشروں کے لیے تسلطی نظام ہی موزوں ہے لیکن جب ہم سکنڈے نیویا کے حرفتی اعتبار سے بہت زیادہ ترقی یافتہ صنعتی ممالک اور عصری تناظر میں ان کی غیر معمولی کامیابی اور ترقی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ اس ترقی اور کامیابی کے پیچھے بھی کچھ اور نہیں بلکہ شراکتی اقدار ہی کارفرما ہیں۔

اس خطے کے ممالک مثلاً سویڈن، ناروے اور فن لینڈ نے اپنی معاشرت سیاسی و معاشی جمہوریت کی بنیادوں پر تشکیل دی ہے۔ ان ممالک میں امراء و مساکین کے درمیان کا پاٹ تسلطی نظام کی حامل اقوام کی مانند زیادہ وسیع نہیں ہے۔ اگرچہ انھیں مثالی معاشرہ نہیں کہا جا سکتا مگر پھر بھی کم از کم وہ اپنے تمام افراد کو ایک معقول معیار زندگی اور جنسی عدل و مساوات

فراہم کرنے میں کامیاب ضرور رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ان کا تقابل باقی دنیا سے کریں تو وہاں سماجی تشدد بھی دیگر خطوں کی نسبت کم ہے۔ تحقیقات نے یہ بات بھی عیاں کر دی ہے کہ ان ممالک کے کارکن امریکہ اور بلند و بالا خ ق پ کے حامل دیگر ممالک کے افراد کی نسبت زیادہ مطمئن اور مسرور ہیں!!(17)

بیسویں صدی کے آغاز میں متذکرہ بالا ممالک بہت زیادہ غریب اور پریشان حال تھے۔ ان کا معیار زندگی بہت پست تھا اور اس سبب یہاں کے لوگ عمر بھی بہت کم پاتے تھے۔ آپ حیران ہوں گے کہ ان ایام میں افریقیوں کی طرح ان ممالک کے لوگ بھی قحطوں سے دوچار ہوتے تھے اور پھر انھیں تنگ آ کر امریکہ اور دنیا کے دیگر خطوں کی طرف جوق در جوق ہجرت کرنا پڑتی تھی۔

☆ فطرت، پیار اور ارتقاء:

منا نگ کباؤ پیار و تعاون کو فطرت کا مرکزی اصول تصور کرتے ہیں۔ سینڈی کا کہنا ہے:

''انیسویں صدی کے ڈارون کے برعکس منا نگ کباؤ قبائل کے باشندے مادرانہ شفقت و نگہداشت کے وظیفے کو (جسے وہ مفاد عامہ اور ایک صحت مند معاشرے کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں) مردانہ کام اور مقابلے بازی پر (جسے ہم سماجی درجہ بندی اور ارتقاء کے لیے بنیادی سمجھتے ہیں) فوقیت دیتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق فطرت کے پیدا کردہ ننھے بیجوں کی مانند بچوں کو اس طرح شفقت و پیار سے پرورش کرنا چاہیے کہ بڑے ہو کر ان کی شخصیت تناور درخت کی طرح ابھرے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ معاشرے کو ناتواں روحوں کی سہائیتا اور پرورش کرنی چاہیے اور بے مہار طاقت سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (18)

قدرت کے ممد حیات قوائے پر یہ ارتکاز توجہ جو کہ شراکتی معاشروں کا ایک مرکزی خاصہ متصور ہوتا ہے۔ آج کل کی ماحولیاتی تحاریک کا ایک بنیادی جزو ہے۔ اس رویے اور فطرت کے بارے میں اس مخاصمانہ تصور میں بہت تضاد محسوس ہوتا ہے جو کہ کسی دور میں ایک مقدس عقیدے کے طور پر مانے جانے والے ''تسخیر فطرت'' کے نظریے کو چابی دیتا ہے اور جو ہماری اس حرفتی ترقی کے تناظر میں ہمیں ارتقاء کے کسی اندھے موڑ کی جانب بھی لے جا سکتا ہے۔

لیکن آج یہ اقوام معیار زندگی کے اعتبار سے اقوام متحدہ کی سالانہ انسانی ترقیاتی رپورٹوں میں مسلسل سرفہرست نظر آتی ہیں۔ عالمی اقتصادی فورم کے سالانہ جائزوں میں بھی ان کا نمبر سب سے اوپر ہوتا ہے۔(19)

سکنڈے نیویا کے ممالک کی معاشی کامیابی کو بعض لوگ ان کی نسبتاً قلیل اور متجانس آبادی سے بھی منسوب کرتے ہیں لیکن ہم بہت سے ایسے ممالک بھی دیکھتے ہیں مثلاً تیل کی دولت سے مالا مال خلیجی ریاستں کو ہی لے لیجیے کہ جہاں اس سے بھی زیادہ یکسانیت اور یک رنگی ہے، جہاں ملک کے طول وعرض میں ایک ہی مسلک چلتا ہے اور ایک ہی شیخ یا بادشاہ کے پیچھے چلنا پڑتا ہے، لیکن وہاں ہمیں امراء و مساکین کے مابین ایک بہت بڑی خلیج اور تسلطی نظام سے خاص دیگر ناانصافیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اگر ہم یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ ان ممالک نے فلاکت و افلاس کے اندھیرے سے نکل کر ایک خوشحال، متواضع اور عادلانہ معاشی نظام تک کا سفر کس طرح طے کیا تو ہمیں دیگر عوامل پر غور کرنا ہوگا۔

ان اقوام کو جس کارن یہ کامیابی حاصل ہوئی وہ شراکتی نظام کی طرف پیش رفت تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے بات کر رہے تھے، ایک زیادہ جمہوری اور مساویانہ عائلی اور سماجی ڈھانچے اور تخفیف تشدد کے علاوہ اس نظام کا ایک اور کلیدی عنصر عورت مرد کے درمیان بہت زیادہ مساوات ہے۔

☆ سکنڈے نیویا کے ممالک کی خوشحالی کی وجہ:

ایک بہت بڑے ماہر اقتصادیات کا کہنا ہے کہ ''کئی زاویوں سے ان ممالک کے لوگ ایسے سعد دائروں میں داخل ہو گئے ہیں جہاں مختلف عوامل ایک دوسرے کی تقویت کرنے لگتے ہیں اور یہ سب عوامل نے مل کر انھیں دنیا کی کامیاب ترین معیشتوں میں شامل کر دیا ہے۔''

28 ستمبر 2005ء کو عالمی اقتصادی فورم کی 2005-2006ء کی رپورٹ کے اجراء کے موقع پر اپنے ایک انٹرویو میں لوپیز کارلوس نے کہا کہ ''اس میں کوئی صداقت نہیں کہ سکنڈے نیویا کے ممالک کی عالمی منڈیوں میں مقابلے کی استعداد پر زیادہ ٹیکسوں کی وجہ سے کوئی منفی اثر پڑ رہا ہے یا ان کی اپنے عوام کو انتہائی اعلیٰ معیار زندگی کی فراہمی کی صلاحیت میں کوئی کمی واقع ہو رہی ہے۔ اس کے برعکس، اس کا کہنا تھا کہ ''جب ان

ٹیکسوں سے وہ وسائل پیدا ہوں کہ جن سے عالمی معیار کے تعلیمی ادارے بنائے جا سکیں اور سماجی تحفظ کا ایک مؤثر نظام قائم کیا جا سکے اور ایک انتہائی پرعزم اور مشاق افرادی قوت تیار کی جا سکے تو ان سے معاشی صلاحیت میں اضافہ ہی ہوگا، کمی نہیں ہوگی۔''

ماخذ:

www.weform.org /site/ homepublic.nsf/ content/ global + competitiveness + report + 2005-2006 % 3A+Interview

سویڈن، ناروے، آئس لینڈ، ڈنمارک اور فن لینڈ میں خواتین اعلیٰ سیاسی عہدوں پر فائز ہو سکتی ہیں اور اس خطے کے قانون ساز اداروں میں ارکان کی چالیس فیصد تعداد خواتین پر مشتمل ہوتی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ دنیا کے کسی اور حصے میں خواتین کو اس قدر نمائندگی ملتی ہو۔

ٹیڈیورے اور منا نگ کیاؤ معاشرت کی مانند یہاں بھی خواتین کی حیثیت اور طرزِ عمل نے ''مردانگی'' کے بارے میں مردوں کی رائے کو بہت متاثر کیا ہے۔ جوں جوں خواتین کی حیثیت بہتر ہوئی ہے، نگہداشت، امن اور تسلطی معاشروں میں ادنیٰ ''نسوانیت'' سے منسوب ہونے کے سبب مردوں کے لیے ناموزوں متصور کیے جانے والے دیگر خصائل و وظائف کی حیثیت بھی بالا ہوتی چلی جاتی ہے۔ شراکتی معاشروں میں چونکہ خواتین محکوم نہیں رہتیں، مرد ان اوصاف کو خود میں اور معاشرے میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔(20)

سکنڈے نیویا کی خواتین کی بلند حیثیت و مرتبہ کے ساتھ ''نسوانی'' اقدار و وظائف کی سرپرستی کرنے والی مالیاتی ترجیحات کا بھی اپنا ایک کردار ہے۔ اس خطے کی شراکت پسند اقوام نے سرکاری سطح پر نگہداشتِ اطفال، عام طبی سہولیات اور مع تنخواہ رخصت والدینی جیسی ان متواضع پالیسیوں کو سب سے پہلے رواج دیا جو زندگی کو زیادہ سہل اور خوشگوار بناتی ہیں اور زیادہ پیداوار کا سبب بنتی ہیں۔ گھروں میں بچوں کی مار پیٹ کے خلاف قوانین کی بنیاد رکھنے والے بھی یہی لوگ ہیں۔ انھوں نے تنازعات کے پرامن حل کے سلسلے میں بھی پہل کاری کی اور دنیا میں پہلی دفعہ امن سے متعلق تحقیقی پروگراموں کا اجراء کیا جبکہ بقیہ دنیا میں ابھی جنگی اکیڈمیوں کا قیام عمل میں آ رہا تھا۔ یہ وہ ملک ہیں جہاں خواتین کے خلاف مردانہ جبر کے

خلاف آواز بلند کرنے کے لیے مردتحریکیں چلاتے ہیں۔(21)

یہی وہ اقوام ہیں جنھوں نے سب سے پہلے ماحول دوست صنعتی پروگراموں کو رواج دیا۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے ایسے قوانین وضع کیے ہیں کہ جن سے بچوں کو متاثر کرنے والی تجارتی تشہیر کا سدباب کیا جا سکے اور اس طرح بیشتر صنعتی اقوام کو اپنے نرغے میں لینے والی لعنت یعنی مادہ پرستی کو کھل کھیلنے سے روکا جا سکے۔ اس سے کسی کو کوئی اچنبھا نہیں ہونا چاہیے کہ یہ اقوام دوسری کسی بھی ترقی یافتہ قوم کی نسبت اپنی خام خانگی پیداوار کا سب سے زیادہ حصہ بین الاقوامی امدادی پروگراموں پر صرف کرتی ہیں جن میں منصفانہ معاشی ترقی، تحفظ ماحول اور انسانی حقوق کے پروگرام شامل ہیں۔

صرف یہی نہیں سکنڈے نیویا کے ممالک نے زیادہ شراکت مائل معاشی ڈھانچوں کے استعمال میں بھی پہل کی۔ صنعتی جمہوریت کے ضمن میں تجربات کی ابتداء سویڈن اور ناروے نے کی۔ اس کے علاوہ ان تحقیقات کا آغاز بھی انھی ممالک سے ہوا جس سے یہ بات سامنے آئی کہ ایک زیادہ شراکتی ڈھانچہ جس میں تقسیم کار اور نظام اوقات طے کرنے کے سلسلے میں کیے گئے فیصلوں میں کارکن بھی شریک ہوسکیں، بہت زیادہ مؤثر ثابت ہوسکتا ہے۔ مزید برآں ان ممالک میں کاروباری شراکت کے لیے قائم کیے گئے اداروں کی تاریخ بھی بہت پرانی ہے۔ تمام کھاتہ داران اداروں کے مشترکہ طور پر مالک ہوتے ہیں اور انھیں جمہوری طریقہ کار کے مطابق چلایا جاتا ہے نیز ان اداروں کی روایت ہے کہ یہ گردونواح کے علاقے کے لوگوں کے درد واحساس کے رہنما اصول کو بھی ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ یہ شراکتی ادارے ہنوز اس خطے کی معاشی زندگی کے ایک بہت اہم حصے کے طور پر اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان شراکتی اداروں کی ترقی کے لیے قائم کی گئی ایک تنظیم کو پاک کی جو کہ اقوام متحدہ کے ساتھ مل کر ایک پائیدار شراکتی ترقی کے ارتباط وفروغ کے لیے کام کرتی ہے، کی ایک رپورٹ کے مطابق 1997ء میں ملک میں 79 فیصد زرعی اور 31 فیصد جنگلاتی پیداوار کے ذمہ دار فن لینڈ کے اسی نوع کے شراکتی ادارے تھے۔ اس برس سویڈن میں بیمے کے شعبے میں کام کرنے والے ایک شراکتی ادارے فولکسام کے ہاتھ میں خاندانی بیمے کی مالیت کا 489 فیصد اور زندگی اور حادثاتی، اجتماعی بیمے کی مالیت کا 50 فیصد کاروبار تھا۔ 22 اسی طرح اس نوع کے شراکتی ادارے قابل تجدید توانائی کے منصوبوں میں بھی بڑا اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ مثلاً ڈنمارک میں ہوائی ٹربائنوں

کی تنصیب کا 75 فیصد کام مقامی شراکتی اداروں کے پاس ہے۔ سویڈن کے بہت سے رہائشی شراکتی ادارے ملک کا 2015ء میں تیل میں خودکفالت کا ہدف پورا کرنے کے لیے توانائی کے متبادل وسائل کی طرف آ رہے ہیں۔(23)

معاشی و معاشرتی اداروں کی تعمیر:

ہم گذشتہ اوراق میں جس معاشی منظر کا جائزہ لیتے چلے آ رہے ہیں وہ کوئی اتفاقیہ اور غیرمربوط تغیرات پر مشتمل نہیں۔ یہ سب تغیرات صرف اس چیز کے اشمار ہیں کہ اس خطے کا میلان تسلطی نظام کی بجائے شراکتی نظام کی جانب زیادہ ہے۔

ٹیڈیورے، منا نگ کباؤ اور سکنڈے نیویا کو کوئی ''خالص'' شراکتی معاشرے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عملی طور پر اس دنیا میں کوئی خالصتاً شراکتی نظام یا خالصتاً تسلطی نظام نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ فرق صرف درجے کا ہے کہ کون سی معاشرت تسلطی اقدار کی طرف زیادہ مائل ہے اور کون سی شراکتی اقدار کی طرف۔

لیکن شراکتی رنگ کے حامل نظاموں میں کنبوں سے لے کر حکومتوں تک سماجی ادارے اس طرح وضع کیے جاتے ہیں کہ وہ طاقت کے بالائی طبقے میں ارتکاز کی راہ ہموار کرنے کی بجائے باہمی احترام، باہمی محاسبے اور منفعت کی ریت کو فروغ دیں۔ ان معاشروں کا قانونی نظام بھی اس نوع کے وتیروں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اس میں پھر ثقافتی اقدار کا بھی کردار آ جاتا ہے یعنی کسی معاشرے میں کون سی چیز جائز اور مباح متصور ہوتی ہے اور کون سی نہیں۔ متذکرہ شراکتی معاشروں کی ثقافتی اقدار بھی اس نوع کی ہیں کہ جو شراکتی ڈھانچوں کو سریش کی طرح باہم جوڑے رکھتی ہیں اور انھیں مضبوط کرتی ہیں۔

یہاں میں اس بات کا اعادہ بھی کرنا چاہوں گی کہ اس چیز کے تعین میں کہ کس معاشرے کے ادارے جمہوری اور عادلانہ ہیں یا تسلطی اور غاصبانہ، شراکتی کنبہ بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ شراکتی کنبے کو اس اعتبار سے کوئی کاملاً جمہوری ادارہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں چھوٹے بچوں کو بھی خاندانی فیصلوں میں برابری کی بنیاد پر اپنا کردار ادا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ والدین بچوں کے لیے اہم فیصلے کرتے ہیں۔ ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ انھیں حدود و توقعات کی وہ تعلیم دیتے ہیں جس کی بچوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن شراکتی گھرانوں میں بچے کو شروع سے

MashalBooks.com

احترام دیا جاتا ہے اوراس کے والی اس کی حاجات و احتیاجات کا خیال رکھتے ہیں۔ جیسے جیسے یہ بچے بڑے ہوتے ہیں ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ اپنے بارے میں خود سوچیں اور اپنے فیصلے خود اپنے دماغ سے کریں اور پھر جہاں تک ممکن ہو سکے ان فیصلوں اور ترجیحات کی تعظیم بھی کی جاتی ہے۔ ایسے گھرانوں میں جسمانی تشدد والی سرے سے کوئی بات دیکھنے میں نہیں آتی اور عادلانہ اور متواضع رویوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

اس نوع کے شراکتی خاندان جنسی مساوات کا نمونہ پیش کرتے ہیں اور ان میں اونچ نیچ یا کسی قسم کی تھانیداری نہیں پائی جاتی جیسا کہ روایتی تسلطی معاشروں کے پدر سالاری کنبوں میں پائی جاتی ہے اور ایسے خاندان توجہ ونگہداشت کو کسی ''نازک'' یا ''نسوانی'' شے کے نمونے کے طور پر پیش نہیں کرتے بلکہ مردانہ و زنانہ ہر دو قسم کی شناخت کے لیے ایک لازمے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

جب خاندانی ڈھانچے میں کارفرما اقدار اور اصول ہمدردی، احساس، عدل اور تواضع کی قدر افزائی اور سرپرستی کریں گے تو اس کا اثر دوسرے اداروں پر بھی ہوگا اور لوگ ان کا اطلاق ان اداروں میں تعلقات کی توضیع پر بھی کریں گے۔ شراکتی خاندانی ڈھانچے کی ایک زیادہ منصفانہ اور جمہوری معاشی و معاشرتی نظام کی تعمیر کے لیے ایک اساسی حیثیت کے حامل ہیں لیکن یہ کوئی یک طرفہ عمل بھی نہیں ہے۔

خاندان، تعلیم، مذہب سے لے کر سیاست و اقتصاد تک تمام کے تمام سماجی ادارے ایک باہمی طور پر متعامل و متعاون کل کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کا باہمی تعلق کسی معاشرے کے بنیادی خواص کو سانچے میں ڈھالتا ہے اور اسے برقرار رکھتا ہے۔

کسی معاشرے کی معاشی تدابیر، ادارے اور وتیرے اس عمل میں خاص طور پر ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بالا تا زیریں درجہ بندیوں پر مبنی نظام میں معاشی ادارے اس چیز کو یقینی بنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وسائل کا کنٹرول بالائی طبقے کے چند افراد کے ہاتھوں میں مرتکز رہے۔ یہ ادارے وضع ہی اس طرح کیے جاتے ہیں کہ وہ معاشی طاقت پر ان چند ہاتھوں کی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر کریں۔ اس طاقت کے بل بوتے پر اس امر کو یقینی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ قانون، حکومتی تدابیر، کاروباری اصول اور مواصلاتی کل پرزے طاقت کے اس ارتکاز کو تقویت فراہم کریں۔ یہی وجہ ہے کہ شراکتی نظام کی طرف معاصر تحریک کو تیز تر

کرنے کے لیے معاشی اصول واقدار اور ڈھانچوں میں تبدیلی لانا انتہائی ضروری ہے۔

یہاں میں شراکت مائل ڈھانچوں کی تشکیل کی راہ میں آنے والی ایک بڑی رکاوٹ کی طرف رجوع کرنا چاہوں گی۔ وہ رکاوٹ دراصل یہ غلط فہمی ہے کہ صرف تسلطی ڈھانچے ہی معاشی طور پر صحیح کام کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے باب سوم میں شراکت مائل کاروباری تدابیر کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا، شراکتی ڈھانچے درحقیقت بہت زیادہ کارآمد اور قابل عمل بھی ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان سے بے اندازہ انسانی اور ماحولیاتی فوائد بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر یورپی اتحاد کی معیشت کا ایک بہت بڑا حصہ شراکتی اداروں پر مشتمل ہے اور عالمی معیشت میں بھی اس شعبے کے کردار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ (24) اور ان اداروں کی کامیابی جزوی طور پر اس چیز کی مرہون منت ہے کہ یہ شراکتی ڈھانچے سماجی و ماحولیاتی ذمہ داری، مقامی آبادی کے فوائد اور تجارتی منصوبے کو منافع جات میں ذمہ داری اور ایک شراکتی انداز نظامت سے باہم مربوط کرنے کی صلاحیت کے حامل ہیں۔ 25

تاہم یہ شراکتی ادارے ہی وہ واحد معاشی ڈھانچہ نہیں ہے کہ جو شراکتی اصولوں کو اختیار کر سکتا ہے۔ تمام قسم کے کاروباری ادارے...... چھوٹے بھی اور بڑے بھی...... سماجی اور ماحولیاتی ذمہ داری کی ڈگر اختیار کر سکتے ہیں، ایک زیادہ شراکتی انداز نظامت اپنا سکتے ہیں اور تمام حصہ داروں کے سامنے جوابدہی کا طرز عمل اختیار کر سکتے ہیں۔

مزید برآں، بعض بہت عام غلط فہمیوں کے برعکس ایک فعال شراکتی ڈھانچہ مکمل طور پر مسطح نہیں ہوتا۔ یقیناً شراکتی معاشی و معاشرتی ڈھانچے تسلطی ڈھانچوں کی نسبت زیادہ ہموار ہوتے ہیں اور ان میں فیصلہ سازی میں جمہوریت اور شراکت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے لیکن شراکتی نظام کے تحت بھی حکومتیں قائدین کے تحت چلتی ہیں اور کاروباری اداروں میں ناظمین، خاندان میں والدین اور مدارس میں اساتذہ موجود ہوتے ہیں۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ شراکتی اداروں میں قائدین زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ ان میں طاقت صرف چند ہاتھوں میں مرتکز نہیں ہوتی اور تمام اراکین کے خیالات کو اہمیت دی جاتی ہے۔

شراکتی معاشی و معاشرتی ڈھانچوں میں بھی درجہ بندیاں اور نظام ہائے مراتب ہوتے ہیں لیکن ان میں تسلط کا عنصر نہیں ہوتا۔ تسلطی درجہ بندیوں میں قائدین اور ناظمین احکام صادر

کرتے ہیں جن کا اتباع ضروری ہوتا ہے مگر شراکتی ڈھانچوں میں قائدین اور ناظمین دوسروں سے مشاورت سے چلتے ہیں۔ شراکتی ڈھانچوں میں فیصلے بعض اوقات شراکت کے انداز میں طے پاتے ہیں لیکن بعض صورتوں میں قائدین اور ناظمین سب کی مشاورت کو مدنظر رکھ کر خود فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن دونوں صورتوں میں تجاویز و مشاورت اور تجاویز دہندگان کو عزت و تکریم دی جاتی ہے۔ نہ ہی ہم شراکتی اور تسلطی اداروں کے مابین فرق کو تعاون و مقابلہ کا فرق قرار دے سکتے ہیں۔ فرق دراصل یہ ہے کہ شراکتی یا تسلطی تناسب کے مطابق طاقت، تعاون اور مقابلے کی تشکیل بہت مختلف ہوتی ہے۔

یہاں میں ان تنظیموں کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہوں گی جنھیں ان کی غیر مرکوز ساخت کے طفیل نئے ابھرنے والے شراکتی سماجی ڈھانچے کے طور پر بہت سراہا گیا تھا۔ 26 اس میں شک نہیں کہ یہ تنظیمیں جمہوریت کے لیے زیادہ مواقع فراہم کرتی ہیں کیونکہ روایتی تسلطی اداروں کے برعکس یہ لوگوں کو ربط و تبادلے کے رضا کارانہ، دوطرفہ اور افقی طریقوں سے ایک دوسرے سے منسلک کرتی ہیں۔ مگر بدقسمتی سے وقت گزرنے کے ساتھ یہ بات سامنے آئی ہے کہ ان تنظیموں کو تسلط و تباہی کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

☆ تعاون، مقابلے اور طاقت کی سماجی ساخت:

> 1985ء میں جب میں نے اپنی تحقیقات کے نتیجے میں سامنے آنے والی منصفانہ اور پرامن ترکیب کو بیان کرنے کے لیے شراکت کے لفظ کا انتخاب کیا تو تب تلک بھی یہ اصطلاح زیادہ تر کاروباری شراکت کے ضمن میں ہی استعمال ہوتی تھی۔ مجھے ایک ایسے نظام کے لیے یہ اصطلاح اچھی لگی کہ جو باہمی منفعت، احترام اور محاسبے کے تعلقات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کیونکہ ایک کاروباری شراکت کے ارکان برابری کی سطح پر مل کر کام کرتے ہیں، فیصلہ سازی میں سب کی سنی جاتی ہے اور وہ باہمی فائدے کے لیے محنت کرتے ہیں۔ The Chalice and The Blade کی اشاعت کے بعد کے دس سال کے عرصے میں یہ اصطلاح زیادہ وسیع معانی میں استعمال ہونے لگی اور اس سے شراکتی کاروباری منصوبوں پر مل کر کام کرنے کے معانی لیے جانے لگے۔ نتیجتاً وہ حضرات کہ جو میرے کام سے پورطرح متعارف نہیں ہیں، اس اصطلاح کو تعاون و مقابلہ کے تصور سے منسوب کر دیتے ہیں۔

اس میں چنداں شک یا شبے کی بات نہیں کہ شراکتی نظام تعاون کے لیے زیادہ سازگار ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگوں کو اعلیٰ، ادنیٰ کے زمروں میں تقسیم نہیں کرتا لیکن دہشت گرد، لٹیرے اور اجارے بھی تو تعاون کے توسط مجتمع ہوتے ہیں اور اپنا کام کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر تسلطی نظام میں بھی تعاون کا عنصر کارفرما ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ درست نہیں کہ اگر لوگ فقط آپس میں تعاون کرنے لگیں تو ہمارے سب مسائل حل ہو جائیں گے۔ تسلطی نظام میں لوگ داخل در گروہ مفادات کی تکمیل کے لیے آپس میں باقاعدگی سے تعاون کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ خوارج پر تسلط جمانے، ان کا استحصال کرنے اور انھیں ناپید کرنے کے درپے بھی ہو سکتے ہیں جیسا کہ میرے بچپن کے ایام میں آسٹریا میں ہوا تھا۔ شراکتی نظام میں مقابلہ بھی ہوتا ہے لیکن اس مقابلے کا انداز تعمیری ہوتا ہے۔ تخریبی نہیں ہوتا۔ اس میں فریقین دوسرے کی کامیابی سے تحریک اور اثر لے کر خود بھی آگے بڑھنے کی سعی کرتے ہیں، تسلطی انداز میں ہر دم دوسرے کو ذلیل کرنے، اسے برباد کرنے یا بازار سے اس کا بوریا بستر گول کرانے کے چکر میں نہیں رہتے۔

ان دونوں قسم کے نظامات میں طاقت کی تعریف اور اس کا اطلاق بھی مختلف طور سے کیا جاتا ہے۔ میں نے اپنی تصنیف The Chalice and The Blade میں بلیڈ کو تسلطی نظام میں طاقت کے ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے جو ایسی طاقت کی علامت ہے جو دوسروں کو تسخیر کرتی ہے، دوسروں کا استحصال کرتی ہے اور دوسروں کی جان لیتی ہے۔ شراکتی نظام میں طاقت کا استعارہ چیلس یعنی کاسہ ہے جو دیا کی، دان کی اور روشنی کی قدیمی علامت ہے۔ طاقت کے اس خاص طور پر نسوانی تصور کی طرف منتقلی کا تسلطی درجہ بندیوں سے شراکتی درجہ بندیوں کی طرف منتقلی سے گہرا تعلق ہے جن میں محاسبہ، احترام اور فائدہ فقط نیچے سے اوپر کی طرف نہیں بہتا بلکہ دوطرفہ رواں رہتا ہے۔

اب دیکھ بھال کرنے والی ممتا کے آدرش سے منسوب طاقت کا تصور رواج پا رہا ہے۔ اس کی عکاسی قیادت و نظامت کے معاصر لٹریچر سے بخوبی ہوتی ہے جو یہ بتاتا ہے کہ ایک اچھا منیجر کوئی کوتوال یا نمبردار نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسا ادارہ ہوتا ہے جو ہماری اعلیٰ ترین صلاحیتوں کی آبیاری کرتا ہے۔ انھیں تحریک و جلا دیتا ہے اور ان کی نمو کے لیے کوشش کرتا ہے، ان خاص طور پر نسوانی اوصاف......خواہ یہ خواتین میں ہوں یا مردوں میں...... کی قدر افزائی ہماری بعد الصنعتی معیشت کے لیے بہت اہم ہے۔ یہ معیشت ایک تخلیقی و اختراعی اور لچک دار افرادی قوت کی متقاضی ہے اور ایسی افرادی قوت کے لیے ایسے قائد اور ناظم انتہائی ضروری ہیں جو دوسروں کو طاقت دیں، انھیں طاقت سے محروم نہ کریں۔

ان موضوعات پر مزید تفصیلات کے لیے آپ میری درج ذیل کتب کا مطالعہ کر سکتے ہیں:

1. The Chalice and The Blade
   (San Francisco: Harper & Row, 1987)
2. The Power of Partnership
   (Novato, California: New World Library, 2002)

1960ء سے لے کر اب تک تحفظ ماحول، حقوق نسواں، حقوق اطفال، معاشی انصاف اور ایک زیادہ متوجہ اور کم متشدد شراکتی نظام کے لیے جدوجہد کرنے والے افراد اس نوع کی تنظیموں کو ایک پلیٹ فورم کے طور پر استعمال کرتے چلے آئے ہیں لیکن ایسی ہی تنظیموں کو استعمال کرتے ہوئے دہشت گرد، منشیات کا دھندا کرنے والے گروہ اور دیگر ایسے منفی عناصر ہمیں دوبارہ ایک زیادہ متشدد، آمرانہ اور مرد سالاری طرز زندگی کی طرف دھکیلنے کی کوشش بھی کرتے آرہے ہیں اور اس رجحان میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ بھی دیکھنے میں آرہا ہے۔

آج کے دور میں القاعدہ جیسی بنیاد پرست دہشت گرد تنظیموں نے ایک نئی قسم کے جنگ و جدال کی طرح ڈال دی ہے جنھیں تجزیہ نگار ''تنظیمی جنگوں'' کا نام دے رہے ہیں۔ روایتی جنگوں کے برعکس یہ تنظیمی جنگیں ملکوں کے درمیان نہیں لڑی جاتیں گرچہ بعض ممالک ایسے ضرور ہیں جو ایسی تنظیموں کو اسلحہ اور دیگر جنگی ساز وسامان فراہم کرتے ہیں مثلاً ایران، لبنان کی تنظیم حزب اللہ کو۔ یہ تنظیمی جنگیں فوجیوں کے درمیان لڑی جانے کی بجائے عام شہریوں کو نشانہ بناتی ہیں۔ مزید برآں چونکہ دہشت گرد تنظیموں نے اپنے ٹھکانے اور تربیتی مراکز شہری آبادیوں میں پھیلا رکھے ہیں ان کے گردونواح میں بسنے والے عام شہریوں کو نقصان پہنچائے بغیر ایسی تنظیموں کے خلاف لڑنا بہت مشکل بلکہ قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے۔

جیسے کہ ڈیوڈ ران فیلٹ اور جان آرکلا نے ''تنظیمیں، تنظیمی جنگیں اور مستقبل کے لیے پیکار'' میں لکھا ہے، یہ تنظیمی مظہر نہ صرف ایک روشن پہلو بلکہ ایک تاریک پہلو کا بھی حامل ہے۔ جیسا کہ یہ حضرات بھی اپنی اس تحریر میں اس بات کی تائید کرتے ہیں ہماری اس پیچیدہ دنیا میں اس نوع کی تحریکات کی طاقت اور تعداد میں ایک نئی تنظیمی شکل کے طور پر اضافہ ہوتا چلا جائے گا

MashalBooks.com

اور یہ کہ انٹرنیٹ جیسی جدید انفارمیشن ٹیکنالوجیز اس رجحان کو اور بھی تقویت دے رہی ہیں جن سے بغیر خطیر رقوم خرچ کیے تنظیمی جال کو وسعت دی جا سکتی ہے۔ 27 لیکن اصل سوال یہ نہیں ہے کہ یہ دنیا سماجی ڈھانچہ آگے چلے گا کہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ آیا اسے شراکتی اہداف کے لیے استعمال کیا جائے گا یا کہ تسلطی اہداف کے لیے۔

یہ بات ہمیں ان عوامل کی طرف واپس لے جاتی ہے جو شراکتی یا تسلطی ڈھانچوں کی خصلت متعین کرتے ہیں۔ مکانات اور دیگر عمارات جیسے طبیعی ڈھانچوں کے برعکس معاشی و معاشرتی ڈھانچے مادی عناصر پر مشتمل نہیں ہوتے۔ معاشی و معاشرتی ڈھانچوں کو ان کا امتیازی وصف ودیعت کرنے والے عناصر کسی ثقافت کے اعتقادات، عادات، روایات، اصول، قوانین اور زبان پر مشتمل ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر تسلطی زبان میں مردوں اور عورتوں کے درمیان تعلقات کی وضاحت کیلیے صرف دو اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ ایک پدرائیت اور دوسری مادریت۔ یہ اصطلاحات تسلطی ڈھانچے کے دو متغیرات کی وضاحت کرتی ہیں۔ ہماری روایتی زبان میں ان تعلقات کے کوئی شراکتی مترادفات نظر نہیں آتے۔

ان کے وسیع تر ثقافتی سیاق و سباق کے پیش نظر ہم شراکتی یا تسلطی معاشی اور معاشرتی ڈھانچوں کو ان کی ظاہری شکل و صورت سے بیان نہیں کر سکتے۔ ہمیں ان کی رہنما اقدار کو بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے جو خود بھی اس ثقافت یا ذیلی ثقافت میں پیوست ہوتی ہیں جس کا وہ حصہ ہوتی ہیں۔

ہم ان باہم متعامل حرکیات کا آئندہ ابواب میں مزید جائزہ لیں گے اور اس بات کا بھی کہ ہمارا معیار زندگی، ہماری خوشی اور ہمارا قدرتی ماحول ان سے کس طرح براہِ راست اثر قبول کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم معاشیات کا اس کے وسیع تر سماجی پس منظر میں مطالعہ بھی جاری رکھیں گے۔

باب ششم

تسلطی معاشیات

بعض لوگ سرمایہ دارانہ نظام کو ایک خون آشام عفریت خیال کرتے ہیں اور اسے سب طرح کی ناہمواری اور استحصال کا موجب گردانتے ہیں۔ وہ ہمارے تمام مسائل کا الزام اسی سرمایہ دارانہ نظام کے سر تھوپتے ہیں اور دلیل کے طور پر ان بڑے کاروباری اداروں یا کارپوریشنوں کی مثال پیش کرتے ہین جو روز بروز ہمارے سیارے کی آلودگی میں اضافہ کر رہے ہیں، اپنے ملازمین کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں بلکہ ساری قوم کے ساتھ اور اس کے حصص میں پیسہ لگانے والوں سے بھی لیکن دیکھا جائے تو یہ عفریت سرمایہ داری نہیں بلکہ اس کی تہہ میں کارفرما وہ تسلطی عقائد، اقدار اور روایات ہیں جو ہمیں ورثے میں ملی ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ ظالمانہ اور حریص سرمایہ دارانہ حیلے انسانی معاشرے کو بہت ضرر پہنچاتے ہیں لیکن کیا ہمیں یاد نہیں کہ آج کے دور کے ارب پتی ساہوکاروں سے بہت پہلے مصر کے فرعون اور چین کے قدیم شہنشاہ بھی اسی وتیرے پر عمل کر کے دولت کے انبار اکٹھے کرتے رہے ہیں۔ ہندوستان کے راجے، مہاراجے اور سلطان سونے اور چاندی کی صورت میں خراج وصول کیا کرتے تھے جبکہ ان کی پرجا خصوصاً چھوٹی جاتیوں کے لوگ فلاکت و ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ مشرق وسطیٰ کے حکمران اپنے ہی لوگوں پر ظلم و جور کے تازیانے برساتے تھے اور ان پر طرح طرح کے قہر ڈھاتے تھے۔ یورپ کے جاگیردار اور سردار اپنے لوگوں کو تنگ کرتے اور آس پاس کے علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کرتے تھے۔

ان تمام سرمایہ دارانہ معاشروں میں یہ تصور کرنا کہ ''عام آدمی'' اپنے سے ''اعلیٰ'' مرتبے

کے افراد کے برابر ہوسکتا ہے، ناممکن تھا۔ معاشی استحصال کو زندگی کی ایک حقیقت سمجھ کر قبول کیا جاتا تھا اور اسی طرح عوام کی بدحالی کو بھی جن کو صرف اخرئی کے سبز باغوں پر ٹرخانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ تاہم ہر جگہ اور ہر سمے صورت حال ایسی نہیں رہی۔ پہلے ادوار میں اسی کرۂ ارض پر زیادہ عادلانہ ثقافتوں کا وجود بھی رہا ہے مثلاً منوآن تہذیب کی مثال ہی لے لیجیے جس نے 1400 قبل مسیح کے لگ بھگ بحیرہ روم کے جزیرے کریٹ میں نشو ونما پائی۔ قبل از تاریخ کی حرفتی اعتبار سے ترقی یافتہ اسی تہذیب کی بدولت قدیم عہد کے یونانیوں میں جمالیت پسندی، فن تعمیر، فنون لطیفہ اور دیگر تہذیبی اوصاف پیدا ہوئے۔ منوآن اپنے دور کے بہت بڑے فنکار اور تاجر تھے۔ انھوں نے ایک بہت خوشحال اور متمول معاشرے کی بنیاد رکھی جس میں بسنے والے افراد کا معیار زندگی بہت بلند تھا۔

گو ہم منوآن کریٹ کے معاشرے کو مثالی معاشرہ قرار نہیں دے سکتے، پھر بھی ہمیں اس میں شراکتی نظام کے بہت زیادہ عکس نظر آتا ہے۔ اکثر مؤخر تہاذیب کے برعکس، منوآن کریٹ ایک غلام معاشرہ نہیں تھا۔ جزیرے پر آباد مختلف مدنی ریاستوں کے مابین کسی جنگ و جدال کے آثار نہیں ملتے۔ ان میں رہنے والے مرد اور خواتین برابری و مساوات کی بنیاد پر ایک دوسرے سے ہم آہنگی سے ایک مطمئن و مسرور زندگی گزارتے تھے۔ اس خطے کی عمارات پر کندہ تصاویر اس عہد کی عورت کی بلند حیثیتی کی آج بھی گواہ ہیں۔ ایسی ہی ایک شبیہ میں ایک بڑی کاہنہ دکھائی گئی ہے جسے بقیہ کاہن اور کاہنائیں مے و میوہ جات کے نذرانے پیش کر رہے ہیں۔ من موہنا منوآن آرٹ اس ثقافت میں بسنے والے لوگوں کے فطرت اور حسن فطرت سے انس کی بھی بڑی اچھی عکاسی کرتا ہے۔ یونانی ماہر اثریات نکولاس پلاٹن رقم طراز ہے کہ ''فطرت کی دیوی میں واثق ایمان زندگی کے ہر رگ و پے میں رواں دواں تھا اور یہی تمام تناسب، تخلیق اور آہنگ کا سرچشمہ تھا۔''(2)

منوآنیوں کی جگہ بعد میں مائسینیوں نے لے لی جن کے قصے ہم یونان کے قدیم اندھے شاعر ہومر کی رزمیہ منظومات میں پڑھتے ہیں۔ اگرچہ مائسینیوں نے منوآن تہذیبوں کے بعض خصائل کو اپنی ثقافت کا حصہ بنا لیا مگر بنیادی طور پر وہ ایک جنگجو ثقافت کے مالک تھے جس میں تجارت کی بجائے دولت کو لوٹ مار سے جمع کرنے کا قاعدہ مروج تھا۔ مائسینیوں کو عروج ملا اور پھر زوال مگر ان کے بعد سرزمین یونان پر خونیں جنگوں اور ثقافتی انحطاط کا ایک ایسا دور در آیا

جسے مؤرخین یونان کے عہد تاریک کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جب ایتھنز اور یونان کی دیگر شہری ریاستوں میں یورپی تہذیب ایک دفعہ پھر نئے سرے سے استوار ہونا شروع ہوئی تو اس کا چلن کچھ اور ہی تھا۔ اس میں منوآن ثقافت یا شراکت مائل دیگر قدیمی تہاذیب والی کوئی بات نہ تھی۔

ہمارا سفاک معاشی ورثہ:

ہم قدیم ایتھنز سے منتقل ہونے والے ورثے پر بڑا ناز کرتے ہیں اور یہ رویہ نسل در نسل ہمیں سکھایا جاتا ہے۔ یقیناً اس کہنہ مغربی تہذیب کے بعض بہت زبردست پہلو بھی ہیں جن پر ہمیں ناز کرنا بھی چاہیے لیکن اس ثقافت فاخرہ کے بعض تاریک پہلو بھی ہیں جن کا پتہ ہمیں ایتھنی اقتصادیات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے۔

ایتھنی معیشت کی اساس بنیادی طور پر خاندان تھا اور خاندان سخت تسلطی درجہ بندیوں کی بنیاد پر استوار تھے۔ وہاں بچے سربراہ خاندان کی ملکیت تصور ہوتے تھے اور اسی کا فیصلہ چلتا تھا کہ نئی پیدا ہونے والی روح کو زندہ رہنے دیا جائے یا کہ مار دیا جائے۔ اگر تو لڑکا ہوتا اور سلیم الاعضا ہوتا تو اس کی پرورش ہوتی لیکن اگر بچی ہوتی تو اسے ماں کی گود سے چھین کر موت کی بانھوں کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ بچے کا سیدھا سیدھا قتل قانوناً ممنوع تھا لیکن کاش ممنوع نہ ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ بچی کو چھری، چاقو سے مارنے یا اس کا گلا گھونٹنے کی بجائے اس دور کے یونانی کیا کرتے تھے کہ اسے بھوک یا پالے سے مرنے کے لیے بے سہارا چھوڑ دیتے تھے یا پھر اسے ایتھنز کی کم سن طوائفوں کے قبیلے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔

اگرچہ قدیم یونان سے متعلق بیشتر کتب میں اس کا ذکر نہیں ملتا، ایتھنز کی زبان زدعوام جمہوریت میں غلامی کا ادارہ بھی موجود تھا۔ صرف آزاد اور صاحب جائیداد افراد ہی انتخابات کے موقعے پر حق رائے دہی استعمال کر سکتے تھے اور کسی عہدے پر فائز ہو سکتے تھے۔ بقیہ عوام، غلاموں اور عورتوں (جو غلام نہ تھیں) کے پاس کوئی سیاسی حقوق نہ تھے اور شہری حقوق بھی بمشکل ہی ہوں گے۔

☆ شراکت وتسلط کا یونانی پلاؤ:

قدیم تاریخ کی بیشتر کتب ہمیں بتاتی ہیں کہ پہلی یورپی تہذیب یونان میں نام نہاد یونانی عہد تاریک کے بعد نمودار ہوئی۔ تاہم جیسا کہ نکولاس پلاٹن جا کیٹا ہاکس، جے وی لیوس اور دیگر محققین بتاتے ہیں، ماسینی ادوار میں حکومت کرنے والے آکیائی حملہ آور اور ان کی جگہ لینے والے ڈوری سردار اپنے مفتوحین کی بیشتر مادی و روحانی ثقافت کے انجذاب کے بعد آگے بڑھے۔(3)

لیوس لکھتا ہے: ''آگ میں جلے کسی شجر زیتون کی مانند منوآن ثقافت کچھ وقت کے لیے خوابیدگی میں چلی گئی اور پھر ماسینی دیواروں کی چھاؤں تلے اس نے ایک بار پھر برگ و بار نکالنے شروع کر دیے...... منوآن شہزادیوں (دختران اطلس) ماسینی سرداروں کے گھروں کی زینت بنیں، منوآن معمار صدری یونان کے محلات کی تعمیر اور پھر فن مصوری سے ان کی زیب وزیبائش کرتے رہے اور یونانی کو ایک تحریری زبان کا درجہ بھی منوآن کاتبین کے ہاتھوں حاصل ہوا۔''

ڈوریوں کی تباہ کاریوں کے باوجود، لیوس کہتا ہے، سب کچھ فنا نہیں ہوا۔ لیکن بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہیرا، ایتھینا اور ایفرو ڈائیٹ جو کبھی بذات خود بہت طاقتور دیویاں شمار ہوتی تھیں، اب یونان کی سرکاری دیومالا میں آ کر خدائے زیوس کے زیر نگیں ہو گئیں۔ بہت کچھ فراموش کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ منوآن تہذیب کی یاد بھی رفتہ رفتہ مدھم ہو کر ایک داستان کی شکل اختیار کر گئی۔ لیکن اس سب کے باوجود اس یونانی تہذیب میں ایسے عناصر موجود تھے جسے ہم باآسانی شراکتی زمرے میں شامل کر سکتے ہیں مثلاً حسن وفنون کی محبت، جمہوریت کے ضمن میں تجربات اور فلسفیانہ دانش کی توقیر وغیرہ۔

باایں ہمہ قدیم ایتھنز کی معاشرت پر غلبہ تسلطی نظام کا ہی رہا۔ وہی صعودی معاشی و معاشرتی ڈھانچے ان میں مضمر وہی ظلم و تشدد، مردوں اور ''مردانگی'' کا خواتین اور ''نسوانیت'' پر تفوق اور تسلط و تشدد کی قدر افزائی کرنے والے وہی عقائد و حکایات۔ (5)

ایسے بعض غلاموں کا ذکر ضرور ملتا ہے جن کے پاس کچھ نہ کچھ آزادی تھی یا جن کی کچھ نہ کچھ عزت تھی لیکن زیادہ کا حال پتلا ہی تھا اور انھیں بڑے مصائب کی زندگی بسر کرنا پڑتی تھی۔ یونانی مصنف ڈیموستھینز کے مطابق ایتھنز میں ایک سرکاری عقوبت خانہ بنایا گیا تھا جس میں

MashalBooks.com

مقدمات کے دوران غلاموں کو اذیت کا نشانہ بنایا جاتا تھا کیونکہ کسی غلام کی گواہی عدالت کے حضور تبھی منظور ہوتی تھی کہ اگر یہ تشدد کے تحت دی گئی ہو۔ غلام اکثر اپنے مالکوں کے گھروں اور کھیتوں میں کام کرتے تھے اور کانوں میں بھی جہاں حالات اس قدر ابتر ہوتے تھے کہ اکثر و بیشتر ایک سال کے اندر اندر ان کی موت واقع ہو جاتی تھی۔ ایتھنز کے مشہور زمانہ جنگی جہازوں کی ناخدائی کا پرمشقت کام بھی یہی غلام کرتے تھے اور یہاں بھی انھیں جنگ اور غرقابی کی صورت میں بے وقت کی موت کو گلے لگانا پڑتا تھا اور کیسی زبردست بات کہ گھروں میں کام کرنے والے غلاموں کے منہ پر لکڑی کا ایک ایسا شکنجہ کس دیا جاتا تھا جو نگلنا ان کے لیے ناممکن بنا دیتا تھا۔ یہ گت بے چاروں کی اس لیے بنائی جاتی تھی کہ کہیں وہ چلتے پھرتے یا پکاتے پروستے خوراک کا کوئی لقمہ اپنے حلق سے نیچے نہ اتار لیں۔(6)

جہاں تک عورتوں کی بات ہے تو خال خال ایسی بعض خواتین کا تذکرہ ملتا ہے کہ جنھوں نے شاعرات، فلاسفہ یا سیاسی مشیروں کی حیثیت سے مقام بنایا۔ ایسی معدودے چند خواتین مشاہیر میں ایک نام ''انیس پیسیا'' کا بھی آتا ہے جو ایتھنز کے مشہور فرمانروا پیریکلز کی معتمد خاص تھی۔

علوم یونانی کی ماہر ایوا کیولز کہتی ہیں: ایتھنز میں خواتین کو دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت بھی حاصل نہ تھی۔ ''ایک غلام کی طرح'' کیولز لکھتی ہے۔ ''عورت کو عملاً کوئی قانونی تحفظ حاصل نہیں تھا اور اگر تھا تو وہ فقط اس حیثیت میں کہ وہ اپنے مرد کی ملکیت تھی۔''7 اگر کسی عورت کو ترکے میں اپنے باپ سے کوئی جائیداد ملتی تو اسے یہ اختیار ہرگز نہیں تھا کہ وہ اسے استعمال کرے۔ اس امر کا مختار فقط اس کے والی کو تصور کیا جاتا تھا۔ درحقیقت ''معزز'' آزاد خواتین بھی کوئی ایسی آزاد نہیں تھیں۔ انھیں خواتین کے لیے مخصوص جگہوں میں رکھا جاتا تھا۔

ایتھنز میں ریاست کی طرف سے مقرر کردہ خواتین کوتوال بھی تھیں اور جیسا کہ ارسطو بتاتا ہے ان کا کام خواتین کی نقل و حرکت کو روکنا تھا تاکہ ان کی ''بکارت بچی رہے''۔ لڑکیوں کو عموماً کم سنی میں ہی بیاہ دیا جاتا تھا اور انھیں تعلیم سے محروم رکھا جاتا تھا۔ ''آزاد'' خواتین کو بھی اس امر کی مطلق اجازت نہ تھی کہ وہ مردوں کے ساتھ آزادانہ تعلقات قائم کرسکیں حتیٰ کہ اپنے گھروں میں بھی۔

لگتا ہے مرد ''معزز'' خواتین سے عام طور پر اپنے گھروں کی دیکھ بھال اور اپنے بیٹوں کی

پیدائش کا کام لیتے تھے۔ مردوں کے جنسی مراسم عموماً بیواؤں سے ہوتے تھے یا پھر وہ لونڈے بازی سے دل پرچاتے تھے۔ لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ جنس کے لیے اس تسلطی دوہرے معیار میں مردوں کو مکمل جنسی آزادی حاصل تھی اور وہ اس آزادی کا استعمال متعدد طرائق سے کرتے تھے۔ ایک طریقہ ان میں سمپوزیم کا بھی تھا۔ سمپوزیم سے کہیں وہ مفہوم نہ سمجھ لیجیے گا جو کہ آج کل بن گیا ہے۔ اس دور میں اس لفظ کا مطلب تھا اجتماعی مباشرت کی تقاریب جو مرد حضرات اپنے گھروں کے اگواڑے میں بنی مخصوص مجلسوں میں منعقد کرتے تھے۔

کنیزوں اور باندیوں کو عموماً جنسی اختلاط کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور جیسا کہ کیولز لکھتی ہے۔ ''انھیں بیواؤں کی حیثیت سے ناقابل بیان مظالم اور وحشت ناکیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان کے مالک انھیں مارتے پیٹتے، اذیتیں پہنچاتے بلکہ بعض اوقات تو نصیب جلیوں کو جان سے بھی مار دیا جاتا یا آگے کسی زیادہ بولی دینے والے کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا تھا۔''8 وہ طوائفیں جو غلام نہیں ہوتی تھیں انھیں بھی بڑی کڑی نگرانی میں رکھا جاتا تھا۔ ارسطو بتاتا ہے کہ کسبیوں کے تعین نرخ کو ایتھنز کے اہم ادارے کی حیثیت حاصل تھی۔ اس طرح گانے بجانے والیوں کے بھی سرکاری دام مقرر تھے۔ بالفاظ دیگر خواتین کو جو آزادانہ آمدن کے اکا دکا کسب دستیاب بھی تھے وہاں بھی ان کے حقوق بیع وشرا پر کڑے پہرے مقرر تھے۔

الغرض ایتھنز کے باسیوں کی ایک بہت قلیل اقلیت ہی وہاں کی شہرہ آفاق جمہوریت سے مستفیض ہو پاتی تھی۔ اکثریت، بشمول مرد غلاموں کے اور غلام و ''آزاد'' خواتین کے، اساساً آزاد مردوں کے استعمال کے لیے تھے۔(10)

لہٰذا گو ارسطو اور افلاطون جیسے یونانی فلاسفر شراکتی اقدار کا دم بھرتے تھے، اس قدیم معاشرے کا جس سے کہ ہم نے بہت سی اقدار اخذ کی ہیں، عمومی میلان تسلطی نظام کی طرف تھا۔ یہودی و مسیحی روایت پر بھی یہ بات صادق آتی ہے جن کا شمار مغربی ثقافت کے دیگر بڑے مآخذ میں ہوتا ہے۔ توجہ و احساس اور امن و آشتی یہودی و نصرانی اقدار میں قلبی حیثیت کے حامل ہیں مگر بائیبل کی بہت سی روایات وحشیانہ قبائلی معاشروں کی پیداوار ہیں۔ ہم یونانی اور یہودی و نصرانی تسلطی روایات کے اثرات مغربی معاشی منہاجات پر آج بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

MashalBooks.com

معاشی درندگی اور نااہلی:

ان میں سے ایک روایت کنٹرولِ نزولی کی ہے۔ تسلطی قبائلی معاشروں میں شیوخ اور سردار دوسروں کی نسبت زیادہ بیویوں، مویشیوں اور اراضی کے مالک ہوتے تھے۔ موخراً ان میں سے بعض بڑے سردار جنگوں کے ذریعے پیداواری وسائل بشمول مفتوحین کی محنت کے نسبتاً بڑے حصے پر قابض ہوتے چلے گئے۔ پھر جب ان افراد نے اپنا مال ومتاع اپنے بیٹوں کو اور انھوں نے آگے اپنے بیٹوں کو منتقل کیا تو اعلیٰ وادنیٰ طبقات کے درمیان کا پاٹ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔

یورپ میں یہ بالائی طبقے شاہی خانوادوں کے روپ میں ابھرے جو اپنا نسب ان جنگجو بادشاہوں سے ملاتے تھے جنھوں نے ایک لمبی چوڑی اراضی اور کثیر مال و دولت تلوار و بلم کے بل پر حاصل کیا تھا اور اعلیٰ طبقے کے یہ افراد اپنے اقتدار کی عملداری کے لیے جو قوانین تشکیل دیتے تھے ان کے سبب انھیں اپنے زیرِحکومت لوگوں کی جان وجسم کے استعمال کے پورے اختیارات حاصل ہو جاتے تھے۔ پرانے مغربی غلام معاشروں میں اور انسداد غلامی سے قبل جنوب امریکہ میں عورتوں اور مردوں کے اجسام (نیز لڑکوں اور لڑکیوں) کی خرید وفروخت قانوناً بھی جائز متصور ہوتی تھی جیسے آج کے دور میں ہم دال چاول، کرسی میز اور کپڑے کی خرید وفروخت کرتے ہیں۔ غلام چونکہ مِلک متصور ہوتے تھے انھیں جس کام کے لیے بھی مجبور کیا جاتا انھیں انجام دینا پڑتا تھا، انھیں بولنے کا کوئی حق نہیں تھا اور ظاہر ہے اس میں جنسی خدمات بھی شامل تھیں۔ انھیں کوئی قانونی تحفظ حاصل نہ تھا اور فرار کی کوشش کی صورت میں انھیں اذیت ناک سزائیں دی جاتی تھیں اور کئی کئی دن بھوکا پیاسا رکھا جاتا تھا۔ وہ خواتین جو غلام نہیں تھیں، انھیں بھی مردوں کے زیرنگیں اور زیرتسلط رہنا پڑتا تھا۔ اولاً بیٹیوں کے طور پر اور بعداً بیویوں کی حیثیت سے۔''

قرون وسطیٰ کے جاگیرداری ماحول میں بھی قانون بالائی طبقے کے افراد کو مردوں اور خواتین کی جسمانی محنت کے استعمال کی پوری اجازت دیتا تھا۔ یہ کمیرے سردار کی جاگیر پر زندگی بسر کرتے، اس کی زمین پر کاشت کرتے اور جنگ کے دوران اس کے کام آتے تھے۔ بعض اوقات سردار کو یہ اختیار بھی ہوتا تھا کہ وہ اپنے چاکر کی نئی دلہن کو پہلی رات اپنے پاس رکھے اور اس کا جنسی افتتاح اپنے ہاتھوں سے کرے۔

جاگیردار طبقے کی خواتین کا بھی کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ان کے پاس نہ تو کوئی معاشی اختیارات تھے اور نہ کوئی قانونی حقوق کیونکہ قانون کی نظر میں بیاہتا عورت کی حیثیت اس کے خاوند کی ملکیت کی تھی۔ اسے حقیقی اختیار فقط تب حاصل ہوتا تھا جب اس کا مرد جنگ کے لیے جاتا تھا جیسا کہ صلیبی جنگوں کے دوران ایلے نار آف ایکوی ٹین اور اس کی بیٹی میری کے کردار سے ظاہر ہوتا ہے۔ انگریزی قانون عامہ جو کہ بعد میں امریکی نو آبادیوں کو بھی برآمد کیا گیا، کے تحت عورت نہ تو خود کوئی مقدمہ دائر کر سکتی تھی اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی مقدمہ دائر کیا جا سکتا تھا۔ اگر کبھی اسے کوئی نقصان پہنچتا تو اس کا خاوند اس کی خدمات میں تعطلی کے ہرجانے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا تھا لیکن عورت کو خود کو پہنچنے والی کسی گزند کی تشفی طلب کرنے کا کوئی ادھیکار نہ تھا۔(13)

یہ قانونی ہتھکڑیاں عورت کے ہاتھوں میں مغربی دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کے رواج پانے کے بعد انیسویں صدی تک بھی موجود رہیں۔ حق رائے دہی اور اپنے نام پر جائیداد بنانے سے لے کر اعلیٰ تعلیم اور طب و قانون جیسے معزز پیشے اختیار کرنے تک خواتین بیشتر بنیاد، سیاسی، شہری اور ملکیتی حقوق سے پھر بھی محروم ہی رہیں۔

انیسویں صدی اور بیسویں کے اوائل کی ''قزاق ٹھاکر'' سرمایہ داریت کے ایام میں بھی عورتوں، مردوں اور بچوں سے غیر محفوظ، غیر مصفا اور غیر انسانی ماحول میں معمولی معاوضہ دے کر کئی کئی پہر جبری مشقت لی جاتی تھی اور یہاں بھی انھیں کوئی خاص قانونی تحفظ حاصل نہیں تھا۔ خاص کیا کوئی بھی قانونی تحفظ حاصل نہ تھا۔ اگر وہ بے نوا کوئی حکم عدولی یا سرتابی کرتے تو انھیں بھوکوں مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا اور اگر کبھی بغاوت کرتے یا خود کو منظّم کرنے کی کوشش کرتے تو انھیں ظلم و بیداد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔

بیسویں صدی کے اشتراکی انقلابات کے بعد بھی نزولی معاشی کنٹرول بدستور قائم رہا۔ سابق سوویت یونین میں ''مزدور آمریت'' نے بڑی سرعت سے بیشتر مرد و خواتین کے اختیارات و انتخابات پر قوت اور خوف کے بل پر قبضہ جما لیا۔ ان کی محنت، دیگر قومی معاشی وسائل کی مانند...... اب بنیادی طور پر ریاست کی ملکیت تھی جہاں ایک بار پھر بالائی طبقے کے مٹھی بھر مرد سب سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے تھے۔ بچوں، مریضوں اور معمر افراد کی دیکھ بھال اور نگہداشت کی ممد حیات رضاکارانہ نسوانی خدمات کو اب بھی مردوں کے استحقاق بلکہ

MashalBooks.com

پیدائشی حق کے طور پر لیا جاتا تھا۔ خواتین کو کیا سہانے دن دیکھنے کو ملے کہ ان پر تہرا بوجھ آن پڑا۔ پہلے گھروں میں بچوں کے جانگیے صاف کریں پھر کمیاب اشیائے ضرور یہ حاصل کرنے کے لیے گھنٹوں لمبی لمبی قطاروں میں کھڑی ہوں اور پھر وہ باہر جا کر نوکریاں بھی کریں جہاں انھیں اجرت بھی مردوں سے کم ملے۔ واہ رے انقلاب! تو نے تو بہت اچھے دن دکھلائے۔

آج کے دور میں، کم از کم اصولی سطح پر ہی سہی، کسی بھی جگہ کسی بھی شخص کو کسی دوسرے شخص کے جسم کی ملکیت اور استعمال کا کوئی قانونی حق حاصل نہیں لیکن اس کے باوجود معاشی تسلط کی روایات بڑی شد و مد سے تبدیلی کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔ غلامی کی کئی شکلیں آج بھی ایشیاء، افریقہ اور مشرق وسطٰی کے بعض حصوں میں عام دیکھنے کو ملتی ہیں۔ لاطینی امریکہ کے بہت سے مقامی باشندے اب بھی بنیادی طور پر بڑے زمینداروں کے کمیروں کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بہت سے ممالک کے کھیتوں، دفتروں اور کارخانوں میں اب بھی غیر انسانی حالات کار دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ بچوں خصوصاً بچیوں کو اب بھی تعلیم سے محروم رکھا جاتا ہے اور ان سے فجر تا شام کام لیا جاتا۔

''ترقی یافتہ'' کہلانے والے ممالک میں بھی دیکھ بھال اور نگہداشت کا سارا کام خواتین کے کندھوں پر ڈالا جاتا ہے جس کا انھیں کوئی مناسب معاوضہ بھی ادا نہیں کیا جاتا بلکہ بعض صورتوں میں تو کچھ بھی نہیں دیا جاتا۔ نہ بڑھاپے میں پینشن، نہ علاج معالجے کی سہولت اور نہ کوئی اور معاشی تحفظات۔ کاروباری اور سرکاری اداروں میں تسلطی نظام ہائے مراتب جوں کے توں نظر آتے ہیں جنھیں فطری کہہ کر ان کا جواز مہیا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور انھیں معاشی ترقی کے لیے ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہمیں ان وقتوں سے تحفے میں ملا ہے جب ہر طرف تسلطی نظام کا راج تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جدید کارگاہ کو بنایا ہی تسلطی سماجی نظام کے تقاضے پورا کرنے کے لیے گیا تھا جس میں مینجر کا کردار فورمین یا ایگزیکٹو کے طور پر نیچے والوں کو کنٹرول کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ اجارے اور مقابلے بازی رواج میں آئی۔ خواتین کو نچلے اور کم معاوضہ کاموں میں جوت دیا گیا اور توجہ و احساس کو کوئی وقعت نہ مل سکی اور اگر ملی بھی تو بس نام کی۔

بنیادی طور پر احساس اور اعتماد پر اساس کرنے والے تعلقات بھی موجود رہے کیونکہ ان کے بغیر بھی گزارہ نہ تھا اور اگرچہ ان غیر رسمی تعلقات کی مدح سرائی کی گئی لیکن طاقت و وقعت

کا اصل دارومدار رسمی عمودی ڈھانچوں میں کسی کی حیثیت و مرتبے پر ہی رہا۔ گو اس سارے میں بعض خدا خوف صنعتکار اور منیجر بھی دیکھنے میں آئے جو اپنے احساس و ہمدردی کے رویوں کے باعث معروف ہوئے، لیکن کتنے؟ یہاں آٹے میں نمک والی مثال ہی پیش کی جا سکتی ہے۔

دفتر اور کارخانے کے بارے میں یہ تصور ابھرا کہ انھیں ''آہنی'' مردانہ حربوں سے ہی چلایا جا سکتا ہے لہٰذا کارکنوں کی صحت، جان اور حاجات کے درد کو کمزوری پر محمول کیا گیا۔ مزدوروں اور ملازمین نے صنعتی مشین میں کل پرزوں کی حیثیت اختیار کر لی اور جیسا کہ تسلطی نظاموں میں ہوتا ہے ادب و جوابدہی فقط نیچے سے اوپر کی طرف اور احکام فقط اوپر سے نیچے کی طرف رواں ہونا شروع ہو گئے جن کی بے چون و چرا اطاعت واجب بلکہ فرض ٹھہری۔(14)

کاروبار چلانے کی ان غیر متوازن، خوف خیز، بے حس اور انسانیت کش روش کے انسانی خسائر بے حساب تھے لیکن کہا یہ گیا کہ یہ سب معاشی پیداواریت کے لیے لازم ہیں اور یار لوگ اس پر صاد بھی کرتے رہے۔

آج بھی بعض لوگ اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ تسلطی کاروباری ڈھانچہ اور ثقافت معاشی کامیابی کا تقاضا ہے لیکن جیسا کہ ہم نے باب سوم میں دیکھا یہ کبھی مقدس خیال کیے جانے والے اعتقادات اور ادارات طباعی، تجدد اور پیداواریت کو مہمیز نہیں دیتے بلکہ ان کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔(15)

آج کے دور میں ہونے والی متعدد تحقیقات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ تسلطی نظام کسی تنظیم کے ارتباطی وسائل میں تخفیف کرتا ہے۔ ان وسائل میں تخفیف کہ جو خصوصاً آج کے بعد الصنعتی دور میں معاشی کامیابی کے لیے انتہائی اہم ہیں۔(16) تجربی شواہد نے اس خیال کی تردید بھی کر دی ہے کہ ''نازک'' احساسات اور رویے پیداواریت کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس تحقیقات بتاتی ہیں اور یہاں میں ایک مرتبہ پھر مشی گن یونیورسٹی کی پروفیسر جین ڈٹن کے الفاظ استعمال کرنا چاہوں گی کہ لوگوں کو جب یہ احساس ملے کہ ان کا احساس کیا جا رہا ہے تو زندگی ان میں اپنی پوری جولانیوں کے ساتھ عود کر آتی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ زیادہ کاروباری پیداوار اور معاشی ترقی کی صورت میں نکلتا ہے۔

MashalBooks.com

بھوک اور افلاس کی مداومت:

جیسا کہ ہم پہلے بھی بات کر چکے ہیں تسلطی نظاموں کا ایک بہت ہی بنیادی وتیرہ خواتین اوران سے منسلک کسی بھی شے یا خصلت کی تنقیص ومحکومیت ہے۔ گذشتہ چندعشروں سے بین الاقوامی ترقیاتی پالیسی کے اعلانیہ نصب العین سے دائمی فلاکت وافلاس کا خاتمہ مشاہدے میں آ رہا ہے مگر حکام بالا اوراخبارات ان افسوسناک اعداد وشمار سے نظریں کیوں چرا لیتے ہیں کہ دنیا کے انتہائی فلاکت زدہ 1.3 بلین افراد کا 70 فیصد حصہ خواتین پر مشتمل ہے۔ 17 بھوک پراجیکٹ کی مہتمم اعلیٰ جون ہولمز کا کہنا ہے کہ اگر ہم دائمی بھوک اور افلاس کو مٹانے کے لیے حقیقی معانی میں کوئی مساعی عمل میں لانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں سب سے پہلے خواتین کے خلاف امتیاز کے وتیروں کوتبدیل کرنا ہوگا۔(18)

اس کا مطلب یہ ہرگز نہ سمجھیے گا کہ تسلطی معاشروں میں صرف خواتین ہی استحصال کی چکی میں پستی ہیں۔ مردوں کوبھی بہت بھگتنا پڑتا ہے۔ خصوصاً ان مردوں کوجن کا تعلق تسلط منارے کے زیریں حصوں سے ہوتا ہے۔

☆ کاروباری کامیابی اورتجارتی اخلاقیات:

> تسلطی معاشیات کا ایک اور پہلو اخلاقیات کا فقدان ہے۔ ''جنگ اور محبت میں سب چلتا ہے'' کی طرح ایک قدیم لاطینی کہاوت جس کا ترجمہ ''مشتری ہوشیار باش بنتا ہے'' بھی بہت مشہور ہے۔ ایسی بولیاں ہمیں ان پارینہ ادوار سے ورثے میں ملی ہیں جب کاروباری معاملات میں اخلاقیات کی بات کرنے والے شخص کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔
>
> آج کے دور میں جیسا کہ ''کاروباری اخلاقیات'' کی مدیرہ مارجوری کیلی کا کہنا ہے، ایمزان، ورلڈ کام اور ریفکو کے انہدام کی طرح کے بڑے بڑے کاروباری سانحوں کے عقب میں اخلاقیات کا فقدان کارفرما ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں میں اس بات کا احساس بڑھ رہا ہے کہ لااخلاقی کاروباری وتیروں سے نہ صرف یہ کہ مشترین، ملازمین اور قرض دہندگان کونقصان پہنچتا ہے بلکہ اس سے کمپنی کی ساکھ بھی متاثر ہوتی ہے۔ 19 ڈیوڈ کورٹن کا شمار ان لکھاریوں میں ہوتا ہے جن کی کاروباری اخلاقیات کے ضمن میں صدا سب سے زیادہ محسوس کی جا رہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس

بات کی آگہی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے کہ ''ایک صحت مند بازاری معیشت کا دارومدار محض منافعے اور مقابلے پر نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک اخلاقی و انسان دوست ثقافت اور درست سرکاری تدابیر وضوابط دونوں کا ہونا لازم ہے۔''(20)

تکلیف کی بات یہ ہے کہ متعدد مقیاسات وضوابط اب بھی غیر ذمہ دارانہ کاروباری وتیروں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کمپنیوں سے سہ ماہی مالیاتی رپورٹوں کی طلبی سے اس بات کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے کہ وہ اپنی توجہ طویل المدتی اہداف کی بجائے قلیل المدتی اہداف پر مرکوز کریں اور اس طرح اپنی پالیسیوں سے پیدا ہونے والے سماجی و ماحولیاتی خسارے کا ملبہ معاشرے پر ڈال دیں۔ جب کمپنیاں کان کنی، جنگلات کی تلفی اور خطرناک فضلات کے اخراج سے ہمارے فطری سرمائے کا ناس مارتی ہیں تو مروجہ معاشی مقیاس اور اصول انھیں ''غیر متعلقہ'' قرار دے کر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ بات انسانی اور سماجی سرمائے کی تلفی و استحصال پر بھی صادق آتی ہے۔

جب تلک معاشی مقیاس اور اصول عوام اور فطرت کو پہنچنے والے نقصان کو ''غیر متعلق'' کہہ کر اس سے صرف نظر کرتے رہیں گے کاروباری ادارے زیادہ منافعے کی خاطر کارکنوں سے قابل صرف اجناس کا سا سلوک کرتے رہیں گے اور ہم انسانوں کی صحت و تندرستی سے کھیلتے رہیں گے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ کاروبار و تجارت کی بابت گفتگو میں اب ایک بدلاؤ سا نظر آنے لگا ہے۔ جوں جوں لوگوں کے دل میں فرسودہ معاشی اصولوں کو متوجہ و اخلاقی کاروباری وتیروں کی حوصلہ افزائی کرنے والے اصولوں سے تبدیل کرنے کی ضرورت کا احساس بڑھ رہا ہے، کاروباری اداروں میں اخلاقی، طویل المیعادی اور حیات دوست فیصلے کرنے کے رجحان میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ میں تعارف میں عرض کر چکی ہوں 1939ء میں ویانا سے فرار ہونے کے بعد ہم نے کچھ عرصہ کیوبا میں بھی گزارا۔ یہاں رہ کر مجھے فلاکت و افلاس کے شکار مردوں، عورتوں اور بچوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چونکہ میرے والدین اپنا سب کچھ پیچھے آسٹریا میں چھوڑ آئے تھے، مجھے بنفس نفیس خود بھی فلاکت کا مزہ چکھنے کا موقع ملا۔ کہاں ہم ویانا میں ناز و نعم کی زندگی بسر کر رہے تھے اور کہاں نصیب نے ہمیں گندے اور بدبودار ہوٹلوں اور ہوسٹلوں کے لاسپرد کیا تھا۔ تاہم میرے والدین محنت کر کے ہوانا میں بھی ایک کامیاب کاروبار استوار کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ہماری زندگی میں سدھار آنا شروع ہو گیا لیکن پھر بھی میں اپنے آس

پاس مفلس و بے حال لوگوں کا کرب مشاہدہ کرتی تھی۔ دوسری طرف کیوبا کے وہ امراء و زردار تھے جو ٹھاٹھ کی زندگیاں بسر کرتے تھے اور عالی شان بنگلوں میں رہتے تھے۔ ان میں کیوبا کے اس وقت کے صدر بتستا جیسے بددیانت اور حرام خور افراد بھی شامل تھے۔ آئے روز ایسے ایسے کنبے میرے مشاہدے میں آتے تھے جنھیں لال بیگوں اور سنڈیوں سے پر ایک ایک کمرے کے بلوں میں گزران کرنا پڑتی تھی، بازاروں میں بھیک مانگتے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے نظر آتے تھے اور میں ہوانا کی گودیوں میں بڑی بڑی گانٹھیں کمر پر لادے بزرگوں کو دیکھتی تھی لیکن یہ سب دیکھ کر میرے دماغ میں جو سوچ پیدا ہوتی وہ یہ تھی کہ ان سب سے زیادہ بار تو بے چاری ان عورتوں کی کمر پر ہے جو صبح تا شام نوکرانیوں، درزنوں اور بھکارنوں کا کام کرتی ہیں اور پھر میری نظر ہوانا کی بدنام زمانہ ہیرا منڈی میں رہنے والی طوائفوں کی حسرت ناک زندگی کی طرف چلی جاتی تھی جن کا حال سب سے ابتر تھا اور جن کو اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے یہ سب ذلیل دھندے کرنا پڑتے تھے۔

ترقی پذیر ممالک میں ہزاروں لاکھوں خواتین کا اب بھی یہی حال ہے۔ ان سے اب بھی مردوں کے مقابلے میں زیادہ کام کرایا جاتا ہے اور افریقی عورتوں کی طرح بہت سی خواتین کو تو سر پر پانی کے بڑے بڑے مٹکے اور ایندھن کی لکڑی لاد کر لانے جیسا جانکاہ عمل بھی سرانجام دینا پڑتا ہے لیکن اس کے باوجود افریقہ میں بھی جن کنبوں کی سربراہ خواتین ہیں ان کا حال سب سے پتلا ہے۔

بین الاقوامی سطح پر بازاری معیشت میں خواتین کو ایک ہی نوعیت کے کام کی انجام دہی پر مردوں کی نسبت اوسطاً دو تہائی سے لے کر تین چوتھائی کم اجرت ملتی ہے۔ مریضوں اور بزرگوں کی دیکھ بھال، خانہ داری، سینے پرونے، کھیتی باڑی، آب برداری، ہانڈی روٹی اور باہر سے لکڑیاں جمع کر کے لانے کے جیسے ان کاموں کو جنھیں خواتین گھروں میں سرانجام دیتی ہیں، معاشی طور پر پیداواری خیال نہیں کیا جاتا لہٰذا معاشی پالیسیوں میں ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔

امریکہ جیسے متمول ملک میں بھی مادر سری گھرانوں کا نمبر معاشی مخروط میں سب سے نیچے آتا ہے۔ اس کا ایک ماحصل یہ ہے کہ یہاں پانچ میں سے ایک بچہ غربت کا شکار ہے جو کہ صنعتی ممالک میں طفلانہ غربت کی سب سے زیادہ شرح ہے۔ 21 اس کے علاوہ سنیے کہ

امریکہ کے مردم شماری کے ادارے کے مطابق 65 سے زائد عمر کی خواتین میں شرح افلاس اس عمر کے مردوں کی شرح افلاس سے لگ بھگ دوگنا ہے۔(22)

اس حقیقت کو کہ عالمی غربت و افلاس کا بڑا نشانہ خواتین اور بچے بنتے ہیں، نہ تو اتفاقیہ کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی ناگزیر۔ یہ درحقیقت ان سیاسی اور معاشی نظاموں کا شاخسانہ ہے جن پر تسلطی چھاپ اب بھی بہت گہری ہے۔ مثال کے طور پر یہ امر کہ امریکہ جیسے مالدار ملک میں بھی معمر خواتین اور معمر مردوں کے مابین غربت و افلاس کی شرح کا اسی قدر تفاوت ہے، اس بات کا غماز ہے کہ سرکاری اور کاروباری پالیسیاں معمر عورتوں کو مساوی سوشل سیکیورٹی، پینشن اور بعداز ملازمت وظائف کے ذریعے تحفظ فراہم کرنے میں ناکام ہوگئی ہیں۔

اگر ہم مالی وسائل کی تخصیص کا جنسی تناظر سے جائزہ لیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ خواتین اور بچوں کی غربت کلیدی حوالوں سے سیاسی و معاشی ترجیحات کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ یہ شاخسانہ خاص طور پر سرکاری، کاروباری اور عائلی بجٹوں کے غلط استعمال کا ہے جن میں مردوں کو فائدہ پہنچایا جاتا ہے اور خواتین سے امتیاز برتا جاتا ہے اور یہ وہ بجٹ ہیں جنھیں اب بھی مردوں، عورتوں دونوں کی ایک بڑی اکثریت ٹھیک سمجھتی ہے۔

غریب اقوام میں یہ امتیازات زیادہ واضح نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر بہت سے افریقی اور ایشیائی ممالک میں مردوں پر کیے جانے والے تعلیمی اخراجات کا حجم عورتوں پر کیے جانے والے تعلیمی اخراجات کے حجم کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ یہی حال طبی سہولیات اور دیگر عوامی خدمات پر کیے جانے والے اخراجات کا ہے۔ ماہر معاشیات مونی مکرجی کا کہنا ہے کہ ''امن وامان قائم رکھنے پر آنے والے اخراجات کا بیشتر حصہ عورتوں کی بجائے مردوں پر صرف کیا جاتا ہے کیونکہ عورتوں میں مجرمانہ سرگرمیوں کا رجحان مردوں کی نسبت کم ہوتا ہے......اس طرح معاشی خدمات پر اٹھنے والے مصارف کا بہت بڑا حصہ بھی مردوں کو چلا جاتا ہے۔ 23 دوسرے لفظوں میں جن شعبوں میں مرد سرگرم ہیں ان پر زیادہ مال خرچ کیا جاتا ہے۔ گھر کے اندر وسائل کی تخصیص میں بھی یہی رویہ روا رکھا جاتا ہے جو معاشی و انسانی ترقی کی رفتار کم ہے۔

خاندانی معاشیات:

خاندانی معاشیات کو روایتی تجزیاتی میں اب بھی نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ خاندان کو وسیع تر معاشی و سیاسی نظام کی بانگی کی بجائے پیداوار یا صرف کی ایک اکائی تصور کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیشتر تجزیات عائلی وسائل کی تخصیص پر غور نہیں کرتے۔ ایک عام مفروضہ یہ ہے کہ خاندان کا نرینہ سربراہ ہی اس کا بڑا ان داتا ہوتا ہے۔ تاہم یہ مفروضہ سائنسی تحقیقات سے سامنے آنے والے حقیقت سے چشم پوشی کرتا محسوس ہوتا ہے۔

وہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے بہت سے فلاکت زدہ خطوں میں مردوں کی بجائے عورتیں غذا، صحت اور خاندانی زندگی کی دوسری اہم اشیائے ضروریہ کی بنیادی کفیل ہیں۔ 24 بلکہ بہت سے خاندانوں میں تو عورت واحد کفیل کا کردار بھی سرانجام دے رہی ہے۔ بیشتر افریقی ممالک میں کھیتی باڑی کا فریضہ خواتین ادا کرتی ہیں جن سے ان کے گھر والوں میں دال روٹی چلتی ہے۔ وہ یا تو ان بیاہتا مائیں ہیں اور یا پھر ان کے خاوندوں نے شہروں میں جا کر دوسری بیویاں کر لی ہیں۔

گزشتہ عشروں کے دوران اس بات کی آنک کے لیے تحقیقات عمل میں لائی گئی ہیں کہ ایک میاں بیوی والے گھرانے میں معاشی وسائل کو کیسے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ان تحقیقات سے اس مسئلے پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ تسلطی مفروضے اور پالیسیاں انسانی و معاشی ترقی کی راہ میں کیسے حائل ہوتی ہیں۔

جیسا کہ جوڈتھ بروس اور ڈیزی ڈائر اپنی کتاب ''منقسم گھرانہ'' میں لکھتی ہیں یہ بہت عام ہے کہ ثقافتی روایت مرد کے زرخرچ رکھنے اور صرف کرنے کے استحقاق کی حمایت کرتی ہے جبکہ خواتین کی آمدن کے بارے میں تصور کیا جاتا ہے کہ یہ اجتماعی مقاصد کے لیے ہے۔ 25 کثیر النوع ثقافتوں اور مختلف آمدنی کے حامل گروہوں پر تحقیقات سے یہ شواہد بھی سامنے آئے ہیں کہ خواتین میں مردوں کی نسبت ان اشیاء پر پیسہ صرف کرنے کا رجحان زیادہ ہوتا ہے جن سے بچوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور ان کی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔(26)

یہ رجحان کس سطح کا ہوتا ہے اس کا اندازہ ڈنکن ٹامس کی رپورٹ ''خاندانی وسائل کی تخصیص'' سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی تحقیق کہتی ہے کہ ''برازیل میں کسی مقامی عورت کے

پاس ایک ڈالر بچے کی زندگی پر وہی اثرات چھوڑتا ہے جو کہ مرد کے پاس 18 ڈالر چھوڑتے ہیں۔'' 27 اسی طرح بروس اور لائیڈ کی تحقیق بتاتی ہے کہ ''گوئٹے مالا میں کسی ماں کے پاس ماہانہ 11.40 ڈالر اضافی سے بچے کے وزن میں اس قدر اضافہ ہوتا ہے جتنا کہ باپ کے ماہانہ 166 ڈالر اضافے کمانے سے۔''(28)

یہ ٹھیک ہے کہ بہت زیادہ دوسری ثقافتوں میں بھی ایسے مرد ہوتے ہیں جو اپنے کنبے کی ضروریات کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں لیکن عمومی طور پر ایسے معاشروں میں مردوں کی ذہنی تربیت اس طرح کی ہو چکی ہوتی ہے اور ان کے تحت الشعور میں یہ بات بیٹھ چکی ہوتی ہے کہ وہ اپنی آمدن کو غیر عائلی مقاصد جس میں شراب نوشی، تمباکو نوشی اور قمار بازی وغیرہ بھی شامل ہے، کے لیے بھی جیسے چاہیں استعمال کرنے کا پورا استحقاق اور اختیار رکھتے ہیں اور اگر ان کی عورتیں ان کے اس رویئے کی شکایت کریں تو انھیں ڈانٹ ڈپٹ برداشت کرنا پڑتی ہے۔ جیسا کہ انڈونیشیا کے ادارے ورلڈ وژن کی سربراہ ڈاکٹر انوگرہ پیکرتی لکھتی ہیں، بہت سے باپ اپنی فوری جائز و ناجائز خواہشات کو اپنے بچوں کی زندگی کے لیے ضروری حاجات پر ترجیح دینے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔(29)

لیکن روایتی معاشی نظریات، خواہ وہ سرمایہ دارانہ ہوں یا اشتراکی، کی بنیاد یہ ہے کہ مرد سربراہ خانہ اپنے زیر اختیار وسائل کو صرف اور صرف سب افراد خانہ کے بہترین مفاد میں ہی استعمال کرے گا۔ ان روایتی تجزیات میں کہ جو خاندان کو ایک اکائی کے طور پر لیتے ہیں، یہی مفروضہ کارفرما ہے اور پسماندہ ممالک کے عوام کو دی جانے والی امداد کا بڑا حصہ بھی اسی وجہ سے مردوں کو تھما دیا جاتا ہے۔

ترقیاتی امداد کے پروگرام اب بھی زیادہ تر فنڈ ایسے اعلیٰ سطحی منصوبوں کو دیتے ہیں جن میں خواتین کو کوئی شنوائی حاصل نہیں اور جن سے غریب خواتین اور بچوں کو بہت کم فائدہ پہنچتا ہے۔ چھوٹے قرضوں اور دیہی قرضہ جات کے پروگرام، جن کا خصوصی ہدف خواتین اور خواتین کی بہبود و ترقی ہے، بھی بہت ہی معمولی اقدار تو فراہم کر رہے ہیں۔ بینکوں کے بڑے قرضے بالائی طبقے کے مردوں کے تحت چلنے والی کمپنیوں اور مرد سربراہان خانہ کو چلے جاتے ہیں۔

ترقی یافتہ اقوام کی طرف سے ترقی پذیر ممالک کو انسانی ہمدردی کے تحت دی جانے والی

بیشتر سرکاری امداد انجام کار بالائی طبقے کے چند گنے چنے افراد کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے جسے وہ سوئٹزرلینڈ کے بینکوں میں جمع کراتے ہیں، اپنے محلات کی تعمیر پر خرچ کرتے ہیں یا پھر اپنی تجوریوں کا پیٹ بھرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اگر امداد براہِ راست غرباء تک چلی بھی جائے تو اکثر اوقات یہ مردوں کی جیبوں میں ہی پہنچتی ہے جو اسے اپنے کنبے کی بجائے اپنی ذات پر خرچ کرتے ہیں اور اس کے عام معیار زندگی پر پڑنے والے اثرات کو باآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔

میں ایک مرتبہ پھر یہ بات زور دے کر کہنا چاہوں گی کہ یہ سب جو میں یہاں بتا رہی ہوں اس کا مطلب دنیا کے تمام معاشی مسائل کا الزام مردوں کے سر دھرنا نہیں ہے۔ ہمیں ایک ایسے نظام سے واسطہ ہے جس میں عورت اور مرد دونوں کے ذہن میں یہ بات ڈالی جاتی ہے کہ نوع بشر کا ایک نصف دنیا میں خدمت کرانے کے لیے بھیجا گیا ہے اور ایک نصف خدمت کرنے کے لیے اور یہ کہ ماں کو خاندان کی ضروریات اور خواہشات کو اپنی ضروریات اور خواہشات پر اولیت دینی چاہیے اور باپ کو ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

یہ دہرا معیار نر۔اعلیٰ، مادہ۔ادنیٰ کے اس تصور سے جنما ہے جو ہمیں عصر رفتہ کی زیادہ کٹر تسلطی ثقافتوں سے ورثے میں ملا ہے۔ یہ صرف خواتین کو ہی چرکا نہیں لگاتا بلکہ یہ تمام قسم کے امتیازات کو...... خواہ وہ نسلی ہوں، گروہی ہوں، یا کہ مذہبی...... فضیلت و تحقیر، خدمت و مخدومیت اور حاکمیت و محکومیت کے متوازی دیکھنے کی ایک نظیر فراہم کرتا ہے۔

تسلطی نظام میں شراکت و مساوات نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس میں صرف دو ہی راہیں ہوتی ہیں یا تو آپ تسلط جما لیتے ہیں اور یا پھر آپ پر تسلط جما لیا جاتا ہے۔ بلاشبہ اس نے انسانی تعلقات پر بہت تباہ کن اثرات مرتب کیے ہیں اور ایک غیر مؤثر و بے کار معاشی نظام کی راہ ہموار کی ہے۔

مصنوعی قلت:

غالباً تسلطی معاشیات و سیاست کا سب سے زیادہ برا اور تباہ کن پہلو یہ ہے کہ اس میں مصنوعی طور پر قلت و کمیابی پیدا کی جاتی ہے۔ قلت کی پیدائش و مداومت تسلطی نظاموں کے استمرار کی شرط اولین ہے۔

بنیادی طور پر یہ پیدائش قلت ہی ہے جس سے یہ نظام (جو کہ خوف اور اذیت کو محنت کے بڑے محرک کے طور پر استعمال کرتا ہے) خود کو برقرار رکھتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ماحولیاتی مسائل اور دیگر احوال کے طفیل معاشرے کو حقیقی قلتوں کا بھی سامنا کرنا پڑ سکتا ہے مگر تسلطی سیاست و معاشیات اسراف، ضیاع، استحصال، جنگ یا جنگ کی تیاری، ماحولیاتی تباہ کاری اور توجہ و نگہداشت کی تنقیص قدر سے معیاری انسانی سرمائے پر سرمایہ کاری سے ہاتھ کھینچ کر مسلسل مصنوعی قلتیں اور طلبات بھی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اربابِ دولت کا اسراف و ضیاع تسلطی معاشروں کا ایک دائمی خاصہ رہا ہے۔ خواہ یہ رومن امراء کی پرتعیش ضیافتیں ہوں یا آج کے اہل ثروت کی نولکھی دعوتیں، راجوں، مہاراجوں اور آمروں کے عالی شان محلات ہوں یا امیزون، ورلڈکام کے بڑے افسرون کے قصر، امیلڈا مارکوس کے ہزاروں پاپوش ہوں اور یا سوئیکارنو اور سہارتو خاندانوں کے بڑے بڑے بینک اکاؤنٹ، یہ سب ایک ہی زمرے میں آتے ہیں۔ فراز والے وسائل کا کباڑہ کرتے ہیں اور نشیب والے بچے کھچے ٹکڑوں کے لیے چھینا جھپٹی کرتے ہیں۔

ٹکڑوں کے لیے کی گئی یہ تگ و دو اکثر اوقات نسلی، گروہی اور مذہبی رنگ بھی اختیار کر لیتی ہے۔ تعصب کی سلگتی چنگاریوں کو ہوا دے کر انھیں نفرت و تشدد کے شعلوں میں تبدیل کرنا بہت آسان ہے۔ یہودیوں کو مکروہ معاشی ریشہ دوانیوں کا الزام دیا جاتا ہے اور مختلف نسلوں اور مذاہب کے لوگوں کو یہ کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے کہ وہ حقدار لوگوں کے وسائل ان سے ناجائز ہتھکنڈے استعمال کر کے چھین رہے ہیں۔

اس طرح کسی نہ کسی کو قربانی کا بکرا بنا کر دو مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ ایک تو اس سے نیچے والوں کو تقسیم کر کے انھیں آپس میں لڑایا جا سکتا ہے اور دوسرا یہ کہ اس سے لوگوں کے غصے کا رخ ان لوگوں کی طرف سے موڑا جا سکتا ہے جن کی پالیسیاں اور وتیرے عوام کے وسائل میں قلت کا موجب بنتے ہیں۔ یہ سب تسلط و استحصال کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔

قلت کی فضا سے زردار اور نادار دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ اوپر والوں کو جب یہ خوف دامن گیر ہوتا ہے کہ کہیں وہ بھی قلت کا شکار نہ ہو جائیں تو وہ دولت کی منصفانہ تقسیم سے دست کش ہو جاتے ہیں۔ وحشت و قلت کی اس نفسیات سے پھر ایسے معاشی اصول اور پالیسیاں جنم لینا شروع کر دیتی ہیں جو قزاقانہ کاروباری وتیروں کو بقا کے لیے ضروری قرار دے کر انھیں

MashalBooks.com

پنپنے کا موقع دیتی ہیں بلکہ انھیں اور زیادہ فروغ دیتی ہیں۔ یہ رجحان کاروباری حریفین کو ختم کر کے وسائل کی قلت کی شدت میں مزید اضافہ کرتا ہے اور منڈی سے کنارہ کرنے پر مجبور ہو جانے والے اور ان کے ملازمین اپنے وسیلۂ معاش سے محروم ہو جاتے ہیں۔

تسلطی نظام کا ایک اور ازلی خاصہ خزانے کو اسلحے اور جنگ و جدل پر لٹا کر زندگی کی بقا کے لیے انتہائی ضروری اسباب کی مسلسل قلت پیدا کرنا ہے۔ تسخیر و غلبے اور تباہی کی حرفتوں پر صرف کیے جانے والے کھربوں ڈالر خزانے کا اس قدر اجاڑا کر دیتے ہیں کہ صحت عامہ، تعلیم اور عوامی بہبود کے لیے صرف کھرچن ہی باقی رہ جاتی ہے۔ جنگ و جدال سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔ ایک تو لوگ غربت و قلت کے ہاتھوں ویسے ہی تنگ ہوتے ہیں، یہ انسانی اور مادی وسائل کی مزید بربادی کا باعث بنتا ہے جس سے قلت و بدحالی اور بھی سوا ہو جاتی ہے۔

''عالمی فوجی وسماجی اخراجات'' کے مطابق امریکہ کے بین البراعظمی بیلسٹک میزائلوں پر اٹھنے والی لاگت سے 50 ملین بچوں کا پیٹ پالا جا سکتا ہے، 160,000 مدارس تعمیر کیے جا سکتے ہیں اور 3,40,000 مراکز صحت قائم کیے جا سکتے ہیں۔ 30 یونیسیف کی ایک رپورٹ کے مطابق فقط ایک جوہری آبدوز کی تیاری پر آنے والی لاگت سے 98 ملین انسانوں کے لیے پانی اور صحت وصفائی کی سہولیات مہیا کی جا سکتی ہیں اور 11 راڈار گریز طیاروں کی قیمت سے 135 ملین بچوں کو چار سال تک ابتدائی تعلیم فراہم کی جا سکتی ہے۔ (31)

2005ء میں ''انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز'' اور ''فارن پالیسی اِن فوکس'' نے مختلف ذرائع سے اعداد و شمار جمع کر کے یہ حساب لگایا تھا کہ عراق میں امریکہ کی فوجی کارروائیوں سے ٹیکس دہندگان پر 5.6 بلین ڈالر کا بار پڑا۔ 32 مگر اس امریکی کانگرس نے کہ جس نے اس جنگ کے لیے کھربوں ڈالر کی منظوری دی، صحت، تعلیم اور بہبود کی مد میں رکھی جانے والی وفاقی رقوم میں یہ کہہ کر کٹوتی لگا دی کہ خزانہ اس بات کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ ان شعبوں پر اتنا پیسہ خرچ کیا جائے۔

تسلطی معاشی نظام بچوں کی ذہنی و جذباتی اور جسمانی نشوونما کے اہتمام پر کیے جانے والے مصارف میں کمی کر کے بھی دائمی قلت کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ یہ سبب اور اس میں اسلحے پر خرچ کی جانے والی خطیر رقوم کو بھی شامل کر لیجیے تو یہ دونوں مل کر اس ''معیاری انسانی سرمائے'' کی افزائش روک دیتے ہیں کہ جس کے بارے میں ہمیں اس قدر سننے اور پڑھنے کو

ملتا ہے۔ اسلحے پر خرچ کی جانے والی ان بھاری رقوم کو معاشرے کے انسانی سرمائے پر بھی لگایا جا سکتا ہے اور اس سے مادی وسائل اور ان کی فراوانی کے امکان کو اور بھی فروغ مل سکتا ہے۔ مرقومہ بالا تمام عوامل مل کر اس معاشی ترقی کی رفتار کو سست کر دیتے ہیں کہ جس سے دائمی فلاکت و افلاس اور قلت کا سدباب کیا جا سکتا ہے۔

تسلطی نظام فقط مادی وسائل کا ہی اجاڑ نہیں کرتے بلکہ ان سے جذباتی وسائل بھی تباہ ہوتے ہیں۔ سخت قسم کی درجہ بندیاں، خواہ یہ خاندان میں ہوں یا ریاست میں، توجہ و احساس اور باہمی ہمدردی کی راہ میں مصنوعی دیواریں کھڑی کرنے کا موجب بنتی ہیں اور مال و اسباب اور دوسرے انسانوں پر حاکمیت اور چوہدراہٹ بنیادی انسانی ضروریات کی تکمیل کی جگہ لے لیتی ہے۔

عوامی تشہیر کی عصری مہمات نے محبت، تحفظ اور اعتماد کی بشری آرزو کا استحصال کر کے ان تشنہ تکمیل احتیاجات سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ خوشبویات سے لے کر ہیروں تک کے اشتہارات میں محبت کی آس دلائی جاتی ہے۔ مشروبات، برگروں اور کاموں کے بارے میں ٹی وی اور اخبارات میں دی جانے والے اشتہارات میں جنسی کشش سے بھرپور خواتین دکھائی جاتی ہیں۔ اسی طرح بیمے اور حصص و تمسکات کا کاروبار کرنے والے اداروں کے اشتہارات بھی طرح طرح کے سبز باغ دکھاتے ہیں۔

اس طرح کی تشہیری مہمات لوگوں تک یہ پیغام (اور یہ پیغام کوئی اتنا ڈھکا چھپا بھی نہیں ہوتا) پہنچاتی ہیں کہ اگر ہم اپنی محبت، تحفظ اور خوشی کی دلی تمناؤں کی تسکین چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے ہم مال خرچ کریں، اشیاء خرید کریں اور پھر انھیں صرف کریں اور بس۔ لہٰذا غریب طبقے کے لوگ سستی اشیاء کی دکانوں میں امنڈ کر لاکٹ، لپسٹیں اور کنگھیاں ڈنڈیاں خریدنے میں لگ جاتے ہیں اور امراء اپنے بنگلوں اور بجروں کی تعداد میں اضافہ کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور جب یہ لوگ ان بیکار کی چیزوں سے اپنے گھروں کو بھر رہے ہوتے ہیں تو اس تسلطی مخروط کے زیریں حصے میں بسنے والے افراد بھوک اور بیماری سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنی جان دے رہے ہوتے ہیں۔

تسلطی معاشیات کا مصنوعی قلت و طلب پیدا کرنے کا ایک اور طریقہ ماحولیاتی تباہی ہے۔ نقاد ہمارے روز افزوں ماحولیاتی مسائل کا سارا الزام صنعت کاری کے سر تھوپ دیتے

ہیں لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو ماحولیاتی مسائل صنعتی معیشتوں کا نہیں بلکہ تسلطی نظام کا خاصہ ہیں۔ اس کے لیے ہمیں ماضی میں جا کر قبل از تاریخ کے ان چرواہوں کو دیکھنا ہوگا جن کے مویشی چراگاہوں اور جنگلوں سے گھاس پات تلپٹ کرتے تھے اور اس طرح اس مصنوعی قلت کا سبب بنتے تھے جس سے تسلط پر مبنی تعلقات کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

☆ امدادی پروگراموں کی اصلاح:

اگر ضرورت مند عوام کی بہبود کی پالیسیاں متعارف کروائی بھی جاتی ہیں تو ان کا نفاذ بیشتر اوقات غیر ہمدردانہ طریقے سے کیا جاتا ہے کیونکہ توجہ و دیکھ بھال کے ''نسوانی وظیفے'' کو اس کی اصلی قدر و قیمت تفویض نہیں کی جاتی۔ اس سلسلے میں امریکہ کے بہبودی پروگرام کو ایک مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ 1930ء کے عشرے میں نازل ہونے والی کساد بازاری کے دوران جب امریکی صدر روز ویلٹ نے اپنی مشہور و معروف ''نئی ڈیل'' کا اعلان کیا تو اس موقعے پر سوشل سیکیورٹی اور سماجی بیمے جیسے دیگر اقدامات کے ساتھ ''عیال دار کنبوں کی اعانت'' کا ایک پروگرام بھی شروع کیا گیا۔ اصولاً اس پروگرام کا مقصد بن بیاہی ماؤں کے کنبوں کی امداد تھا جن پر کہ سماجی بیمے کے پروگراموں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لیکن عملاً کیا ہوا کہ یہ پروگرام ضرورت مند افراد کے لیے ایک ڈراؤنے خواب کی شکل اختیار کر گیا اور انھیں تیسرے درجے کے پولیس ہتھکنڈوں کا سامنا کرنا پڑا۔

سماجی کارکنوں کو احکامات جاری کیے گئے کہ وہ امداد حاصل کرنے والے افراد کے گھروں میں رات گئے بغیر وارنٹ چھاپے ماریں اور تلاش کریں کہ کہیں ان کے ہاں کوئی ایسے فاضل ٹوتھ برش، مردانہ کپڑے یا تحائف تو نہیں ہیں کہ جنھیں ان کے بہبودی وظیفے سے منہا نہ کیا گیا ہو۔ اس اقدام کا جواز یہ کہہ کر مہیا کرنے کی کوشش کی گئی کہ اگر کسی عورت کے کسی مرد کے ساتھ مراسم ہیں تو پھر یہ اس مرد کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس عورت اور اس کے بچوں کا پورا کرے۔ اس طرح ان خواتین کو جنسی تعلقات کی نہ صرف معاشی سزا دی گئی بلکہ انھیں اخفا اور قانونی طریق کار کے ان کے بنیادی حق سے بھی محروم کر دیا گیا۔

1970ء میں یہ امدادی وظیفہ حاصل کرنے والی خواتین کی تنظیم کے زبردست دباؤ پر شبانہ چھاپوں کو غیر آئینی قرار دے دیا گیا لیکن یہ بہبودی وظیفے پھر بھی خیرات کے زمرے میں شمار کیے جاتے رہے۔ اس امدادی پروگرام کو ہم اس تسلطی خاندان کا ہی

ایک دفتری روپ قرار دے سکتے ہیں جس میں گھرانے کا مردسربراہ خاتون خانہ کو اس کے توجہ ونگہداشت کے وظیفے کو کوئی وقعت و اہمیت دیے بغیر خوراک، جوتے اور بچوں کے کپڑے خریدنے کے لیے گزارے کی تھوڑی بہت رقم تھما دیتا ہے۔

امدادی وظیفہ حاصل کرنے والوں کی ''ہڈحرامی'' اور ''دھوکہ دہی'' سے حکومت کو ''امدادی پروگراموں کی اصلاح'' کا جواز مل گیا جس کا آغاز صدر نکسن کو تجویز کردہ عائلی امداد کے منصوبے سے ہوا۔ 1990ء کے عشرے تک ڈیموکریٹ صدر بل کلنٹن اور ریپبلکن کانگرس کے تحت بن بیاہی ماؤں اور غریب بچوں کی حکومتی امداد کے تصور کی جگہ مفلس ماؤں کو ملازمت کی فراہمی کا تصور لے چکا تھا۔ جیسا کہ ماہر معاشیات رینڈی البیلڈ اپنی کتاب ''پسپائی: امدادی پروگراموں کی اصلاح، افلاس اور اس کے بعد'' میں لکھتی ہیں:

عین اس وقت جبکہ متوسط طبقے کی خواتین کو تنخواہ دار ملازمتیں ترک کرنے کی ترغیب دی جا رہی تھی، مفلس ماؤں کو مقرر کردہ کم از کم اجرتوں سے بھی کم پر کام کرنے کے لیے گھروں سے باہر کر دیا گیا۔(33)

ان اقدامات نے بچوں اور ان کی نگہداشت پر بہت برے اثرات مرتب کیے۔ ایک واقعے میں مناسب نگہداشت سے محروم مشی گن کے ایک چھ سالہ بچے نے کمرۂ جماعت میں اپنی ہم عمر ایک لڑکی کو گولی مار کر اس وقت ہلاک کر دیا جب اس کی ماں ایک دفتر سے تھکی ماندی دوسرے دفتر کی طرف سفر میں مصروف تھی۔ ملتا بے چاری کو دونوں ملازمتوں سے خاک بھی نہیں تھا۔ اخبارات نے اس المناک واقعے کو شہ سرخیوں سے شائع کیا مگر وہ قارئین کو اس سانحے اور امدادی پروگراموں کی اصلاح کی اس سرکاری مہم کے درمیان کا تعلق نہ دکھا سکے جو کہ توجہ ونگہداشت کے ''نسوانی کام'' کی سرپرستی اور اسے مناسب قدر و قیمت دینے سے گریزاں ہے۔ یہ ''اصلاحی'' مہم بہبودی وظائف اب بھی بچوں کی ضروریات کے لیے دیے گئے الاؤنسوں کے طور پر شمار کرتی ہے مگر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ مائیں جو فرائض سرانجام دیتی ہیں وہ بھی کام اور محنت کے زمرے میں آتا ہے۔

حقیقی اصلاح ایک بالکل مختلف طرزِ عمل کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ ایک ایسی پالیسی کی متقاضی ہے کہ جو والد اور والدہ کو یوں بااختیار بنائے کہ وہ گھر پر قابل والدین اور بازاری معیشت میں ماہر کارکنوں کا کردار کامیابی سے ادا کر سکیں۔ مغربی یورپ کے بیشتر ممالک میں یہی طرزِ عمل اختیار کیا گیا ہے۔ وہاں حاجت مندوں کی سرکاری امداد کو سماجی فرض تصور کیا جاتا ہے۔ اس خطے اور امریکہ کے درمیان بہت بڑا تفاوت دکھائی دیتا ہے

جہاں بہبودی پروگراموں کو ٹیکس دہندگان پر بار تصور کیا جاتا ہے اور ان پر ''خیرات'' کا لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے جبکہ بڑی کارپوریشنوں کو دی جانے والی لاکھوں ڈالر کی چھوٹ اور امرا کو ملنے والی بڑی بڑی محصولاتی رعایتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔

تسخیر فطرت:

آج جسے ہم صحرائے اعظم کہتے ہیں کبھی ایک سرسبز وشاداب خطہ تھا۔ 40,000 ق م اور 23,000 ق م کے درمیانی عرصے میں شمالی افریقہ میں ہاتھیوں، غزالوں، زرافوں اور شترمرغوں کے غولوں کے غول محوخرام ہوا کرتے تھے۔ زمین سے حاصل کیے جانے والے 12000 ق م سے لے کر 4000 ق م تک کے مٹی کے نمونے اس خطے میں تین سے لے کر چار صد ملی میٹر تک سالانہ بارش کا پتہ دیتے ہیں لیکن آج کل وہاں محض دس ملی میٹر بارش دیکھنے میں آتی ہے۔ برائن گرفتھ صحرائی وثقافتی تغیرات کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نمدار آب و ہوا کے زمانے میں شمالی افریقہ کے طول وعرض میں ہرطرف دریا رواں دواں تھے اور شیروں، چیتوں اور بارہ سنگھوں سے پر یہ سرزمین شاید کینیا کے موجودہ نیشنل پارکوں کا منظر پیش کرتی تھی۔(34)

یہ خطہ اس عہد میں صرف ریت کے ٹیلوں اور برہنہ سنگین چٹانوں پر ہی مشتمل نہ تھا اور اسے محض اکٹھے ہونے اور شکار کرنے کی ایک بیس تصور نہ کیا جاتا تھا۔ جب انسان نے زراعت شروع کی تو یہاں کھیتی باڑی کرنا ممکن ہو گیا لیکن 3000 ق م تک یہاں بارانی عہد کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس خطے کے ایک لق و دق صحرا میں تبدیل ہونے کا ایک سبب موسمی تغیرات بھی تھے۔ ممتاز جغرافیہ دان جیمز ڈی میو نے ہزاروں سالوں پر محیط موسمی تبدیلیوں اور اثری اعداد وشمار کو سامنے رکھ کر اس عظیم صحرائی خطے میں رونما ہونے والے تغیرات کا جائزہ لیا ہے جسے وہ صحریشیا کہتا ہے کیونکہ یہ شمالی افریقہ سے شروع ہو کر اور مشرق وسطی سے گزرتا ہوا وسط ایشیا کی طرف پھیلتا چلا جاتا ہے۔35 ان اعداد وشمار سے جیمز نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ خطہ کبھی ایک چمنستان کی مثال تھا مگر بعد میں یہ بتدریج ایک بنجر اور سنگلاخ زمین کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔

لیکن موسمی تغیر کی کہانی کا محض ایک جزو ہے۔ گرفتھ لکھتا ہے کہ جوں جوں زمین خشک

MashalBooks.com

ہوتی چلی گئی، کھیتی باڑی ناممکن ہوتی چلی گئی اور مویشی پالنا بھی زیادہ دشوار ہوتا چلا گیا۔ جب خشک سالی میں اضافہ ہوا اور روئیدگی میں کمی آنا شروع ہوئی تو خود انسان نے بھی اس زمینی تغیر کے ایک سبب کی شکل اختیار کی لی۔

چونکہ چرواہے اپنی بھیڑ بکریاں سارا سال ایک ہی علاقے میں چراتے تھے، نباتاتی قطعات آہستہ آہستہ سکڑتے چلے گئے۔ مزید نباتی زمین کے حصول کے لیے لوگوں نے درخت گرانے شروع کر دیے۔ جب درخت اور سبزہ غائب ہوا تو بارشوں میں مزید کمی پیدا ہو گئی جیسا کہ جنگلات تلف کرنے سے آج بھی ہو رہا ہے۔ اور جیسے جیسے مویشی مزید چراگاہیں تلپٹ کرتے چلے گئے زمینیں اور بھی بنجر ہوتی چلی گئیں۔

زمینی استحصال کے ان سلسلوں نے اور بھی زیادہ قلت کو جنم دیا اور فطرت کے ممد حیات نظام بھی بتدریج نڈھال ہوتے چلے گئے۔

لیکن تسلط و استحصال کے ادوار صرف فطرت تک ہی محدود نہیں رہے اور درشت سے درشت تر ہوتے اس ماحول میں تسلط و استحصال کی عادات ایک معمول کی حیثیت اختیار کر گئیں۔

بعض گروہوں نے سبز قطعات اور آبی ذخائر تک رسائی کے لیے دوسرے گروہوں سے بھڑنا شروع کر دیا اور جب روزی کے حصول کے لیے ننگی طاقت اور جارحیت ہی سب کچھ بن گئی تو خواتین اپنی قوت و حیثیت کھو بیٹھیں۔

گرفتھ کا خیال ہے کہ شروع میں بھیڑ بکریوں کو شائد خواتین نے ہی سدھایا ہو گا۔ جب شکاریوں نے پہلی بار جنگلی بکری کو مارا ہو گا تو غالباً وہ اس کے میمنوں کو پکڑ کر گھر لے گئے ہوں گے جہاں خواتین کے ذہن میں ان ننھے یتامیٰ کو پالنے پوسنے کی سوجھی ہو گی۔ ان ادوار میں پالتو جانوروں کی اس طرح کی پرورش زیادہ تر خواتین کے ذمے ہی رہی ہو گی جیسا کہ چین و ہندوستان میں آج بھی دیکھنے کو آتا ہے۔ 36 لیکن خواتین نے جہاں گھریلو جانوروں کی نگہداشت اور معاشی اہمیت کے دیگر وظائف کی انجام دہی جاری رکھی، چراگاہوں کے کم اور ایک دوسری سے دور سے دور تر ہونے کے سبب مردوں نے ایک زیادہ فعال اور ایک قطعی مختلف منصب اختیار کر لیا۔ اب ان کا منصب محض اپنے ریوڑوں کے ہمراہ دور پار کی سرزمینوں تک سفر کرنا ہی نہ تھا بلکہ اپنے ریوڑوں کو لٹیروں سے بچانے اور دوسروں کے ریوڑوں کی لوٹ

مار بھی تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مردوں کے معاشی وظائف (خاص طور پر ان وظائف کی انجام دہی کے لیے ان کے طاقت کے استعمال) کو فوقیت دی جانے لگی اور خواتین کے کام کی قدر گرنے لگی۔

گرفتھ اپنی تصنیف میں لکھتا ہے کہ ''کیمیائی جبر کو بنیادی ضروریات کی تکمیل کے ایک ذریعے کے طور پر فروغ دیتی ہے۔''(37) جیسے جیسے جبر کا یہ استعمال ثقافت کا حصہ بنتا گیا، یہ لوٹ مار اور قتل و غارت صحراؤں سے نکل کر زیادہ زرخیز خطوں تک پھیلتی چلی گئی۔

جیمز ڈی میو بھی انسانی رویئے اور سماجی اداروں کے اپنے جغرافیائی تجزیئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ درشت حالات، خواتین کی جنسی و سماجی غلامی اور جنگجو خصائل اور سختی کے مردانگی سے شناخت کے درمیان ایک تاریخی تعلق اور نسبت ہے۔(38) وہ ایسے شواہد بھی پیش کرتا ہے جو ظاہر کرتے ہیں کہ جوں جوں یہ درشت ماحولیاتی تغیرات رونما ہوتے چلے گئے، خانہ بدوش چرواہوں کے آس پاس کے علاقوں پر حملوں میں بھی شدت آتی چلی گئی۔

یہ خانہ بدوش قبائل جوں جوں آگے سفر کرتے چلے گئے، ان کے دل میں سیراب زمینوں میں نظر آنے والے تحفظ اور دولت کے لیے حرص میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔(39) اور انھوں نے زیادہ زرخیز علاقوں پر پنجے گاڑنے شروع کر دیے...... اولاً گاہے بگاہے یلغاروں سے اور بعد میں ان فاتحین کے روپ میں جنھوں نے لوگوں پر اپنی حکومتیں بھی مسلط کرنا شروع کر دیں۔

جب وہ ہلال زرخیز(Fertile Crescent) میں وارد ہوئے تو خانہ بدوش حکمران تسلط کی اپنی عادات بھی ساتھ لے کر آئے۔ مفتوحہ علاقوں کی عورتیں ان کے لیے مال غنیمت کی طرح تھیں جنھیں وہ لونڈیوں، باندیوں اور کنیزوں کی طرح استعمال میں لا سکتے تھے یا پھر دل میں آئے تو انھیں جنسی ہوس کا نشانہ بنا سکتے تھے اور انھیں قتل بھی کر سکتے تھے۔ جوں جوں یہ حملہ آور سکونت اختیار کرتے چلے گئے ''ان کی'' خواتین کی حالت بھی مزید ابتر ہوتی چلی گئی۔

گرفتھ کا کہنا ہے کہ ''صحرا کے ایام پارینہ میں عورتوں کو عموماً جنسی خواہش کی تسکین کے سامان کے طور پر دیکھا جاتا تھا لیکن وہاں کم از کم انھیں گھومنے پھرنے اور باہر کھلے میں کام کرنے کی آزادی ضرور میسر تھی لیکن اب انھوں نے ایسے جنسی سامان کی حیثیت اختیار کر لی جس پر پہرے لگانا اور اسے اڑوس پڑوس کے لوگوں سے الگ کرنا اور بچانا ضروری تھا۔(40)

MashalBooks.com

جب جنگجو شوہروں نے اپنی عورتوں کو مفتوحین سے الگ تھلگ رکھنے کی ٹھانی تو خواتین پر لگائی جانے والی قدغنیں عام رعایا میں مثالی حیثیت اختیار کر گئیں۔ (41) اب وہ خواتین سے مستورات میں تبدیل ہو گئیں۔ انھیں مخصوص اطاقوں میں رکھا جانے لگا اور ان پر باہر نکلتے وقت نقاب یا چادر اوڑھنے کی پابندی عائد کر دی گئی۔ ایسا ہمیں بعد میں اس وقت بھی دیکھنے کو ملتا ہے جب خانہ بدوش آریہ حملہ آور ہندوستان میں وارد ہوئے۔

مفتوحہ علاقوں کے رواجوں اور قوانین میں بھی بہت زیادہ تبدیلیاں واقع ہوئیں اور خواتین مردوں کی باقاعدہ ملکیت تصور کی جانے لگیں۔ گرفتھ صاحب لکھتے ہیں کہ ''2371 ق م تک شادی اور جائیداد سے متعلق قوانین مردوں اور عورتوں کے لیے ایک سے رہے۔'' (42) لیکن بابلیہ (آغاز اندازاً 1750 ق م) اور آشوریہ (آغاز تقریباً 1200 ق م) کی تہذیب تک آتے آتے خواتین پر مردانہ تسلط بہت بھیانک اور بہیمانہ شکل اختیار کر چکا تھا۔ وہ خواتین جو اپنے مردوں کی کوئی چراتے پکڑی جاتیں انھیں قتل کر دیا جاتا تھا اور وہ عورتیں جو پردہ کرنے سے انکار کرتیں انھیں ٹکٹکی سے باندھ کر کوڑے لگائے جاتے تھے۔ کسی کی مفرور بیوی کو پناہ دینے کی مرتکب خاتون کے کان کاٹ دیے جاتے تھے اور اگر کوئی عورت اپنا حمل ضائع کرتی تو اسے سولی پر چڑھا دیا جاتا تھا تاکہ وہ سسک سسک کر اپنی جان دے دے۔

اب ہر عمل کا نصب العین تسلط و تسخیر ٹھہرا۔ خواتین کی ادنیٰ مردوں کی اور زمین کی تسخیر۔ محکوم اور مفتوح لوگوں کا بڑی شقاوت سے استحصال کیا جانے لگا۔ بات یہاں تک بڑھی کہ روز افزوں حملوں اور لڑائیوں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے عوام کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے درکار آبپاشی کو بھی نظرانداز کیا جانے لگا کیونکہ پرانے خانہ بدوش ایام کی طرح یہ حملے دولت حاصل کرنے کا بڑا ذریعہ بن چکے تھے۔

آشوریوں نے اپنی سفاک فتوحات کے نتیجے میں ایک زبردست سلطنت قائم کر لی تھی جس کے اخراجات چلانے کے لیے سال بہ سال بڑے بڑے خراج وصول کیے جاتے تھے۔ مفتوحہ کسانوں کو باور کرایا جاتا تھا کہ اگر انھوں نے یہ خراج ادا نہ کیا تو انھیں قتل کر دیا جائے گا۔ لہٰذا وہ سارا سال فصلیں اگاتے جس سے ان کی زمینیں بے حال ہو جاتیں۔ آشوری حاکموں کو اس کی چنداں پرواہ نہ تھی کیونکہ وہ اپنی سلطنت کو حملوں کے لیے محض ایک بہت بڑا اڈہ تصور کرتے تھے۔ جب وہ ایک علاقے کو تلپٹ کر لیتے تو وہ اپنی فتوحات کے دائرے کو

مزید وسیع کر دیتے۔ عین اسی طرح جیسے خانہ بدوش کمیاب ہوتی چراگاہوں کے پیچھے بھاگتے تھے۔(43)

فطرت، خواتین اور دوسرے مردوں کو تسخیر کرنے کی یہ ذہنیت آنے والے وقتوں میں سلطنت فارس کے شہنشاہ دارا کا بھی وتیرہ بنی رہی۔ اس نے اپنے عہد اقتدار (اندازاً 500 ق م تا 328 ق م) میں اپنے دربار اور لاؤ لشکر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مشرق وسطیٰ کی ریاستوں سے خوب مال نچوڑا۔ اس کو اس بات کا قطعاً کوئی خیال نہیں تھا کہ لوگوں کو اس قدر مجبور کرنے کا ماحولیاتی خسارہ کس قدر ہوگا۔ کسانوں کو اپنی فصلوں کا نصف لگان کی صورت میں دینا پڑتا تھا تاکہ بادشاہ زیادہ سے زیادہ سپاہی بھرتی کر سکے اور ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ انھیں مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ سالانہ پیداواری ہدف پورا کرنے کے لیے زمین کو زیادہ سے زیادہ رگڑیں اور اسے سانس بالکل نہ لینے دیں۔ صرف یہی نہیں چونکہ جنگی اخراجات حکمرانوں کی پہلی ترجیح تھے، اگر آبپاشی اور آبی ذخیرے کے نظام کا بیڑہ غرق ہوتا تو وہ ہونے دیتے تھے اور جیسا کہ گرفتھ صاحب لکھتے ہیں ''یہ سلسلہ یونہی بار بار چلتا رہتا تھا۔ خشکی لڑائی کے پیدا کرتی تھی اور لڑائی کے پھر خشکی کو جنم دیتے تھے۔''

اور یہ سلسلہ اب بھی ختم کہاں ہوا ہے۔ تسلط و غلبے کی یہ عادتیں ہنوز زندہ ہیں۔ بس فرق صرف یہ رونما ہوا ہے کہ پہلے فقط ایک علاقے کو خطرہ لاحق ہوتا تھا، اب آج کے اس حرفتی ترقی کے دور میں ہمارے اس سیارے کا پورا ماحولیاتی نظام زد پر ہے۔

آج سائنس دان ہمیں بتا رہے ہیں کہ ہم فطرت کی تسخیر و استحصال کا سودا چھوڑ کر اس کی توجہ و نگہداشت کا سوچیں۔ رپورٹ در رپورٹ ہمیں خبردار کر رہی ہے کہ ہم ایک ناعاقبت اندیشانہ روش پر گامزن ہیں۔ اس سے آگے چل کر توازن بگڑ سکتا ہے۔

2005ء میں اقوام متحدہ کی زیر سرپرستی تیار کردہ ماحولیات پر ایک رپورٹ کے مطابق گذشتہ 50 برسوں کے دورانیے میں دنیا کے 60 فیصد سبزہ زار، جنگلات، کاشتی زمین، دریا اور جھیلیں انسانی سرگرمی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ پچانوے ممالک کے 1360 سائنس دانوں کی مشترکہ کاوش سے مرتب کردہ ہماری زمین کو پہنچنے والے نقصان کا یہ تخمینہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ گذشتہ فقط چند عشروں کے دوران دنیا کے حجرات البحر کا پانچواں اور دلدلی جنگلات کا تیسرا حصہ تباہی کی نذر ہو چکا ہے۔(44)

گاڑیوں اور بجلی گھروں سے نکلنے والی گیسوں کے طفیل فضائی درجہ حرارت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے جس سے قطبی برف بڑی تیزی سے پگھل کر سمندر میں گر رہی ہے۔ سائنس دانوں کے جمع کردہ اعداد و شمار کے مطابق گرین لینڈ کے گلیشیئر پانچ سال قبل کے مقابلے میں دگنی رفتار سے ٹوٹ کر سمندر میں آ رہے ہیں۔ قطبی ریچھ غارت ہو رہے ہیں اور دیگر بہت سی انواع کے ناپید ہونے کا خطرہ بھی لاحق ہو گیا ہے۔ مگر ان سب شواہد کے سامنے آنے کے باوجود ان مضر گیسوں کا بے تحاشا اخراج جاری ہے۔ کسی کو فکر نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ہر سال (25) بلین میٹرک ٹن کاربن ڈائی آکسائیڈ ہوا میں خارج کی جاتی ہے اور سائنس دان متنبہ کر رہے ہیں کہ صرف چند عشروں میں دنیا کے کئی اہم ساحلی شہر بلند ہوتے پانیوں کی لپیٹ میں آ سکتے ہیں۔

برٹش رائل سوسائٹی کے سائنس دانوں کی طرف سے 2005ء میں شائع کردہ ایک رپورٹ کے مطابق ہمارے سمندروں میں تیزابیت کا خطرہ پیدا ہو رہا ہے۔ اس رپورٹ نے خبردار کیا ہے کہ کاربونک ایسڈ پیدا کرنے والے صنعتی اخراجات سے کیمیائی تعاملات کے نتیجے میں تمام استخوانی اور خول دار مخلوقات متاثر ہو رہی ہیں۔ یہ گیسیں اس سمندری حیات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہی ہیں جن پر دیگر کئی جاندار مخلوقات کی گزر بسر ہے۔ (45)

ہر آئے روز ایک نئی سائنسی تحقیق ہماری موجودہ روش کے دیوانے پن کو ہویدا کرتی چلی آ رہی ہے مگر تسلط و استحصال کی کہنہ عادات ہمارے سانچوں، پالیسیوں اور وتیروں میں اس قدر رچ بس چکی ہیں کہ ان تنبیہات پر کوئی کان دھرنے کو آمادہ نظر نہیں آتا۔

لگتا ہے کسی کو بھی پرواہ نہیں۔ خصوصاً ان لوگوں کو کہ جو اس غیر دانشمندانہ روش کو تبدیل کرنے کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔ بڑے کاروباری ادارے نیز وہ حکومتیں جو کہ ان کے قابو میں ہیں برساتی جنگلات کو مکمل طور پر تباہ کرنے، آب و ہوا کو آلودہ کرنے اور وسائل کو اسلحے اور جنگ میں جھونک کر مصنوعی قلت پیدا کرنے پر تلے نظر آتے ہیں۔ فطرت کی غارت گری بلاتوقف جاری ہے اور اس کی رفتار میں وہ طاقتور حرفتیں اور بھی اضافہ کر رہی ہیں جو کہ برسوں کے عرصے میں بلکہ مہینوں اور دنوں میں بھی وہ گل کھلا سکتی ہیں جنھیں کھلانے میں پہلے صدیاں لگتی تھیں۔

مگر یہ سب ناگزیر نہیں، اسے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

MashalBooks.com

صفحہ نمبر: 198
پہلا پروف، فائل چیک ہو چکی ہے۔ حافظ محمد ناصر رشید۔ 25 دسمبر 2008ء
پہلا پروف، فائل چیک ہو چکی ہے۔ عاصم۔ 21 جنوری 2009ء

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

باب ہفتم

شراکتی معاشیات

ہمارے نظریات اور ہماری حکایات کو ہمارے مستقبل کے تعمیری نقشوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ نظریات اور حکایات خلا میں پیدا نہیں ہو جاتے۔ وہ خاص زمانوں اور معاشروں کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک نظریے نے اٹھارھویں صدی میں زور پکڑا تھا جس سے لوگوں کو یہ یقین ہونا شروع ہو گیا کہ اس زمین پر ایک اعلیٰ زندگی کے خواب کو شرمندہ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

انسانی تاریخ کے بیشتر حصے میں، خواہ یہ مغربی تاریخ ہو یا کہ مشرقی، لوگوں کی اکثریت غریب رہی ہے اور جیسا کہ انھیں سکھایا جاتا ہے وہ غربت کو اپنا نصیب سمجھ کر قبول کرتے رہے ہیں۔ اور تو اور ارسطو جیسا عظیم مفکر بھی یہی درس دیتا نظر آتا ہے کہ دنیا میں آنے والا ہر انسان اپنے اپنے خاص مقام پر پیدا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ غلاموں کو غلامی کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے اور عورتوں کو اس لیے کہ وہ مردوں کی اطاعت کریں۔ ''پیدائش کے لمحے سے ہی'' وہ لکھتا ہے ''بعض افراد حاکمیت کے لیے چن لیے جاتے ہیں اور بعض محکومیت کے لیے۔(1) بعد کے زمانوں میں کلیسا بھی مسیحیوں کو یہی سکھلاتا رہا کہ مصیبتیں ہم پر ہماری بد اور خود غرض فطرت کی تادیب کے طور پر نازل ہوتی ہیں۔ جہاں تک غربت کا سوال ہے تو کیا کتاب مقدس یسوع کو یہ الفاظ ادا کرتے بیان نہیں کرتی ''مساکین ہمیشہ تمھارے ساتھ ہوں گے۔''

جیسے جیسے یورپ میں صنعتی انقلاب نے قدم جمائے، اس امکان نے بھی تقویت پکڑی کہ دنیا کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ دنیا درحقیقت اس دور میں بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی اور پرانے وتیروں کی جگہ محنت و حیات کی نئی روشیں ابھر کر سامنے آ رہی تھیں۔

Compose [P 126 - 198] Xshahid (P 199 - 344)
D:\work 2008 Composing\Mashal\New Folder\Feeding
Matter 1th Proof 2nd Proof 3nd Proof Final
7 Nov,2008
Tovaja Ki Tojehii 004
22-Jan-09
MashalBooks.com

1700ء کے عشرے کے وسط میں انسانی مداخلت کے ذریعے ترقی کی سوچ کا اطلاق معاشیات پر کیا گیا۔ اس سوچ کے مطابق اگر لوگ ذرائع پیداوار کو بہتر بنا سکیں تو وہ معاشی نظام میں بھی بہتری لا سکتے ہیں۔ یہ جانکاری حاصل کر کے کہ معاشی نظام کسی طرح کام کرتے ہیں ہم انھیں سب کی فلاح کے کام پر مامور کر سکتے ہیں۔

معاشی سانچوں کی اس نئی پرکھ پڑچول سے دو اقتصادی نظریات نے جنم لیا۔ ان میں سے پہلے نظریے میں جو چیزیں پیش کی گئیں انھیں آج کے دور میں ''سرمایہ داریت'' کا نام دیا گیا ہے۔ اور دوسرے نظریے کو اس کے شارحین ''اشتراکیت'' کہتے ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ نظریات بس نظریات ہی ہوتے ہیں اور حقیقت میں ان کے کوئی عملی اثرات نہیں ہوتے لیکن اس سے زیادہ غلط بات کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ سچی بات یہ ہے کہ جدید تاریخ کو شائد ہی کسی چیز نے اتنا متاثر کیا ہو کہ جتنا ان دونوں معاشی نظریات نے کیا ہے۔

ان دونوں نظریات نے اپنی اپنی جگہ یہ ماجرا بیان کرنے کی کوشش کی کہ معاشی نظام کس طرح کام کرتے ہیں اور ان میں بہتری کس طرح لائی جا سکتی ہے اور ان ماجروں نے نہ صرف یہ کہ معاشی پالیسیوں اور وتیروں کو بدل کے رکھ دیا بلکہ انھوں نے لوگوں کے سوچنے اور زندگی گزارے کے انداز کو بھی تبدیل کر دیا۔(2)

آگے جانے سے قبل بہتر ہوگا کہ پہلے ہم ان دونوں نظریات کو اچھی طرح سمجھ لیں اور ان حالات و واقعات کو بھی کہ جن میں انھوں نے آنکھ کھولی۔ ہمیں خاص طور پر ان تسلطی مفروضات کو سمجھنے کی ضرورت ہے جو ان دونوں نظریات میں رچے بسے ہوئے ہیں۔ اگر ہم کوئی نیا معاشی نظریہ' کوئی ایسا معاشی نظریہ معرض وجود میں لانا چاہتے ہیں کہ جو واقعی سب کے وسیع تر مفاد میں کام کرے تو یہ تفہیم لازم ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام فکر:

نظریہ سرمایہ داریت کی ''بائبل'' تصنیف کرنے والا شخص ایڈم سمتھ 1723ء میں سکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا۔ وہ بہت ذہین و فطین' غیر مقلد اور ملنسار انسان تھا۔ اگرچہ اس نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ اس کے دوست واحباب اور مداحوں کا حلقہ کافی وسیع تھا جس میں اس وقت کے برطانوی معاشرے کی کچھ بہت ممتاز ہستیاں بھی شامل تھیں۔ اس نے ایک شاندار پیشہ

وارانہ زندگی گزاری جس کے دوران اس نے آکسفورڈ میں تدریسی فرائض انجام دیے اور ایک اشرافیہ خانوادے کے فرد کے ساتھ پورے یورپ میں سفر بھی کیا جس کے لیے اسے خطیر معاوضہ بھی پیش کیا گیا۔ سمتھ نے اس سے قبل کچھ نہیں لکھا تھا لیکن 1759ء میں اس نے اپنی پہلی کتاب ''نظریہ جذبات اخلاقیہ'' تحریر کی جس سے آج کل بہت کم لوگ متعارف ہیں۔ 1776ء اس سال کہ جس میں امریکہ وجود میں آیا' میں اس نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''تحقیق و ماہیت وامور دولت اقوام'' شائع کی جسے زیادہ تر ''دولت اقوام'' کے مختصر نام سے یاد کیا جاتا ہے۔(3)

سمتھ کی مستقبل کے بارے میں سوچ رجائیت پسندانہ تھی۔ وہ بنیادی طور پر اس تسلطی عقیدے کو تسلیم کرتا تھا کہ انسان فطرتاً خودغرض ہے مگر اس کے تصور کے مطابق اس خودغرضی کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے...... اگر پیداوار وتجارت کے انضباط کو منڈی پر چھوڑ دیا جائے اور حکومت اس میں مداخلت نہ کرے۔

اگرچہ یہ موقف اکثر اس سے منسوب کر دیا جاتا ہے لیکن سمتھ ہرگز یہ نہیں کہتا تھا کہ خودغرضی ہی واحد انسانی محرک ہے۔ وہ ''نظریہ جذبات اخلاقیہ'' میں اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ انسان ''جذبات'' کے طفیل بھی دوسروں کے لیے کام کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں اور اس کا خیال تھا کہ بے لوث خیر خاندانوں میں ایک اہم محرک ہوتا ہے۔ خصوصاً خواتین کے لیے۔

سمتھ کو ادارہ حکومت کے انکاری کے طور پر بھی جانا جاتا ہے لیکن جب ہم اس کی ریاست کے معاشی کنٹرول کے خلاف لعن طعن کو اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھتے ہیں تو یہ ایک بہت مختلف معانی اختیار کرتی نظر آتی ہے۔

سمتھ نے اپنی تحاریر ایک بہت بڑے معاشی و معاشرتی تعطل کے دور میں قلمبند کیں۔ طبقہ امراء سے متعلق افراد نے بہت سی سرکاری زمینیں ہتھیا لی تھیں اور فلاکت کا شکار بیدخل کیے گئے کسانوں کے جھتوں کے جھتے مضافاتی علاقوں میں بھٹکتے رہتے تھے اور اس وقت بھی اس بات کے آثار ہویدا ہو چلے تھے کہ انیسویں صدی کی بھرپور صنعتکاری اپنے جلو میں کیا کیا لے کر آنے والی ہے۔ ان ایام میں بعض جگہوں پر کم سن بچے بھی بارہ بارہ گھنٹے کانوں میں کام کرتے سنے جاتے تھے اور خواتین بھی' حاملہ خواتین بھی جنھیں بعض اوقات ان کانوں میں بچہ

جلنا پڑتا تھا۔ بعض صنعتی قصبوں میں بھی حالت اچھی نہ تھی اور ان میں لڑکے بارہ بارہ چودہ چودہ گھنٹوں کے دورانیے سے شبانہ روز مشینوں پر جتے رہتے تھے۔ مگر اس سارے کے باوصف حکومت جو کہ مکمل طور پر زمیندار اور تاجر طبقات کے ہاتھوں میں تھی' صورتحال کی اصلاح کے لیے کچھ نہ کرتی تھی بلکہ اس کی بجائے وہ اکثر اوقات اپنی کوتاہ بین پالیسیوں سے معاملات کو اور بھی بہتر بنا دیتی تھی جو کہ ارباب اختیار کے نہایت کمینہ معاشی مفادات کو پورا کرنے کے لیے وضع کی جاتی تھیں۔

جب سمتھ سرکاری مداخلت کے خلاف جرح کر رہا ہوتا تھا تو فی الواقع وہ بالواسطہ طریقے سے بالائی طبقات کے معیشت پر قبضے کے خلاف بول رہا ہوتا تھا۔ سوچ پوچھیں تو اگر اسے پتہ چل جاتا کہ اس کے اقتصادی نظریے کو حرص اور لوٹ مار کے جواز کے طور پر استعمال کیا جائے گا تو اس کی روح کانپ کر رہ جاتی۔ حقیقت کی بات یہ ہے کہ اس نے ان چیزوں کی بہت شد مد سے مذمت کی تھی۔ وہ نئے تاجر طبقے کو اور اس کے ''حرص و کمینگی'' کو بہت رگیدتا رہا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''وہ انسانیت کے حکمران نہیں ہیں اور نہ ہی انھیں ہونا چاہیے۔'' (5) وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ''کوئی بھی ایسا معاشرہ خوشحال اور مسرور نہیں ہوسکتا کہ جس کا بڑا حصہ مفلس اور نادار لوگوں پر مشتمل ہو۔'' (6)

سمتھ یہ نہیں کہتا کہ حکومت کو قطعاً کوئی کردار ادا نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی وہ حکومتی خدمات کی نجکاری کی حمایت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام شہریوں کے لیے ''عدل وانصاف کی صحیح تقسیم'' حکومت کا فرض عین ہے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ حکومتوں کو ''ان سرکاری اداروں اور ان سرکاری منصوبوں کی تعمیر واستقرار پر توجہ دینی چاہیے جو ایک عظیم معاشرے کے اعلیٰ ترین مفاد میں ہوں۔ وہ ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ ''یہ ادارے اس نوعیت کے ہونے چاہئیں کہ ان پر لاگت کا منافع کسی ایک فرد یا چند افرد کے ہاتھوں میں نہ جاسکے۔'' مزید برآں وہ اپنے قارئین کو یہ خبردار بھی کرتا ہے کہ نئے صنعتکار ''عموماً عوام کو دھوکہ دینے اور ان پر جبر کرنے کے خواہاں ہیں۔'' (7)

بایں ہمہ سمتھ کے فکر کے قلب میں یہ عقیدہ کارفرما تھا کہ ایک بہتر معاشرے کی تعمیر کے لیے بنیادی وسیلہ منڈی ہے......یعنی تجارتی لین دین کے ذریعے منافعہ کے لیے اشیاء کا تبادلہ

اور پیداوار۔ اس کا خیال تھا کہ منڈی کی قوتیں بذریعہ مقابلہ خودغرضی کا توڑ کر سکتی ہیں۔ اس کے مطابق ''منڈی کا نادیدنی ہاتھ'' اس بات کو یقینی بنائے گا کہ عوام کو دھوکہ نہیں دیا جاتا اور یہ کہ معیار زندگی میں بہتری آ رہی ہے۔(8)

یہ دلیل جس کی وضاحت پر سمتھ نے ''دولت اقوام'' کے نو سو صفحے کالے کر ڈالے سرمایہ داریت کی بنیادی دلیل کی شکل اختیار کر گیا۔

اشتراکی فلسفہ:

بعض اعتبار سے سرمایہ داریت کو تسلطی نظام حیات سے شراکتی طرز زندگی کی طرف سفر میں ایک اہم پیش رفت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نے آئینی بادشاہت اور جمہوریہ جیسے سماجی طور پر زیادہ جوابدہ سیاسی سانچوں کو تحریک دی اور متوسط طبقے کے وجود میں آنے کا بڑا سبب بنا۔ بلاشبہ سرمایہ داریت اس ابتدائی جاگیرداری اور مہاجنی معاشی نظام کی نسبت قابل ترجیح تھی جن میں بیشتر وسائل پر امراء اور بادشاہوں کا تسلط ہوتا تھا۔

تاہم سرمایہ دارانہ نظام نے حرص اور لوبھ (محرک منافع) کو تقویت دی' درجہ بندیوں (طبقات) پر انحصار کیا' متشددانہ روایات، استعماری فتوحات اور جنگوں کو برقرار رکھا اور توجہ و نگہداشت کے ''نسوانی کام'' کو وقعت دینے سے قاصر رہا۔ لہٰذا سرمایہ دارانہ نظام کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے تسلطی عناصر جوں کے توں اس میں بھی موجود رہے۔

انیسویں صدی میں آ کر جب یہ بات واضح ہو گئی کہ سرمایہ داریت فلاح عامہ کے لیے کارگر معاشیات کی سمتھ کی سوچ پر پورا نہیں اتر رہی تو کارل مارکس اور فریڈرک اینجلز نے دنیا کے سامنے ایک قطعی مختلف معاشی نظریہ پیش کیا۔ ان کے نظریے کو سائنسی اشتراکیت کا نام دیا گیا اور اس نے سمتھ کے پیش کردہ تقریباً سبھی عقائد و تصورات کو چیلنج کر ڈالا۔ خاص طور پر اس کے منڈی کی قوتوں کے عقیدے کو۔

اینجلز 1820ء میں جرمنی میں پیدا ہوا لیکن اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ انگلستان میں گزارا جہاں وہ مانچسٹر میں واقع اپنے والد کے کپڑے کے کارخانے کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ اپنے طبقے کے بہت سے دیگر افراد کے برعکس وہ غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتا تھا۔ اسے محنت کش طبقے کی ایک عورت سے محبت ہو گئی اور یہ معاشقہ خاتون کی

موت تک جاری رہا اور اس کی موت پر اینجلز نے اس کی بہن سے بیاہ کر لیا۔ محنت کش گھرانوں کے دلدوز حالات کا اتنے قریب سے مشاہدہ کرنے کے بعد اس نے ایک کتاب ''انگلستان میں مزدور طبقے کی حالت'' تحریر کی جو 1844ء میں شائع ہوئی; اس میں اس نے بڑے جذباتی انداز میں سرمایہ دارانہ نظام کی قلعی کھولنے کی کوشش کی ''جس میں لوگوں کو صبح سے شام تک کام میں جتا رہنا پڑتا ہے مگر اس کے باوجود انھیں رہنے کو گندے، بدبودار اور چوہے کے بلوں جیسے گھر نصیب ہوتے ہیں اور پیٹ بھر اناج بھی بڑی مشکل سے ملتا ہے۔'' جب اینجلز کی 1844ء میں پیرس میں کارل مارکس کے ساتھ ملاقات ہوئی تو اس وقت تک وہ اشتراکیت کے مساواتی آدرشوں کو قبول کر چکا تھا۔ پروگرام کے مطابق انھیں صرف چند گھنٹوں کے لیے ملنا تھا مگر جب ان کی گفتگو شروع ہوئی تو یہ سلسلہ دس دنوں تک طویل ہوگیا۔ جب یہ ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی تو دونوں ایک دوسرے کے عمر بھر کے دوست اور ساتھی بن چکے تھے۔ مارکس، بیگم مارکس اور ان کے بچوں کی مکمل کفالت بھی بقیہ عمر اینجلز کے ذمے رہی۔

مارکس کوئی ازلی مسکین نہ تھا۔ اس کی غربت اس کے سیاسی اعتقادات کا نتیجہ تھی جن کا اظہار ابتداً اس نے اخبارات اور پھر اپنی تاریخ ساز اقتصادی تصنیف ''سرمایہ'' کے توسط کیا۔

کارل مارکس 1818ء میں جرمنی کے ایک خوشحال اور آزاد خیال یہودی گھرانے میں پیدا ہوا جس نے بعد میں عیسائی مذہب اختیار کر لیا تاکہ اس کے والد کو اپنے وکالت کے پیشے میں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کارل نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بون اور برلن کی دانشگاہوں سے رجوع کیا جہاں اس کے ذہن نے مشہور فلسفی ہیگل کے جدلیاتی تبدیلی کے نظریے سے بہت اثر قبول کیا۔ اس نظریے کے مطابق ہر تاریخی قوت کی ایک متضاد قوت ہوتی ہے اور دونوں کے تصادم سے ایک نیا مرکب پیدا ہوتا ہے جو آگے پھر دو متضادات میں تسیم ہو جاتا ہے۔ اس نظریے نے مارکس پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اس نے خود بھی ایک فلسفی بننے کی ٹھان لی اور کسی یونیورسٹی میں ملازمت حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں لیکن اس کے پاس دو ہی راستے تھے۔ یا تو رجعت پسند جرمن حکمرانوں کی خوشنودی کی جستجو کرے اور یا پھر پروفیسری کی تمام امیدیں ترک کر دے۔ مارکس نے دوسرے رستے کا انتخاب کیا اور 23 برس کی عمر میں یونیورسٹی چھوڑ کر صحافت کے پیشے سے منسلک ہوگیا۔ اس نے ایک آزاد خیال اخبار کی ادارت سنبھالی۔ مطلق العنان حکومت کے خلاف تنقید کی وجہ سے اسے عتاب کا سامنا کرنا

پڑا اور جرمنی سے ہجرت کرنا پڑی۔ مارکس پوری زندگی بار بار اس چکر سے گزرتا رہا اور اسے اور اس کے خاندان کو در در کی خاک چھاننا پڑی۔ اگر اینجلز کی مہربانیاں آڑے نہ آتیں تو ان کا بچنا محال تھا۔ دوسری طرف اینجلز کو مارکس میں ایک ایسی نابغہ شخصیت نظر آ رہی تھی کہ جو پسے ہوئے غریب عوام کے لیے آزادی وخوشحالی اور امید کا ایک پیغام بن سکتی تھی۔

مارکس و اینجلز کی سائنسی اشتراکیت رابرٹ اوون اور چارلس فوریئر جیسے فلسفیوں کے ان نظریات کا نعم البدل تھی جنھیں اس جوڑی نے ''خیالی اشتراکیت'' قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔'' برطانوی فلسفی جان سٹوارٹ مل کے سیاسی معیشت پر کام کی طرح'' مارکس و اینجلز سیاسی معاملات اور معاشی متغیرات' خصوصاً معاشی پالیسیوں کے مابین تعامل پر سوچ بچار میں مصروف رہے۔ مگر انھوں نے مل کے آزاد معاشی تجزیے سے ایک قدم آگے جا کر معاشیات کا ذرائع پیداوار پر تسلط کی جدوجہد کے حوالے سے جائزہ لینا شروع کیا۔

مارکس و اینجلز کا عقیدہ تھا کہ طبقاتی کشمکش تاریخی طور پر ناگزیر ہوتی ہے اور بورژوا یا تاجر طبقے کی جاگیرداروں اور زمینداروں پر فتح کے بعد لازماً پرولتاریوں یعنی مزدور طبقے کی فتح ہو گی۔ وہ محض ایک نئے معاشی نظریے کی تشکیل کے لیے ہی پرعزم نہ تھے بلکہ وہ اسے عملی جامے میں ملبوس دیکھنے کے متمنی بھی تھے۔ جن ایام میں مارکس و اینجلز نے طبقاتی جنگ کا اپنا نظریہ وضع کیا اتفاق سے ان ایام میں مزدوروں نے پورے یورپ میں شورش بپا کر رکھی تھی۔ پہلے فرانس اور پھر بیلجیئم اور جرمنی میں مسلح بغاوت پھوٹ پڑی تھی۔ مگر ان سب تحاریک کو آہنی ہاتھوں سے کچل دیا گیا تھا۔

اس کے باوجود ان دونوں مشاہیر کو یہ پختہ یقین تھا کہ یہ زمانہ ان کے حق میں ہے۔ وہ 1848ء کے اپنے اشتراکی منشور میں لکھتے ہیں:

> جدید بورژوا سماج پیداوار' تبادلے اور ملکیت کے اپنے تعلقات کے ساتھ ایک ایسا سماج ہے کہ جس نے پیدوار و تبادلے کے اتنے بڑے ذرائع حاضر کر لیے ہیں کہ اس کی مثال ایک ایسے ساحر کی سی بن گئی ہے کہ جو پاتال کی ان غیبی طاقتوں کو قابو میں رکھنے کے قابل نہیں رہا کہ جنھیں اس نے اپنے جادو کے زور پر حاضر کیا تھا...... وہ ہتھیار جن سے سرمایہ داروں نے جاگیرداری نظام کو زمین پر گرایا تھا اب ان کا رخ خود ان سرمایہ داروں کی طرف ہو گیا ہے لیکن ان سرمایہ داروں نے فقط وہ ہتھیار ہی تیار نہیں کیے کہ جو

> ان کی موت کا سبب بنیں گے بلکہ وہ ان لوگوں کو بھی وجود میں لے آئے ہیں کہ جنھوں نے ان ہتھیاروں کو اپنے ہاتھوں میں سونتنا ہے۔ یہ لوگ جدید مزدور طبقے کے لوگ ہیں...... یہ لوگ پرولتاری ہیں......لہٰذا سرمایہ دار صرف اپنے گورکن پیدا کر رہے ہیں۔ ان کی شکست اور محنت کشوں کی جیت یکساں ناگزیر ہیں۔(12)

انقلاب:

وقت گزرنے کے ساتھ مارکس و اینجلز کا ایک کامیاب اشتراکی انقلاب کا خواب شرمندہ تعبیر ہو گیا لیکن ان کی پیش گوئی کے مطابق کسی صنعتی سرمایہ دارانہ ملک میں نہیں بلکہ یہ انقلاب ایک زرعی اور نیم جاگیردارانہ ملک روس میں آیا جہاں مطلق العنان زاروں اور شاہی طبقے کے افراد کی حکومت تھی۔

اگرچہ اشتراکی پالیسیوں کے آنے سے وسیع پیمانے پر پھیلی بھوک اور فلاکت و افلاس کا خاتمہ ہو گیا اور تعلیم اور صحت عامہ کی صورتحال بہت زیادہ بہتر ہو گئی۔ تسلطی روایات خاندان اور ریاست دونوں میں بدستور موجود رہیں۔ مارکس جسے مزدور آمریت کہتا تھا عین وہی ہوا اور ایک اور متشدد مطلق العنان حکمران طبقہ وجود میں آ گیا۔

روسی ارباب بست و کشاد ریاستی سرمایہ داریت کا ایک ایسا سانچہ وجود میں لے آئے جس میں وسائل پر اوپر بیٹھے چند افراد کا تسلط قائم ہو گیا۔ ماسکو میں بیٹھے حکام اور ان کے گماشتوں کے حصے میں پرتعیش ضیافتیں اور بڑے بڑے عالیشان بنگلے آنے لگے اور عام لوگوں کو چوہوں کے بلوں جیسے چھوٹے چھوٹے بدبودار فلیٹوں میں گزر کرنا پڑی اور انھیں دو وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑنا شروع ہو گئے۔ صوبوں میں عسکریت پسندوں اور غنڈہ عناصر نے اشتراکی گماشتوں کا منصب سنبھال لیا اور لوگوں کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا۔

مسئلے کا ایک عقدہ تو خود اشتراکی رویے میں ہی مضمر تھا۔ اس نے لوگوں کو نہ صرف نجی املاک کے خاتمے اور طبقاتی جنگ کا درس دیا بلکہ یہ اس تسلطی اصول کو محو کرنے سے بھی قاصر رہا کہ اقتدار تشدد سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ مشہور کہاوت ہے نا کہ ''منزل ہاتھ آ جائے راستہ خواہ کوئی بھی لے لو۔'' لیکن اس سے بھی کٹھن مسئلہ سوویت یونین کی پیش رو ثقافت کی شدید تسلطی ماہیت تھی۔

روس کے زار بادشاہ بنیادی طور پر ایک جاگیرداری معاشرے کے آمر حکمران تھے۔ انیسویں صدی تک ابھی زرعی غلاموں کو آزاد نہیں کیا گیا تھا اور پھر یہ آزادی بھی جنوبی امریکہ کے غلاموں کی آزادی کی طرح ایک فریب ہی تھی کیونکہ حکومتی ڈھانچے میں کوئی قابل قدر تبدیلی واقع نہ ہوسکی۔ مزید برآں سوویت یونین نے ایک ایسی ثقافت اپنائی تھی جو شدید مردانہ تسلط کا شکار تھی۔ نصف انسانیت کے دوسرے نصف پر اس تسلط نے جس میں جوروکوبی اور تشدد کی دوسری شکلیں عام دیکھنے کو ملتی تھیں؛ عدم مساوات واستحصال کا ایک بنیادی سانچہ فراہم کیا۔

جنس؛ سیاست اور معاشیات کے درمیان اسی تعلق کو تاریخ جدید سے حاصل ہونے والے اہم ترین اسباق میں شمار کیا جا سکتا ہے اور یہ ہمیں سٹالن کی سفاک آمرانہ حکومت میں بہت واضح نظر آتا ہے۔ سٹالن نے برسراقتدار آنے پر مرد وعورت کی ناہمواری میں تخفیف کے لیے نافذ کردہ لینن کی پالیسیوں کو منسوخ کر دیا۔ اس دور میں سوویت یونین میں تشدد اور درجہ وار معاشی کنٹرول میں اور بھی زیادہ شدت آ گئی تھی۔ لاکھوں کسانوں اور چھوٹے زمینداروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور سٹالن کے اقتدار وحاکمیت اعلیٰ کے لیے خطرہ بننے والے بیشمار افراد کا صفایا کر دیا گیا۔ اس زمانے کے سوویت یونین کے اس شدید تسلطی رنگ کا مشاہدہ کریں تو سٹالن کی اجتماعیت پسند حکومت اور جرمن آمر ہٹلر کی فاشسٹ حکومت کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔

ہٹلر اور معروف جرمنی فلسفی فریڈرک نطشے کے لیے مساوات؛ جمہوریت؛ انسانی ہمدردی اور آزادی نسوں ''پست'' اور '''زنانہ'' نظریات کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہٹلر اور سٹالن دونوں زیادہ سے زیادہ طاقت وتسلط کے خبط میں مبتلا تھے۔ اگر ''نسلی طور پر خالص'' مردوں کو بقیہ انسانیت پر حکمرانی کا حق تھا تو مردوں کو خواتین پر حکومت کا حق بھی ہوسکتا ہے۔ (13)

سوویت یونین نے فوجی امداد؛ جارحیت اور پروپیگنڈہ کے زور پر اشتراکیت کو پوری دنیا میں پھیلا دیا اور پھر چند عشروں کے لیے نصف جہان اشتراکی لبادے میں ملبوس ہو گیا جس میں مشرقی یورپ؛ کچھ افریقی ممالک؛ چین اور دیگر ایشیائی اقوام اور حتیٰ کہ شمالی وجنوبی امریکہ کے چند ممالک بھی شامل تھے۔

پھر 1989ء میں دیوار برلن کے انہدام کے بعد سوویت یونین کی اشتراکی حکومت بھی

زمین بوس ہوگئی اور روس اور مشرقی یورپ بھی حلقہ بگوش سرمایہ داریت ہو گئے۔ چین بھی نجی کاروبار وتجارت کی طرف مائل ہوگیا اور اس نے جلد ہی (ہنوز اشتراکی پارٹی کے تحت) ایک بڑی سرمایہ داری طاقت بننے کے لیے زینے طے کرنا شروع کر دیے۔

سرمایہ داریت اور اشتراکیت کے درمیان نظریاتی ملاکھڑے میں سرمایہ داری نظام جیتو قرار پایا۔ اس کو معاشی خوشحالی کی طرف ایک عظیم قدم سمجھ کر اس کا بہت زیادہ خیرمقدم کیا گیا مگر جلد ہی یہ بات نکھر کر سامنے آ گئی کہ یہ ایک کھوکھلی فتح ہے......کم از کم عالم انسانی کی ایک بہت بڑی اکثریت کے لیے۔ ایک طرف تو بازارِ حصص بہت تیزیاں دکھانے لگے، کمپنیوں کے منافعہ جات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا اور ان کے سربراہوں کی تنخواہیں اور مشاہرے آسمان کو چھونے لگے مگر دوسری طرف خبر پر خبر اس بات کی آنے لگی کہ بنی نوع انسان کے ایک بہت بڑے حصے کے لیے حالات پہلے سے بھی ابتر ہوئے جاتے ہیں۔

اقوام متحدہ کی 2005ء میں شائع شدہ ایک رپورٹ کے مطابق افزائش افلاس کے پیچھے کارفرما ایک بڑا سبب نجی نظام معیشت کی عالمگیریت ہے۔ (14) اس کے مطابق بعض خطوں میں زچہ و بچہ کی شرح اموات میں اضافہ ہو رہا ہے اور امریکہ جیسے تونگر ملک میں بھی بچوں کا پانچواں حصہ غربت کا شکار ہے۔ اقوام متحدہ کی 2003ء میں شائع شدہ انسانی ترقیاتی رپورٹ سے یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ 1990ء کے مقابلے میں 54 ممالک مزید مفلس ہو گئے ہیں اور 21 ممالک میں غرباء کی تعداد میں کوئی کمی آنے کی بجائے الٹا اضافہ ہوگیا ہے۔ (15) گویا امید کی کرن دکھانے والی آزاد منڈی کی عالمگیریت سے معاشی حالت بہتری کی بجائے مزید پستی کی طرف جانے شروع ہو گئے۔

سرمایہ داریت واشتراکیت اور مشارکت:

سمتھ اور مارکس وانجلز کے نظریات نے ہمیں معاشیات کو سمجھنے میں بڑی مدد دی ہے۔ ان کا اپنا ایک کردار ہے اور بہت اہم ہے لیکن چونکہ ان کا تعلق ایسے معاشروں سے تھا جنھوں نے ہنوز شراکتی نظام کی طرف کوئی خاص پیش رفت نہ کی تھی، ان کے مشاہدات وتجاویز کا حیطہ زیادہ وسیع نہ ہوسکا بلکہ حقیقت کی بات یہ ہے کہ ان کے تجزیات ونظریات نے ایک بہت تنگ معاشی تناظر کو استمرار دیا۔

سمتھ نے منڈیوں کی ایک مثالی اور خیالی تصویر پیش کی۔ اس کا خیال تھا کہ منڈیاں خود ہی انصاف اور خوشحالی کو یقینی بنا دیں گی۔ وہ معاشی و معاشرتی اداروں کے بیچ کے تعامل پر توجہ نہ دے سکا۔ مارکس و اینجلز گو معاشی اداروں اور معاشرتی نظام کے درمیان کی نسبت سے آگاہ تھے، وہ اسے ایک ایسی یکطرفہ شارع تصور کرتے رہے جس میں ذرائع پیداوار کو کنٹرول کرنے والا ہی اصلی عامل تھا۔ مزید برآں مارکس کی اقتصادی تحاریر بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ منڈیوں کی تنقید پر مرکوز رہیں اور ''مزدور آمریت'' کے ذریعے اوپر سے کنٹرول کا مارکسی حل کبھی بھی مثالی اشتراکی معاشرے کی اس منزل کی شکل اختیار نہ کر سکا جس کا خواب اس نے دیکھا تھا۔ سب کے وسیع تر مفاد میں کام کرنے والی معیشت کے ہدف کو حاصل کرنے میں نہ تو سمتھ کے نظریات کامیاب ہو سکے اور نہ مارکس و اینجلز کے اور نہ ہی یہ ہدف ان معاشروں کے سیاق و سباق میں حاصل ہو پایا ہے جن کا بنیادی میلان اب بھی تسلطی نظام کی طرف ہے اور جن میں معاشی و معاشرتی ڈھانچے نیز ثقافتی اقدار تسلطی درجہ بندیوں کو استمرار دیتی ہیں اور متوجہ پالیسیوں اور وتیروں کو دباتی ہیں۔

سمتھ کی تصور کردہ آزاد منڈی کبھی بھی حقیقت کا روپ نہ دھار سکی۔ اس کا یہ مفروضہ کہ مقابلہ ذاتی مفاد کی روک تھام کر سکتا ہے۔ جے۔ پی مورگن اور کانیلیئس وانڈربلٹ جیسے خونخوار سرمایہ کاروں کے آگے کوئی بند نہ باندھ سکا جو حریفین اور یونین سازوں کو کچلنے کے لیے ہیرا پھیری، رشوت اور طاقت کو انتہائی بیہمانہ طریقے سے استعمال میں لاتے رہے۔(16)

مارکس و اینجلز کی تصور کردہ اشتراکیت بھی حقیقت کا روپ نہ دھار سکی۔ ایک منصفانہ اور مساویانہ نظام کی بجائے ان کی مساعیوں کے نتیجے میں ایک ایسا نظام برآمد ہوا جسے اوپر بیٹھے مٹھی بھر سفاک لوگ کنٹرول کرنے لگے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ محض اسے تبدیل کر لینا ہی کافی نہیں ہوتا کہ ذرائع پیداوار کو کنٹرول کون کرتا ہے۔ اگر کنٹرول کو تسلطی نظام کی حدود میں رہ کر عمل میں لایا جائے گا تو ایک قسم کے کنٹرول نزولی کی جگہ دوسری قسم کا کنٹرول نزولی لیتا چلا جائے گا جیسے کہ سوویت یونین میں ہوا جہاں بالشویک وڈیرے روسی اثاثوں پر قبضہ جما بیٹھے۔(17)

منڈی کی میکانیات پر نظریں مرکوز کر لینا بھی کافی نہیں۔ ان غیر انسانی اور غیر عقلی وتیروں

سے آگے بڑھنے کے لیے کہ جو اتنی تکلیف اور تباہی کا باعث بنتے ہیں؛ ہمیں تمام معاشی شعبوں نیز معاشیات اور معاشرتی نظام کے بیچ تعامل پر توجہ دینی ہوگی۔

معاشی نظام ایک پیہم تعاملاتی عمل میں اپنے اندر کارفرما معاشرتی ڈھانچے اور اقدار کی عکاسی بھی کرتے ہیں اور انھیں استمرار بھی دیتے ہیں۔ اگر معاشرتی ڈھانچہ اور اقدار تسلطی نظام کا رخ کرے گا تو معاشیات بھی ادھر کا ہی رخ کرے گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ جیسا کہ مارکس واینجلز نے بھی تسلیم کیا، معاشرتی ڈھانچوں اور اقدار کے تعین میں معاشی نظاموں کی ساخت وترکیب بھی بہت اہم اور بڑا کردار ادا کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایک ایسی نئی حکایت کی فوری ضرورت ہے جو بتائے کہ معاشیات کیا ہے اور یہ کیا ہوسکتی ہے۔ اس حکایت کا ایک کلیدی جزو وہ نیا معاشی نظریہ ہے جس میں سرمایہ داریت اور اشتراکیت کے شراکتی عناصر بھی شامل ہیں مگر یہ ان دونوں سے بالا جا کر اس بات کی یقین دہانی بھی کراتا ہے کہ انسانی ضرورتوں کی تشفی اور افرادی صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکے اور ہمارا یہ قدرتی مسکنی خرابی سے بچا رہے۔

میں ارتقاء پذیر اس نئے نظریے کو شراکت کا نام دیتی ہوں۔ یہ نظریہ ہنوز نشوونما کے مرحلے میں ہے اور اس کو پروان چڑھانے کے لیے بہت سے افراد کی محنت اور ذہانت درکار ہے۔ درحقیقت ایک مکمل وضع کا شراکتی معاشی سانچہ غالباً اس وقت تک وجود میں نہیں آ سکتا جب تک کہ ہم تسلطی روایات کی گرفت مزید ڈھیلی نہیں کر دیتے لیکن اگر ہم اپنے بے مثل عالمی مسائل کا ایک موثر طریقے سے جواب دینا چاہتے ہیں تو ہمیں معاشی فکر کی نئی روشیں اختیار کرنا ہوں گی اور مجھے یقین ہے کہ ہم میں ایسا کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

اب جبکہ ہم بعد الصنعتی معیشت (انفارمیشن اکانومی) کی طرف گامزن ہیں، جو چیز واضح ہو کر سامنے آ رہی ہے اسے نہ تو سرمایہ داری نظریہ پہچان سکا اور نہ ہی اشتراکی۔ وہ بات یہ ہے کہ ایک صحت مند معیشت اور معاشرے کے لیے ایک ایسا معاشی نظام درکار ہے جو زیادہ سے زیادہ انسانی ترقی کو فروغ دے سکے۔ (18) اس کے برعکس شراکت اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ اعلیٰ پائے کے انسانی سرمائے...... یعنی انسانی صلاحیتوں...... کی نشوونما (ایک صحت مند قدرتی ماحول کے ساتھ) ایک کامیاب معیشت کا سب سے قیمتی جزو ہے۔ جیسا کہ

امریتا سین کا کہنا ہے معاشی پالیسی کا منتہائے مقصود فی کس آمدنی میں اضافہ نہیں بلکہ ہر شخص کی انسانی صلاحیتوں کی زیادہ سے زیادہ نشوونما ہونی چاہیے۔(19)

اب بات آتی ہے پرانے نظریات سے منسلک اگلے مسئلے کی طرف۔ یہ مسئلہ یہ ہے کہ یہ نظریات حکمائے معاش کی زبان میں ''تولیدی محنت'' کہلانے والی یعنی زندگی دینے اور زندگی کی نگہداشت کرنے والی محنت سے منتج ہونے والی انسانی ترقی کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ عصر حاضر کی نفسیات اور عصبی سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ بچوں کو میسر آنے والی توجہ و نگہداشت کا معیار افراد کی صلاحیتوں کی نشوونما پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ عصبی سائنس کے میدان میں کی گئی تحقیقات ظاہر کرتی ہیں کہ ہمارے بچپن کے تجربات ہماری دماغی نشوونما پر بہت گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ عصبی نفسیات کے ماہر بروس پیری کا کہنا ہے کہ ''انسانی زندگی کے یہی ایام ہیں جن میں سماجی' جذباتی' علمی اور جسمانی تجربات ہمارے عصبی نظاموں کو اس طرح تشکیل دیتے ہیں کہ جو ساری عمران کے عمل کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔''(20) پیری اور دیگر سائنس دانوں کو یہ بات بھی پتہ چلی ہے کہ زیادتی اور غفلت کے شکار بچوں کے دماغ کا حجم بھی معمول سے کم ہوتا ہے لہٰذا ان میں ذہنی و جذباتی نشوونما کی صلاحیت بھی کم ہوتی ہے۔''(21)

یہ سائنسی علم اس بات کا متقاضی ہے کہ معاشی نظریے کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمیں توجہ ونگہداشت کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ وظیفہ زیادہ پیداواری معیشت کے لیے ایک لازمے کی حیثیت رکھتا ہے۔

جب ہم معاشیات میں توجہ وفکرمندی کی اہمیت سے آگاہ ہو جاتے ہیں تو ہمیں اس بات سے بھی آگاہی ہو حاصل جاتی ہے کہ ہمارے بہت سے سماجی و ماحولیاتی مسائل ان معاشی اصولوں' وتیروں اور پالیسیوں کا نتیجہ ہیں جو توجہ و احساس کے فقدان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ اکثر اوقات اس کا تقاضہ بھی کرتے ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ بیشتر ماہرین اقتصادیات کے ہاں توجہ وفکرمندی کا ذکر تک بھی نہیں ملتا بہت وحشت ہوتی ہے۔ تاہم اس رویے کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں کیونکہ ان دونوں نظریات کا کہ جنھوں نے جدید معاشیات کی صورت گری کی ہے' تعلق ان ایام سے ہے جب اکثر انسان مرد کے عورت پر تفوق و برتری کو ایک عادی چیز سمجھ کر تسلیم کرتے تھے اور اس کے ساتھ مردانہ کی بجائے ''زنانہ'' تصور کی جانے والی کسی بھی شے (مثلاً توجہ ونگہداشت) کی تقلیل قدر بھی معمولی بات تصور ہوتی تھی۔

سمتھ ایک طرف خواتین سے تو یہ آس لگاتا تھا کہ وہ دوسروں کی بے لوث خدمت کریں مگر دوسری طرف وہ ''نسوانی کام'' کو غیر پیداواری گردانتا تھا اور عورتوں کی غلامی کو فطری امر قرار دیتا تھا۔ مارکس و انیجلز کی تحاریر میں ''نسوانی مسئلے'' کا ذکر ملتا ہے اور اس مسئلے کی بابت ان کا رویہ قدرے متذبذب محسوس ہوتا ہے مگر انھوں نے مردانہ تسلط کی مذمت بہر کیف ضرور کی ہے لیکن خواتین کی گھریلو معاشی خدمات کی قدر و قیمت کو تسلیم کرنے کی بجائے انھوں نے بھی اس نگہداشتی کام کو ''پیداواری'' کی بجائے ''تناسلی'' کھاتے میں ہی شامل کیا ہے اور چونکہ ان کی ساری توجہ اس بات پر مرکوز تھی کہ ذرائع پیداوار کس کے ہاتھ میں ہیں، خواتین کے اس کام کو ان کے معاشی تجزیات میں زیادہ اہمیت نہ مل سکی۔

جہاں تک فطرت کا سوال ہے تو اس کے مد حیات وظائف کو نہ تو سمتھ کے نظریات میں کوئی جگہ مل سکی اور نہ ہی مارکس کے۔ ان کے نزدیک فطرت کا کام بس یہی ہے کہ اس کا خوراک، رہائش اور صنعت میں کام آنی والی خام اشیاء کے لیے استحصال کیا جائے۔ چونکہ یہ نظریات ان مد حیات وظائف کو اہمیت نہیں دیتے جو گھر میں رضا کارانہ معیشت اور قدرتی معیشت میں سرانجام دیئے جاتے ہیں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ادھورے معاشی سانچے پر مبنی ہیں۔ وہ معاشی سرگرمی اور استمرار کے لیے ضروری وظائف کو محض جزوی انداز میں غور میں لاتے ہیں۔

صرف یہی نہیں یہ نظریات انسانی احتیاجات کے ایک ادھورے سانچے پر اساس کرتے ہیں۔ وہ صرف ہماری مادی بقاء کی ضرورت پر ہی تردد کرتے نظر آتے ہیں۔ غالباً ان کے زمانے میں یورپ میں ہر اور پھیلی غربت اس کا سبب تھی۔ ان نظریات میں اس بات کی کوئی جھلک نہیں ملتی کہ مادی گزران کے علاوہ بھی ہماری بعض بنیادی ضروریات ہیں۔

جیسا کہ ہمیں اپنے اردگرد ہر طرف نظر آ رہا ہے، موجودہ معاشی ڈھانچے، پالیسیاں اور وتیرے انسان کی مادی ضروریات سے بھی بطریق احسن عہدہ برآ نہیں ہو پا رہے۔ ہماری شخصی وقار، معنویت، توجہ و تعلق اوور جبر سے نجات کی ضروریات کی تو خیر بات ہی کیا کرنی ہے۔ ایسے نظاموں کی تشکیل کے لیے کہ جو ان دونوں قسم کی حاجات و احتیاجات سے صحیح طرح عہدہ برآ ہو سکیں، ہمیں ایک ایسے معاشی نظریے کی ضرورت ہے جو ارتقاء اور اس عالم کے پیہم آشکار ہوتے ڈرامہ حیات میں ہمارے مقام سے ایک زیادہ مکمل آشنائی پر مبنی ہے۔(22) اس

نظریے کی اس بات سے آشنائی ضروری ہے کہ ارتقاء کے اس سفر میں عورت اور مرد دونوں توجہ وطباعی اور شعور کے لیے ایک انتہاء درجے کی استعداد پیدا کر چکے ہیں اور ایک ایسے نظام کے لیے کہ جو سب کے مفاد کی تکمیل کر سکے، ایسے اصولوں اور وتیروں کی ضرورت ہے جو اس استعداد کو مارنے کی بجائے اس کی حوصلہ افزائی کر سکیں۔ اگر ہم ایسے معاشی نظاموں کو معرض وجود میں لانا چاہتے ہیں جو تواضع وتخلیق اور آگہی کی ہماری زریں اور ہمیں صحیح معانی میں انسان بنانے والی استعداد کو جلا دے سکیں تو اس امر کی طرف توجہ مبذول کرنا ازبس ضروری ہے۔

علاوہ ازیں ہمیں ایک ایسے معاشی نظریے کی فوری ضرورت ہے کہ جو ارباب اختیار کو یہ باور کرا سکے کہ محض قلیل المدتی ترجیحات کو ہی مدنظر رکھنا کافی نہیں۔ امریکہ کے سیکیورٹی ایکسچینج کمیشن کے کمپنیوں سے سہ ماہی رپورٹ کے مطالبے کی طرح کے بہت سے مروجہ معاشی اصول کمپنیوں کو صرف قلیل المدتی اہداف پر توجہ دینے پر مجبور کرتے ہیں لیکن بات واضح ہے کہ ہمیں اپنے کمزور سے کمزور تر ہوتے ماحولیاتی نظاموں کو بچانے کے لیے طویل المدتی منصوبہ بندی انتہائی ضروری ہے۔ اس طرح ہمیں جدید حرفتوں کے دوررس اثرات کا جائزہ بھی لینا ہو گا اور اس بات کو بھی مدنظر رکھنا ہو گا کہ اگر ہم آنے والے وقتوں کو ذہن میں رکھ کر فیصلے نہیں کرتے تو ہماری آنے والی نسلوں کو اس کی بہت بڑی قیمت چکانا ہو گی۔ بعد الصنعتی معیشت کے لیے درکار انسانی سرمائے میں سرمایہ کاری کے لیے بھی طویل المعیادی منصوبہ بندی لازمی ہے اور یہ سرمایہ کاری ہمارے اپنے اور ہماری آئندہ نسلوں کے لیے ایک زیادہ منصفانہ اور کم متشدد دنیا کی تعمیر کے لیے کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔

مزید برآں جیسا کہ میں نے پہلے باب میں بھی تحریر کیا ہے، کسی معاشی وظیفے کی قدر کی صحیح آنک کے لیے ہمیں وقت کے متغیر کو بھی پیش نظر رکھنا ہو گا۔ عدالتی نظام پر آنی والی لاگت میں تخفیف اور جرائم کی روک تھام کے لیے ضروری اچھی نگہداشت اور تعلیم پر آنے والے اخراجات کے تقابل کو سامنے رکھ کر لوگوں نے اب اس طرف توجہ دینا شروع کر دی ہے۔ ہمیں ایسے معاشی نظریات کی ضرورت ہے جو ہر معاشی سرگرمی کے طویل المعیادی نتائج کو بھی مدنظر رکھیں اور ان کی اصل لاگت کو بھی (مثال کے طور پر کسی جرم کے نتیجے میں معیشت پر پڑنے والا بار) اور ضائع ہونے والی صلاحیت کا خسارہ (مثلاً اگر کسی شخص کو ابتدائے عمر میں مناسب توجہ و

نگہداشت مل جاتی تو معاشرے کے لیے کتنے فائدے اور نفعے کا باعث بنتا۔) ماہرین معاشیات تعین قدر کے لیے بڑی مساواتیں استعمال کرتے ہیں اور ان کے نظریات وحسابات میں وقت کا یہ متغیر مسلسل غائب چلا آتا ہے۔

شراکتی معاشی نظریے کو اس پر بھی غور کرنا ہوگا کہ جو آج کل ہم نظاموں کی خود تنظیمی کے بارے میں سیکھ رہے ہیں اور یہ کہ معاشی اصول اور معاشی ڈھانچے کیسے پیہم ایک دوجے سے متعامل رہتے ہیں۔ اسے یہ پتہ چلانا ہوگا کہ کس قسم کے معاشی ڈھانچے موثر اور منصفانہ ہیں۔ اسے اس بات کی کھوج بھی کرنا ہو گی کہ معاشی اداروں کی ترکیب کا دیگر اداروں مثلاً خاندانوں' حکومتوں وغیرہ سے کیا واسطہ ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ ایک نئے معاشی نظریے کو یہ باور کرنا ہو گا کہ غیر متواضع پالیسیوں' اصولوں اور وتیروں کے پیچھے کارفرما معاشی و معاشرتی ڈھانچوں کو تبدیل کیے بغیر کسی ایسے نظام کی آس نہیں لگائی جا سکتی کہ جو طویل المدتی معاشی صحت' ماحولیاتی تحفظ اور منصفانہ تعلقات کو ہر جہت میں فروغ دے سکے۔

معاشیات اور تعلقات:

معاشیات کے ایک جدید نظریے اور حکایت کی تشکیل کے لیے تعلقات کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ تعلقات پر تامل سے ہم اس بات کا پتہ چلا سکتے ہیں کہ کون سی چیز ہمیں پیچھے رکھے ہوئے ہے اور آگے بڑھنے کے لیے ہمیں کیا درکار ہے۔

اس کے لیے میں نے اپنی تحقیق میں جو طریقہ کار استعمال کیا ہے میں اسے ''تعلقاتی حرکیات'' کا نام دیتی ہوں۔ اس سے میری مراد دو کلیدی حرکیات کا مطالعہ ہے۔ اول یہ کہ ایک پیہم متعامل وخود تنظیمی عمل میں کسی سماجی نظام کے مختلف اجزاء کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہوتا ہے اور دوم یہ کہ اس نظام کے اندرون لوگوں کے ایک دوسرے سے اور قدرتی ماحول سے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بات کر چکے ہیں' یہ دونوں قسم کے تعلقات، اس چیز پر انحصار کرتے ہوئے کہ کہ کوئی ثقافت یا ذیلی ثقافت خط شراکت وتسلط کے کسی ایک سرے کی جانب کس درجہ مائل ہے' مختلف ہوتے ہیں۔ تسلطی نظام میں خواہ یہ خاندان ہوں' سیاست ہو یا معاشیات' اوپر والے نیچے والوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اس کے برعکس شراکتی نظام باہمی احساس اور احترام

کے تعلقات کو فروغ دیتا ہے۔ جب تلک کسی ثقافت کی بناء بنیادی طور پر تسلطی نظام پر استوار رہے گی، ہم غیر منصفانہ، غیر موثر اور ماحولیاتی اعتبار سے تباہ کن معاشی پالیسیوں اور وتیروں سے دامن نہیں چھڑا سکتے۔ ہم فقط شراکتی نظام کی طرف قدم بڑھا کر ہی ایسی پالیسیوں اور وتیروں کو رواج دے سکتے ہیں جو ہماری بقا کے بنیادی تقاضوں کی تکمیل کر سکیں اور ہماری تخلیق وتوجہ اور معانی واخوت کی احتیاجات، بہ الفاظ دیگر ہمارے اعلیٰ ترین انسانی امکانات کی تکمیل کر سکیں۔

اس تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ معاشی نظریے اور سانچے محض معاشیات ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے کے تعلقات کی حرکیات پر غور کریں۔ ان وسیع تر تعلقاتی حرکیات کا معاشی فکر میں اشتمال قدرتی و معاشرتی علوم کی ان اہم دریافتوں سے استفادہ ممکن بناتا ہے کہ جنھیں روایاتی نظریات میں نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

ہم اس سائنسی دریافت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے کہ ابتدائے عمر کے تجربات وتعلقات ایک صحت مند معیشت کے لیے درکار صلاحیتوں کی افزائش میں ایک کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ نفسیات اور عصبی سائنس کے میدان میں کی گئی جدید تحقیق ان صلاحیتوں کی ترقی ونشوونما میں ان تعلقات کی اہمیت کو آشکار کرتی ہے جو افراد کو اچھے کارکن، ذمہ دار شہری اور مطمئن انسان بناتے ہیں۔

اسی طرح ہم معاشی خوشی، انصاف اور خواتین کی سماجی حیثیت کے درمیان موجود نسبت سے بھی صرف نظر نہیں کر سکتے۔ ہم ''خواتین، حضرات اور عالمی معیار زندگی'' جیسی تحقیقات کے بارے میں پہلے بھی بات کر چکے ہیں جنھوں نے اس حقیقت کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیا ہے کہ کسی معاشرے میں اعلیٰ معیار زندگی اس وقت تک ممکن نہیں کہ جب تک اس میں خواتین کو ان کا جائز مقام نہیں دے دیا جاتا۔(23)

یہ تحقیقات اس چیز کی تجربی تصدیق کرتی ہیں جس تک ماہرین معاشیات وجدانی طور پر آج سے سو سال قبل ہی پہنچ چکے تھے۔ مثال کے طور پر شارلٹ پرکنز گلمین نے 1858ء کی اپنی مقبول عام تصنیف ''معاشیات اور خواتین'' میں یہ خیال پیش کیا تھا کہ ایک زیادہ منصفانہ اور پیداواری معاشی نظام کے لیے خواتین کو مساوی مواقع کی فراہمی ضروری ہے۔ 1858ء ہی میں تھارسٹن ویبلن کی ہاتھوں ہاتھ بکنے والی کتاب ''نظریہ اہل فراغت'' میں خواتین کو

''جاہلانہ درجہ'' دیے جانے کی مذمت کی گئی ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ نسوانی وظائف کو ''معاشی بہم رسانی'' میں شمار کیا جائے۔(24)

لیکن یہ نظریات نصابی کتب کے توسط نسل در نسل منتقل ہونے والے اقتصادی فقہ کا حصہ نہ بن سکے۔ بیسوی صدی کے دوسرے نصف تک امریکہ کی اقتصادی درسگاہوں میں دیے جانے والے دروس زیادہ تر منڈی کی پیداوار اور صرف سے اور اس بات سے ہی بحث کرتے رہے کہ ایک ''منطقی معاشی شخص'' خودغرضانہ ذاتی مفاد پر مبنی انتخابات کیسے عمل میں لاتا ہے۔ اگر کہیں خاندان کی اکائی کا ذکر چھیڑا بھی گا تو محض اس افسانے کے اعادے کے لیے کہ آدمی گو بازار میں خودغرضی پر مبنی رویوں کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن جب اس کے خاندان کی بات آتی ہے تو وہ کاملاً بے لوث ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمارے مطالعے میں آنے والے تحقیقات ہمیں بتاتی ہیں کہ بہت سے مرد اپنے معاشی وسائل کو اپنے کنبوں کی بہبود کے لیے استعمال نہیں کرتے۔

ہاں البتہ جان مینارڈ اور جان کینتھ گالبریتھ جیسے بیسویں صدی کے بعض حکماء ایسے بھی تھے جنھوں نے ان سے مختلف نظریات کا پرچار کیا۔ اگرچہ ان کا زیادہ دھیان بھی منڈیوں پر ہی رہا، انھوں نے حکومتی ضوابط کی ضرورت پر بہت زور دیا۔ ان کے ذہن میں انسانی بہبود کا بڑا خیال تھا اور جہاں تک گالبریتھ کا تعلق ہے تو اس نے اس مسئلے پر بھی خامہ فرسائی کی کہ جدید مغرب کے جمہوری معاشروں میں بھی خواتین کو کس طرح چاکری کی زندگی پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔(25) پھر اداراتی معاشیات اور اقتصادی عمرانیات جیسی علمی شاخیں بھی منظر عام پر آئیں جن میں اس بات کو تسلیم کیا گیا کہ روایتی تجزیے حقیقت کی غلط عکاسی کرتے ہیں کیونکہ وہ معاشیات کے ثقافتی سیاق وسباق کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔(26)

لیکن بیشتر صورتوں میں اور بیشتر اعتبار سے امریکہ کی اقتصادی درسگاہوں کا قبلہ وکعبہ منڈی ہی رہا۔ درحقیقت اب معاشیات بنیادی طور پر تجریدی نظریات اور ریاضیاتی مساواتوں کا علم بن گیا ہے جس میں اس بات کو شامل نہیں کیا جاتا جو ہماری زندگیوں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ یعنی اس میں ہمارے ایک دوسرے سے اور ہمارے اپنی مادرارضی سے ان تعلقات کی بات ہی نہیں ہوتی کہ جن کو شامل کیے بغیر کسی حقیقی معاشی منظرنامے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔(27)

آج کے دور میں روزبروز زیادہ سے زیادہ معاشی مفکرین معاشیات کو ایک وسیع

تزاویے سے ملاحظہ کرنے میں مصروف ہیں۔ امرتیہ سین' ہرمن ڈالی' پال ہاکن' ڈیوڈ کورٹن' پال کرگمین' مینفر ڈمیکسنیف' رابرٹ ریش' ہرنانڈو ڈی سوٹو اور جوزف سٹگلٹز جیسے مشہور و معروف حکمائے معاش اس امر کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ آج کا دور ہمارے سیارے کی تاریخ کا مشکل ترین دور ہے۔ یہ سب اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ آج کے تیز رفتار معاشی و حرفتی تغیر سے پیدا ہونے والی خلفشار' تشدد و دہشت گردی میں اضافہ' زرداروں اور ناداروں کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج پوری کی پوری انواع کی ناپیدگی اور ہمارے اس قدرتی مسکن کو لاحق مہیب خدشات عادلانہ اور ماحولیاتی اعتبار سے زیادہ ذمہ دار معاشی نظام کے متقاضی ہیں۔

باربرا برانت' ایڈگرکان' نینسی فولبر' جینٹ گورنک' مونا ہیرنگٹن' ہیڈی ہارٹمین' ہیزل ہینڈرسن' ڈنکن آئرن مونگر' خولی نیلسن' ہلکا پائتلا اور میریلن وارنگ جیسے ایسے مفکرین کہ جن کے کام کو زیادہ شہرت نہیں مل سکی نے بھی اپنی تحاریر و تصانیف میں معاشیات پر نظرثانی کی ضرورت پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ یہ ماہرین خاندانی اور رضا کارانہ معیشت کے اقتصادی کردار کو معاشی تجزیات میں شامل کر کے انھیں ایک انتہائی اہم نئے سنگ میل تک لے آئے ہیں۔(28)

ان خواتین و حضرات کی مشترکہ رائے یہ ہے کہ معاشی نظریے کو منڈی سے وراجا کر بھی سوچنا چاہیے اور توجہ و نگہداشت کی قدر و اہمیت کا اعتراف بھی کرنا چاہیے۔ نیلسن کا کہنا ہے کہ ''یہی انداز فکر اختیار کیے رکھنے سے کہ معاشیات کا متوجہ اور اخلاقی رویے سے کوئی واسطہ نہیں اور یہ کہ وہ ایسے رویوں کی دشمن ہے' توجہ و نگہداشت کو کوئی مقام نہیں مل سکتا۔''(29)

فولبر کی تصنیف ''قلب نادیدہ'' کا مرکزی خیال بھی یہی ہے۔ وہ اس کتاب میں لکھتی ہیں کہ ہم توجہ و نگہداشت کے ان وظائف کو جنھیں کہ روایتی طور پر خواتین گھروں میں سرانجام دیتی ہیں پیش نظر رکھے بغیر معاشیات کو نہ تو سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس میں کوئی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ (30) پائتلا کہتی ہیں کہ ''آج بھی اکثر خاندانوں کی یومیہ خوشحالی میں واحد سب سے بڑا حصہ بلامعاوضہ اور غیر بازاری کام کا ہوتا ہے۔''(31) فولبر کی طرح ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ مروجہ معاشی سانچے قدرت کے ممد حیات وظائف کو خاطر میں لانے سے قاصر ہیں۔

ہینڈرسن نے کچھ اس طرح کی بات کی ہے کہ مروجہ معاشی افکار (اور مقیاسات) گھر اور

بھائی بندی کی رضا کارانہ خدمات کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ پوری معاشی عمارت ان پر استوار ہے مگر منڈی کی معیشت ان خدمات اور ان خدمات کے کردار کو ہڑپ کر جاتی ہے۔ انھوں نے ان معاشی مقیاسات پر بڑی کڑی تنقید کی ہے کیونکہ وہ ''مستحبات'' اور ''مکروہات'' یعنی ان چیزوں کے درمیان کہ جو انسان اور قدرتی ماحول کو فائدہ یا نقصان پہنچاتی ہیں' امتیاز نہیں کرتے۔ برانت' ولبر' ہیرنگٹن' ہارٹمین' نیلسن' پاتلا' وارنگ اور خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والے دیگر ماہرین معاشیات کی مانند انھوں نے بھی توجہ ونگہداشت کے فریضے کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔

یہ متبادل معاشی تجزیات ایک شراکتی اقتصادی نظریے کی توضیع وتشکیل کے لیے اہم بصائر فراہم کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے شروع میں دیکھا' یہ تجزیات اس معاشی ڈھانچے کے لیے اینٹیں اور سلیں مہیا کرتے ہیں جس میں کہ وہ چھ کے چھ شعبے آ جاتے ہیں کہ جن سے معاشی نظام تشکیل پاتے ہیں: خاندانی معیشت' رضا کار معیشت' منڈی کی معیشت' غیر قانونی معیشت' سرکاری معیشت اور قدرتی معیشت۔

اگر ہم ان سب معاشی شعبوں کا اقبال کر لیں تو ہم معاشیات کے ایک نئے نظریاتی ڈھانچے کی داغ بیل ڈال سکتے ہیں۔ یہ نظریاتی ڈھانچہ ایسے ہی یکبارگی کھڑا نہیں ہو جائے گا۔ ان نظریات کے بہت سے ذیلی زمرے بھی ہوں گے۔ (32) لیکن دنیا میں زیادہ متواضع ڈھانچوں اور اصولوں کی طلب بڑھنے پر ہم معاشیات کی نظرثانی اس نہج پر شروع کر سکتے ہیں کہ جو معاشی پالیسیوں اور وتیروں میں مثبت تغیرات کی حوصلہ افزائی کر سکے۔

ان تغیرات کا آغاز پہلے معاشی شعبے یعنی خاندان سے ہوتا ہے جس میں ایک فعال معیشت کے لیے درکار افرادی قوت کی تخلیق ونگہداشت کی جاتی ہے۔ہمیں ایسے معاشی مقیاسات کی ضرورت ہے کہ جو گھر میں سرانجام دیے جانے والے نگہداشتی وظائف کی قدر وقیمت کو ملحوظ خاطر رکھیں۔ پھر ہمیں ایسی معاشی ایجادات کی بھی ضرورت ہے جو ان خدمات کی جزا اس صورت میں ادا کریں کہ جس سے کسی کے دسترخوان پر رونق ہو سکے اور وہ مکان کا کرایہ دینے کے بھی قابل ہو سکے۔نگہداشت اطفال کے لیے الاؤنسوں اور مع تنخواہ رخصت والدینی کی طرح کے ایسے بعض اقدامات پہلے ہی عمل میں آ چکے ہیں۔اب ضرورت اس امر کی ہے کہ پوری دنیا میں ان پر عمل کیا جائے۔ہمیں اس طرح کے اور بھی بہت سارے اقدامات

کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ اس معیاری انسانی سرمائے کی تیاری کے لیے اشد ضروری ہیں جس کے بارے میں آج کل بہت تبصرے سننے میں آتے ہیں۔

توجہ ونگہداشت کوعوامی معیشت میں قدر تفویض کرنے والی ایک معاشی ایجاد:

وکیل عام، مصنف، یونیورسٹی پروفیسر اور سماجی کارکن ایڈگر کان نے ایک عوامی کرنسی کا تصور دیا ہے جسے وہ ''وقتی ڈالروں'' کا نام دیتے ہیں۔ محض حکومت کے جاری کردہ نوٹوں پر انحصار کی بجائے لوگ یہ وقتی ڈالر دوسروں کی مدد کے لیے اپنی مہارات و وسائل کو استعمال کر کے کما سکتے ہیں۔ یہ مدد بچوں اور معمر افراد کی دیکھ بھال، نقل وحمل، کھانے پکانے اور گھر کی جھاڑ پونچھ اور زیبائش کی صورت میں بھی کی جا سکتی ہے۔ جس پر یہ افراد ان وقتی ڈالروں کو اپنے اور اپنے کنبے کے لیے مدد حاصل کرنے پر اور کوئی ایسی کلب کی رکنیت حاصل کرنے پر صرف کر سکتے ہیں کہ جس سے انھیں مقامی کمپنیوں سے خوراک یا علاج رعایتی نرخوں پر مل سکے۔ وقتی ڈالرں کو ''مخلوط پیداوار'' کے آلات کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے جو کہ یکطرفہ خیر کو باہمی تبادلہ میں یا بزبان کان، بے لوث فیاضی کو امداد حاصل کرنے والوں کی خود توشیقانہ خدمات کے لیے ایک مہمیز میں تبدیل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

ان کے اپنے الفاظ میں ''مخلوط پیداوار توجہ ونگہداشت کو حقیقی قدر تفویض کرتی ہے اور پیداواری کام کی تعریف نو اس طرح کرتی ہے کہ اس اصطلاح کا اطلاق بازاری اجناس وخدمات کے علاوہ بیرون بازار دیگر وظائف وخدمات پر بھی ہو سکے۔''(33)

پروفیسر کان کے وقتی ڈالروں کے سماجی مسائل کے علاج کے لیے ایک معاشی حکمت عملی کے طور پر استعمال کا اطلاق امریکہ کی چھتیس ریاستوں نیز سویڈن، جاپان اور کینیڈا میں بھی کیا جا رہا ہے۔

وقتی ڈالروں کے ادارے اور مخلوط پیداوار کے متعلق مزید تفصیلات جاننے کے لیے ملاحظہ فرمایئے۔ www.timedollar.org

دوسرے معاشی شعبے یعنی بلا معاوضہ معیشت میں بھی رضا کاروں کے نگہداشتی وظائف کا اعتراف سفری اخراجات میں اعانت اور بلااجرت خدمات انجام دینے کے صلے میں ''مراعات'' بہم پہنچا کر کیا جا سکتا ہے۔ اس انتہائی اہم کام کی حقیقی قدر وقیمت کے اعتراف

کے لیے مبادلے کے ان مقامی نظاموں کو بھی استعمال میں لایا جا سکتا ہے جن میں شہری یا چھوٹے کاروباری ادارے اشیاء و خدمات کا ایک دوسرے سے تبادلہ کرتے ہیں۔ ایڈگر کان کی ایجاد کردہ وقتی ڈالروں کی کرنسی اس کی ایک اہم مثال ہے۔

تیسرے یعنی بازاری معیشت کے شعبے میں بھی ایسی معاشی ایجادات کی ضرورت ہے جس سے توجہ و نگہداشت کو مناسب قدر و قیمت مل سکے۔ اس طرح کی کچھ ایجادات پہلے ہی منظر عام پر آ چکی ہیں۔ مثال کے طور پر نگہداشت اطفال، تیمارداری، معمر افراد کی دیکھ بھال کے لیے بہتر تربیت اور اجرت کی تجویز کافی عرصے سے سامنے آ چکی ہے اور اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ ایک جیسی تربیت اور ہنر کے متقاضی پیشوں میں ایک جیسی تنخواہ دی جانی چاہیے۔

منڈی میں توجہ و نگہداشت کو قدر و اہمیت دینے والی ایک اور معاشی ایجاد معاشی طور پر ذمہ دار انویسٹمنٹ فنڈ کی تیزی سے بڑھتی صنعت ہے جو سرمایہ کاروں کو متوجہ کاروباری وتیروں اور پالیسیوں کی حوصلہ افزائی واسطے ایک وسیلہ مہیا کرتی ہے۔ یہ لوگوں کے لیے اس بات کو ممکن بناتی ہے کہ وہ ان کاروباری اداروں کے حصص رد کر دیں جو اپنے ملازمین، گاہکوں، صارفین، علاقے اور قدرتی ماحول کی بہبود پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔(34)

علاوہ ازیں جیسا کہ میں اس باب کے آخر میں تفصیلاً بیان کروں گی ہمیں ایسے معاشی اصولوں اور ڈھانچوں کی ضرورت ہے جو اس بات کو یقینی بنائیں کہ کاروباری اداروں کو ایسی ترغیبات دی جائیں جس سے وہ زیادہ متوجہ طرز عمل اختیار کریں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ بعض کاروباری اداروں کے ناظمین اس بات سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی کہ ان کے اداروں کے طرز عمل سے صحت عامہ اور ماحول کو کس قدر نقصان پہنچ رہا ہے، دانستہ اس علم کو چھپائے چلے جاتے ہیں کیونکہ وہ سوچتے ہیں کہ انھیں کوئی نہیں پوچھے گا۔(35) لیکن زیادہ مسئلہ یہ نہیں کہ لوگ برے ہیں بلکہ برے وہ معاشی اصول ہیں جو تسلطی معاشی ڈھانچوں اور تعلقات سے پیدا ہوتے ہیں اور پھر انھیں برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان اصولوں کو بدلنا بہت ضروری ہے اور انھیں بدلا بھی جا سکتا ہے۔

اس کا مطلب منڈیوں کو مرکزی منصوبہ بندی سے تبدیل کرنا نہیں ہے۔ اگرچہ مرکزی منصوبہ بندی کی بھی یقیناً ضرورت ہے۔ منڈیوں کا ایک اپنا منصب ہے۔ منڈیاں ایک صحت

مند معیشت میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں لیکن منڈی کی مروجہ قدر پیمائیوں کے لیے اکثر و بیشتر ثقافتی اقدار کے ایک منحنی نظام کو بنیاد بنایا جاتا ہے اور جسے کہ عرف عام میں طلب و رسد کی حرکیات کہا جاتا ہے اصل میں غیر صحت مند مصنوعات کے لیے مصنوعی طور پر پیدا کی گئی طلبات پر مشتمل ہوتا ہے اور موجودہ معاشی اصول کاروباری اداروں کو درحقیقت اس بات پر ابھارتے ہیں کہ وہ منافعہ جات کا حساب اس انداز سے کریں کہ جس سے انسان اور فطرتی دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

اب آتے ہیں ہم چوتھے معاشی شعبے یعنی غیر قانونی معیشت کی طرف جو کہ انسان اور فطرت کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ چونکہ عالمگیریت کے طفیل قانونی و غیر قانونی تجارت کی راہ میں حائل دیواریں پست ہوگئی ہیں، غیر قانونی معیشت کھربوں ڈالر کی صنعت میں تبدیل ہوچکی ہے۔ 1992ء سے لے کر 2002ء تک کے درمیانی عرصے میں منشیات کی عالمی تجارت دگنی ہوکر 900 بلین ڈالر سالانہ تک پہنچ چکی تھی۔ اس میں 630 بلین ڈالر سالانہ کی ممنوعہ اشیاء کی تجارت کو بھی شامل کر لیجیے۔ 100 بلین ڈالر سالانہ غیر قانونی اسلحے کی تجارت کے بھی ہیں جس سے افریقہ، ایشیا، شرق الاوسط اور لاطینی مریکہ کے گوریلوں اور دہشت گردوں کی مانگ پوری کی جاتی ہے۔ (36) سب سے زیادہ تیزی سے ترقی کرتی ہوئی اور سب سے زیادہ منافع بخش غیر قانونی تجارت انسانی سمگلنگ ہے۔ ہر سال لاکھوں افراد کو جن میں بچے بھی شامل ہوتے ہیں جنس کے بازار میں غلاموں کی حیثیت سے بیچ دیا جاتا ہے۔ یونیسیف کے مطابق فقط ایک ملک البانیہ سے ایک لاکھ لڑکوں اور عورتوں کو سمگل کیا جا چکا ہے جن میں سے بیشتر کو ان کے اپنے گھر والوں نے ہیرا منڈیوں کی زینت بننے کے لیے فروخت کیا ہے۔ (37)

یہ سب کچھ توجہ و احساس کے فقدان کے سبب جاری و ساری ہے۔ غیر قانونی معیشت کے اس سطح پر پہنچنے کا سبب یہ ہے کہ ہر درجے کے سرکاری حکام خود بھی اکثر و بیشتر کسی نہ کسی طرح اس میں ملوث ہوتے ہیں یہاں تک کہ بعض جگہوں میں تو وہ مجرمین کے گروہوں میں شراکت دار بھی ہوتے ہیں۔

اب باری ہے پانچویں معاشی حلقے یعنی سرکاری معیشت کی۔ یہ فرض حکومت پر عائد ہوتا ہے کہ وہ ایسی پالیسیاں وضع اور نافذ کرے جو ملک کے شہریوں کے تحفظ و خوشحالی کو یقینی

MashalBooks.com

بنائیں۔ سوائے امریکہ کے بیشتر صنعتی ممالک کو اب یہ احساس ہو چکا ہے کہ بنیادی انسانی حاجات کی فکرمندی کے کام کومنڈی پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ سچی بات ہے کہ امریکی کاروباری اداروں کے اس رویے کو ایک معمہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ سرکاری طبی سہولیات پر زور نہیں دیتے کیونکہ علاج معالجوں پر اٹھنے والے اخراجات کے طفیل امریکی کمپنیاں عالمی معیشت میں پیچھے رہ جاتی ہیں اور دوسری طرف جیسا کہ ہم نے باب سوم میں دیکھا' موجودہ امریکی نظام دیگر صنعتی اقوام کے مقابلے میں زیادہ مہنگا اور کم موثر ہے۔

جیسا کہ میسا چوسٹس یونیورسٹی کی ماہر اقتصادیات اینڈی ایلبیلڈ لکھتی ہیں کمپنیاں اپنے ملازمین کو بعض سہولیات فراہم کر سکتی ہیں اور انھیں کرنی بھی چاہیے مگر یہ کہ سب کچھ وہ کریں' اس بات کی ان سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس چیز کا تعین کرنا کہ کاروباری اداروں کو کیا کرنا چاہیے اور پھر ان سے جو رہ جائے اسے پورا کرنا حکومت اور حکومتی پالیسیوں کا کام ہے۔ (38)

ارباب اختیار کو تحقیقات سے سامنے آنے والے ان حقائق کو بھی خاطر میں رکھنا چاہیے جو توجہ ونگہداشت کی سرپرستی وحوصلہ افزائی کی اہمیت کو اجاگر کر رہے ہیں کیونکہ آج کے امریکہ کے ملازم پیشہ گھرانوں کے سب سے مشکل مسئلے (یعنی بال بچوں کے ساتھ گزارنے کے لیے درکار وقت کے فقدان سے پیدا ہونے والا ذہنی دباؤ) کے حل کے لیے اس کی بہت ضرورت ہے۔ یہ دفتروں اور کارخانوں میں غیرحاضریوں اور پست پیداواریت کا ایک بڑا سبب ہے۔ علاوہ ازیں یہ اس کے طفیل ہے کہ ہمارے کارکن دیگر ایسی اقوام کے کارکنوں کی نسبت کم مطمئن اور مسرور ہیں کہ جن میں ملازمین کو رخصت والدینی' معیاری نگہداشت اطفال' لچک دار نظام کار اور دوسری ایسی سہولیات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔(39)

چونکہ سرکاری شعبہ بھی براہ راست یا نجی اداروں کو ٹھیکے دے کر عوامی خدمات مہیا کرتا ہے' اسے سرکاری ملازمین اور ٹھیکے داروں کے لیے توجہ کے معیارات کا نفاذ عمل میں لانا چاہیے۔ اس کے علاوہ اسے کاروباری دیانت کو فروغ دینے والے اصولوں کی توضیع ونفاذ کا کام بھی کرنا چاہیے اور اسے خود بھی ان اصولوں اور معیارات پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

یہ بات اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ وہ بڑے تاجر اور کاروباری افراد جو سیاسی جماعتوں کی مالی اعانت کرتے ہیں' امریکی حکومت محصولاتی رعایت کی آڑ میں لاکھوں ڈالر ان

کی جھولی میں ڈال دیتی ہے۔ ہم پر یہ واجب آتا ہے کہ ہم اس بدعنوانی کا خاتمہ انتخابی مہمات کی حقیقی مالی اصلاح اور دیگر ایسے اصولوں کے ذریعے کریں جو اس امر کو یقینی بنائیں کہ حکومتیں سیاسی گماشتوں کی تجوریاں بھرنے کی بجائے قوم کی خوشحالی کو فروغ دے۔

سیاسی بددیانتی کا یہ مسئلہ معاشی پالیسیوں کی چھٹے معاشی شعبے یعنی قدرتی معیشت کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکامی کے پیچھے کارفرما ایک بہت بڑا سبب ہے۔ جب بڑے کاروباری ادارے اور ان کے مالکان انتخابی مہموں میں پیسہ لگا کر اپنی ماحولیاتی اعتبار سے تباہ کن پالیسیوں کے لیے تحفظ حاصل کرتے ہیں تو یہ ادارے اور ہمارے سیاسی قائدین دونوں بددیانتی اور بدعنوانی کے مرتکب ہوتے ہیں جس کے نتائج ہمارے سیارے کے ماحولیاتی نظام اور اس کے توسط تمام عوام کو بھگتنا پڑتے ہیں۔

اس صورتحال میں بھی کہ جب یہ بات واضح ہو کر سامنے آ چکی ہے کہ ہم ان قدرتی وسائل کا کہ جن پر ساری معیشت کا دارومدار ہے' ضرورت سے زیادہ استحصال کر رہے ہیں' بعض نااندیش ماہرین معاشیات ایسے بھی ہیں جو یہ دلیل پیش کر رہے ہیں کہ اگر پانی' توانائی بلکہ زمین کی فضا کو بھی نجی ملکیت میں دے دیا جائے تو ان کا انتظام زیادہ بہتر طریقے سے کیا جا سکتا ہے۔

عالمی عوامی املاک:

انج کول' آئزابیل اور مارک سٹرن نیز جیفری سچس' امرتیہ سین اور جوزف سٹگلٹز جیسے ماہرین اقتصادیات نے ایک جدید تصور پیش کیا ہے جو انسانی تحفظ' بقاء اور ترقی کو فروغ دینے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ اسے عالمی عوامی املاک کا تصور کہتے ہیں۔

ماہرین معاشیات عرصہ دراز سے پارکوں' تعلیم' پولیس اور آگ سے بچاؤ کی طرح کی ایسی چیزوں اور خدمات کے لیے جنھیں ہر کوئی استعمال کر سکتا ہے' عوامی املاک کی اصطلاح استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں لیکن عالمی عوامی املاک کا تصور اس سے بہت آگے چلا جاتا ہے۔ اس میں امن' انصاف' مالی استحکام اور ماحولیاتی تحفظ بھی آ جاتا ہے اور یہ کسی ایک ملک تک محدود نہیں۔

معاشی مخترع ہیزل ہینڈرسن لکھتی ہیں کہ مسئلہ عالمی عوامی املاک کی منڈیوں' شہری تنظیموں' مقامی حکام اور قومی حکومتوں کے اشتراک سے توضیع و تنظیم ہے۔ انھوں نے

ایسی معاشی ایجادات کی تجویز پیش کی ہے کہ جو Negative Externalities کو روکنے اور اس کی بجائے "Positive Externalities" کو فروغ دینے میں مدد دیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ تمام اقوام کے لیے پہلا قدم Externality Profile بنانا ہے جس سے مراد وہ اچھی اور بری چیزیں (Spillovers) ہیں جو وہ اپنی حدود کے پار پیدا کرے لا ناعث بنتی ہیں۔ ایسے قومی پروفائل اقوام کے درمیان حقیقی سودے بازی کو ممکن بنا سکتے ہیں۔ ایک اور عملی تجویز یہ ہے کہ ملکوں کے ٹیکس پر وفائل تیار کیے جائیں۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ معاشی ایجادات اس لیے مطلوب ہیں کہ ٹیکس ہیونز (Tax Havens)، سرمائے کے فرار اور بین الاوامی طریقوں سے کالے دھن کو سفید بنانے جیسے مسائل سے بخوبی نپٹا جا سکے۔

ہینڈرسن اور کول دونوں اس بات سے اتفاق کرتی ہیں کہ منڈیوں سے بہت فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں لیکن وہ ایسے اصولوں اور نظاموں کی ضرورت پر بھی زور دیتی ہیں کہ جو منڈیوں کی عالمگیریت کو عوامی املاک کی پیدائش اور ان کی منصفانہ تقسیم کے ساتھ توازن میں لا سکیں۔ کول کا کہنا ہے کہ ''امیر سے امیر آدمی کا بھی عوامی املاک (بشمول عالمی عوامی املاک) کے بغیر گزارا نہیں اور نہ ہی منڈیاں ان کے بغیر چل سکتی ہیں۔ انھیں موثر طریقے سے کام کرنے کے لیے مالکانہ حقوق' قانونی اداروں' تعلیم یافتہ لوگوں اور امن وتحفظ کی ضرورت ہوتی ہے۔'' اس طرح سمندر' فضا' زمین کے برق مقناطیس طیف اور سائبر سپیس (Cyber Space) کی طرح کی چیزیں بھی ہیں جو سب عالم کے لیے مشترک ہیں۔ ان وسائل کی تخصیص کیسے کی جائے اور انھیں استعمال میں کیسے لایا جائے' اس کا انضباط بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعے عمل میں آنا چاہیے۔ جن میں حکومتوں اور کاروباری اداروں سے لے کر مقامی آبادیوں اور نچلی سطح کے گروہوں تک سب کی بات کو وزن ملنا چاہیے۔ (40)

یہ بات کرتے ہوئے اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے جو ہمارے اردگرد ہمیں ہر جا نظر آتی ہے یعنی یہ کہ کاروباری ادارے کتنی بیدردی سے اور اس نقصان سے کس قدر لاپرواہ ہو کر کام کرتے ہیں جو ان کی وجہ سے فطرت کے ممد حیات نظاموں کو پہنچتا ہے۔ جیسا کہ اقوام متحدہ کے ترقیاتی مطالعات کی ڈائرکٹر انج کول کا کہنا ہے ضرورت اس وقت اس امر کی ہے کہ ایسے بین الاقوامی قوانین وضع کیے جائیں جو اس بات کو ممکن بنائیں کہ ہم قدرتی وسائل کا

انتظام سب مل کر اور زیادہ منصفانہ اور پائیدار انداز میں کر سکیں۔ (41) یہ وسائل بقول اس کے اور دیگر مفکرین کے بقول ''عالمی عوامی املاک'' میں شامل ہیں اور ان عالمی عوامی املاک کو بچانے کے لیے ہمیں ایسے معاشی پیمانوں' اصولوں اور وتیروں کی ضرورت ہے جو اس بات کو مدنظر رکھیں کہ توجہ و احساس بشمول اس مادر ارض کی نگہداشت کو اس کی حقیقی قدر تفویض دیے بغیر بات نہیں بن سکتی۔

سچ پوچھیں تو سب باتیں گھوم پھر کر اس ایک نکتے پر آ جاتی ہیں کہ ہمیں ایسے وتیرے' اصول اور پالیسیاں عمل میں لانی چاہئیں کہ جو ہماری خود پر' دوسروں پر اور قدرت پر توجہ کی حوصلہ افزائی کریں اور نگہداشتی رویوں کی سرپرستی کریں۔

معاشی اداروں کی ترکیب:

میں اس بات کا اختتام معاشی ڈھانچوں کے اہم مسئلے کو پورے طور پر نمٹا کر کرنا چاہتی ہوں کیونکہ اس مسئلے پر توجہ دیے بغیر ہم متوجہ معاشیات کی طرف پیش قدمی نہیں کر سکتے۔

جیسے کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے مکانوں' مشینوں اور دیگر مادی ڈھانچوں کے برعکس کمپنیوں' حکومتوں اور خاندانوں کے ڈھانچے بے جان نہیں ہوتے۔ یہ ڈھانچے گارے مٹی' پیچوں یا کنڈیوں سے نہیں جڑے ہوتے بلکہ یہ ڈھانچے فکری و عملی عادات اور ان حکایات اور اصولوں سے استوار کیے جاتے ہیں کہ جو ان عادات کی صورت گری کرتے ہیں۔

کسی ایسے معاشی نظام کی طرف جانا کہ جو انسانی ضروریات سے بہتر طریقے سے عہدہ برآ ہو سکے مادی ڈھانچوں میں بھی تبدیلیاں پیدا کرتا ہے......مثلاً باغیچوں اور نگہداشت اطفال کی سہولیات کے حامل دفاتر اور کارخانے لیکن ہماری زندگی کے ڈھانچوں یعنی ہمارے خاندانوں' کمپنیوں' حکومتوں اور دیگر معاشرتی اداروں کو تشکیل دینے والے تعاملات کے خدوخال میں تبدیلیاں اس سے بھی زیادہ اہم ہیں۔

ان خدوخال کا تعین کرنے والے عوامل وہ قانون' اصول اور عقائد ہیں جو ان کی تشکیل پر اثرانداز ہوتے ہیں اور یہ قانون' اصول اور عقائد کسی معاشرے کے خط شراکت وتسلط کے شراکتی یا تسلطی سرے کی طرف میلان کے متناسب بہت مختلف ہوتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں وہ ڈھانچے جو ہمیں ان زمانوں سے موصول ہوئے ہیں

جن کا میلان تسلطی نظام کی طرف زیادہ شدت سے تھا' اقتدار کو ارباب دولت کے ہاتھوں میں مرتکز کرنے اور ان ہاتھوں کی وسائل پر گرفت برقرار رکھنے کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ آج کے بہت سے ڈھانچوں جن میں غیر ذمہ دار کارپوریشنوں کی طرح کے آج کے سب سے زیادہ مرکزی (Central) معاشی ادارے بھی آ جاتے ہیں' کا بھی یہی معاملہ ہے۔

یہ کارپوریشنیں جیسا کہ ہم جانتے ہیں برطانوی استعمار کے دور میں وضع کیے گئے ایسٹ انڈیا کمپنی اور ہڈسن بے کمپنی جیسے اداروں کی نسل سے ہیں جنھیں نوآبادیوں کے تسلط و استحصال کے مقصد سے ایک آلہ کار کے طور پر تشکیل دیا گیا تھا۔ جیسے کہ ماہر معاشیات ڈیوڈ کارٹن نے لکھا ہے انھیں نوآبادیاتی علاقوں کے محنت کشوں کا خون پسینہ نچوڑنے' ان کے وسائل کو لوٹنے اور ان کی منڈیوں پر اجارہ داری قائم کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔(42)

اس تسلطی ورثے کو آج بھی ہمارے کاروباری خدوخال اور وتیروں میں کارفرما دیکھا جا سکتا ہے۔ آج کے دور میں بڑے شیئر ہولڈروں نے بادشاہوں کی جگہ لے لی ہے اور جدید کارپوریشن ایک زرساز مشین کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اسے پیسہ بنانے کے سوا کسی اور چیز کی کوئی فکر نہیں، خواہ یہ انسان ہو یا فطرت۔ کارپوریشنوں کی توضیع و عمل کے قوانین سرکاری پروانوں کے ذریعے بنائے جاتے ہیں اور یہ پروانے کاروباری کارپوریشنوں کی تعریف اب بھی بنیادی طور پر مالی اثاثے جمع کرنے اور شراکت داروں کے لیے قلیل المدتی منافع حاصل کرنے کے آلات کے طور پر کرتے ہیں۔

یہ مالی اثاثے اب تیزی سے ان بڑی کارپوریشنوں میں مرتکز ہو رہے ہیں جنھیں ہم موجودہ دور کی بین الاقوامی جاگیریں بھی کہہ سکتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو یہ بڑی کارپوریشنیں کئی ملکوں کے اثاثوں سے بھی زیادہ اثاثوں کی حامل ہیں۔ مثال کے طور پر اس دور کی سو عظیم ترین معیشتوں میں سے اکاون ملکوں کی بجائے کارپوریشنیں ہیں۔(43)

المختصر آج کل کی یہ بڑی کارپوریشنیں معاشی طاقت کے ارتکاز کو مزید مستحکم کر کے تسلطی نظام کی آلہ کار کے طور پر کام کر رہی ہیں۔ ان کے منڈیوں پر تسلط کو دیکھیں تو آزاد منڈی کا تصور ایک فسانہ محسوس ہوتا ہے۔ ان کی ہیجان انگیز تشہیری حکمت عملیاں صارفین کے رویوں پر عمل کر کے ان کی تجوریوں کے پیٹ بھرنے کا کام کرتی ہیں۔ سیاستدانوں کی قانونی وغیر قانونی حمایت سے وہ بہت سی سرکاری پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں، ٹیکسوں میں بڑی

بڑی رعایتیں حاصل کرتی ہیں اور محنت و ماحول سے متعلق سرکاری قوانین کی کامیاب طریقے سے مخالفت کرتی ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ اپنی بے اندازہ معاشی و سیاسی طاقت کو انفرادی طور پر نہیں بلکہ مل جل کر بروئے کار لاتی ہیں۔

یہ کاروباری عفریتیں اپنی طاقت عالمی تنظیم تجارت اور عالمی مالیاتی فنڈ جیسے بین الاقوامی اداروں کی وساطت بروئے کار لاتی ہیں اور بین الاقوامی تجارت کے قوانین خود اپنے ہاتھوں مرتب کرتی ہیں۔ اسے ہم ایک مذاق ہی قرار دے سکتے ہیں کہ ایک طرف تو نوحریتی ماہرین معاشیات اشتراکیت کی مرکزی منصوبہ بندی کی اس قدر شدومد سے مخالفت کر رہے ہیں اور دوسری طرف ان کارپوریشنوں کے مفادات نے عالمی سطح پر ایک ایسی زبردست مرکزی منصوبہ بندی کو جنم دے دیا ہے کہ جس کی نظیر پہلے کہیں نہیں ملتی۔(44)

ڈیوڈ کورٹن' ٹام ہارٹمین' پال ہاکن اور بہت سے دیگر ایسے صائب الرائے ماہرین نے ان معاملات پر بڑے مفصل طریقے سے بات کی ہے۔ ان کا موقف ہے کہ کارپوریشنوں پر لاگو ہونے والے قوانین اور معاہدوں کو ہر حال میں تبدیل کیا جانا چاہیے۔ (45) چونکہ یہ کارپوریشنیں سرکاری اجازت سے وجود میں آتی ہیں' ایسی تبدیلاں لانا عین ممکن ہے کہ جن سے انھیں زیادہ جوابدہ بنایا جا سکے، ان کے قوئی اجارہ کو کم کیا جا سکے اور اس امر کو یقینی بنایا جا سکے کہ ان کی سرگرمیاں پیدائش دولت کو بہانہ بنا کر انسانی وفطری سرمائے کو تلف نہ کریں۔ یہ تبدیلیاں ممکن ہی نہیں بلکہ ان کی فوری اور اشد ضرورت بھی ہے۔ مثلاً سرکاری اجازت ناموں میں کاروباری اداروں پر یہ شرط عائد کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے بورڈ میں ملازمین اور علاقے کے لوگوں کے نمائندوں کو بھی شامل کریں تا کہ احتساب و جوابدہی کے عمل کو زیادہ سے زیادہ ممکن بنایا جا سکے۔ اگر ہم سمتھ کی تصور کردہ آزاد منڈی کو وجود میں لانا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے اجارہ داری کے خلاف بنائے گئے قوانین کو تقویت دینا اور ان کا نفاذ عمل میں لانا انتہائی ضروری ہے۔ یہ قوانین ہمارے پاس پہلے سے موجود ہیں اور ان کا نفاذ کوئی ایسا مشکل یا ناممکن کام بھی نہیں۔

علاوہ ازیں ہمارے لیے ایک اور اہم معاشی ڈھانچے یعنی بازار حصص کے لیے بنائے گئے قوانین میں تبدیلیاں لانا بھی ضروری ہے جو کہ اداروں کے حصص کی خرید وفروخت کے توسط ان کے مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ جیسا کہ جیف' کورٹن اور دیگر ماہرین نے لکھا ہے

آج کل بازار حصص میں ہونے والا بیشتر کاروبار جوئے اور سٹے کے زمرے میں آتا ہے اور یہ کوئی حقیقی قدر پیدا نہیں کرتا۔(46) ہیزل ہینڈرسن نے زیادہ خوبصورت اور نپے تلے لفظوں کا استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ یہ بازار حصص ''عالمی قمار خانوں'' کی مثال ہیں جہاں جواباز شرطیں بدتے ہیں کہ حصص کی قیمت اوپر جائے گی یا کہ نیچے۔

ان معاملات کو زیادہ معقول اور دانشمندانہ قوانین اور اصول وضوابط سے تبدیل کیا جا سکتا ہے اور ان کا تبدیل کیا جانا بہت ضروری ہے۔حصص کے انتہائی قلیل المدتی لین دین پر ملکی و بین الاقوامی سطح پر سخت ٹیکسوں کا نفاذ کر کے سٹے بازی کے اس رجحان میں کمی کی جا سکتی ہے کہ جس سے کوئی قابل قدر اشیاء وخدمات حاصل نہیں ہوتیں۔قومی اور بین الاقوامی ادارے ایسے قوانین بھی وضع کر سکتے ہیں جو کارپوریشنوں کو انسان و فطرت کے لیے مضر سرگرمیوں کی ماحولیاتی لاگت کو معاشرے پر ڈالنے سے روکیں۔

چونکہ کارپوریشنوں میں دولت اور معاشی قوت کے اس درجہ ارتکاز سے بہت سی برائیاں اور ناانصافیاں جنم لے رہی ہیں، بعض ماہرین کا خیال ہے کہ دیوہیکل کارپوریشنوں کو ویسے ہی ختم کر دینا چاہیے۔ان کا کہنا ہے کہ ایسا کرنے سے مقامی لوگوں کو معاشی فیصلوں اور اقدامات میں زیادہ نمائندگی مل سکے گی۔ وہ یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ مقامی سطح کے کاروباری ادارے چلانے والے افراد اپنے علاقے اور اس کے ماحول کو زیادہ نقصان نہیں پہنچاتے کیونکہ انھوں نے خود بھی وہیں رہنا ہوتا ہے۔(48)

جیسا کہ کورٹن نے بھی لکھا ہے اس میں کوئی شک شبے والی بات نہیں رہ گئی کہ بڑی کارپوریشنیں ملکیت وطاقت کے کم سے کم ہاتھوں میں ارتکاز کا ایک بے مثل ذریعہ بن کر رہ گئی ہیں۔ ان کارپوریشنوں کے عالمگیریت کے لیے نافذکردہ قوانین ان کو روز بروز جمہوری احتساب سے حتیٰ کہ ملکی حکومتوں سے بھی بالا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کلمات کوٹن ''آج کل کی بلاحدود عالمی معیشت نے ہر شخص اور ہر قوم کو پستی کی طرف رواں ایک بے رحم دوڑ میں لا کھڑا کیا ہے۔نجی معاشی طاقت میں اضافہ ہو گیا ہے اور اب حکومتوں کو بھی ملازمتوں اور سرمایہ کاری کے مقابلے میں جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور اس کے لیے انھیں زیادہ سے زیادہ رعایتوں اور کم سے کم انضباطی معیارات کی پیش کش کرنا پڑتی ہے۔(49) مزید برآں اپنے کاروبار کے معاملے میں یا افسرشاہی سے معاملہ کرنے میں بڑے اداروں میں ذاتی عنصر کی

تخفیف (Depersonalization) بھی بیشتر اوقات بے حس وتیروں اور پالیسیوں کو جنم دینے کا باعث بنتی ہے۔

تاہم اگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو بہت سے چھوٹے ڈھانچوں کو بھی ایسے مسائل کا سامنا رہا ہے۔ چھوٹے کاروباری ادارے بھی غیر دیانتدارانہ ہتھکنڈوں سے محفوظ نہیں اور چھوٹی ملیں اور کارخانے بھی اپنے کارکنوں کا استحصال اور ماحول کو آلودہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آج کی عالمی معیشت میں سب سے زیادہ سفاکانہ استحصال چھوٹے اور مقامی اداروں میں ہی ہو رہا ہے۔ ان میں سے بعض مقامی اداروں میں تو غلام بھی رکھے جاتے ہیں بلکہ بچوں کو بھی غلاموں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ پاکستان اور بھارت کو ہی لے لیجیے جہاں قالین بانی کے کام میں بچے اپنے بینائی تک کھو بیٹھتے ہیں۔ پھر بھارت' برما اور تھائی لینڈ کے چکلے ہیں جہاں دس دس گیارہ گیارہ برس کی معصوم جانوں کو وحشت و درندگی کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور انھیں غلامی میں رکھا جاتا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں شُتر دوڑ کے مقابلوں میں کم سن ننھے بچوں کو جوکیوں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جنھیں سوداگر غریب ملکوں سے خریدتے ہیں اور پھر انھیں اونٹ دوڑ کا دھندہ چلانے والوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ (50) خریدنے والے پھر ان بچوں کے ساتھ اونٹوں سے بھی برا سلوک کرتے ہیں۔ بڑی عالمی کارپوریشنوں کے لیے کام کرنے والی چھوٹی مقامی کمپنیوں کے احوال بھی کوئی کم ابتر نہیں حالانکہ ان کمپنیوں کو عام طور پر مقامی لوگ ہی چلاتے ہیں۔ (51)

لامحالہ ایسے غیر انسانی چلن کوئی نئی بات نہیں۔ جیسا کہ ہم نے باب ششم میں دیکھا، ان کی جڑیں تسلطی معاشیات میں مضمر استحصال و بہیمیت کی کہنہ روایات میں ہیں خواہ یہ استحصال چھوٹے پیمانے پر روا رہا یا بڑے پیمانے پر۔

میں یہاں یہ بھی کہنا چاہوں گی کہ روسیو کے ''شریف وحشی'' کے تحسین آمیز تصور کی تقلید میں قبائلی معاشروں کو اب بھی مثالی معاشروں کے طور پر دیکھا جاتا ہے لیکن یہاں بھی وہی بات آتی ہے کہ حقیقت اس سے کہیں زیادہ پرپیچ اور گنجلک ہے۔ باب پنجم میں مذکور ٹیڈیورے کی طرح کے بعض قبائلی معاشرے بہت پرامن اور پرعدل ہیں مگر بے عدل اور فسادی قبائلی معاشرے بھی موجود رہے ہیں۔ مثال کے طور پر قبل از استعمار افریقہ کے مسائی اپنے آس پاس کے باشندوں کے لیے ایک مسلسل عذاب بنے رہتے تھے اور انھیں آئے دِن قتل و زنا اور

لوٹ مار کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ مسائی خواتین کو بھی قبیلے کے مردوں کے ہاتھوں بڑے ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان کی بے عزتی کی باقاعدہ رسوم رائج تھیں۔ ان کے جنسی اعضاء کاٹے جاتے تھے اور انھیں وحشیانہ معاشی استحصال کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔(52)

یہ سب اس چیز کی نشاندہی کرتا ہے کہ ایک عادل اور پائیدار معاشی نظام کی طرف تبدیلی محض کاروباری سرگرمیوں کو محدود کر کے یا انھیں مقامی رنگ دے کر عمل میں نہیں لائی جاسکتی۔ لاریب چھوٹے اور مقامی یونٹ زیادہ انسانی روابط کو ممکن بناتے ہیں لیکن متوجہ معاشیات کے لیے مزید اساسی تبدیلیاں درکار ہیں۔ اس کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ایک ایسے نظام کی طرف تبدیلی کو مہمیز دیں جو ساری کاروباری دنیا میں تسلطی تعلقات کی بجائے شراکتی تعلقات کو فروغ دے۔

لیجئے ہم ایک مرتبہ پھر اس کتاب کے مرکزی موضوع کی طرف آ چکے ہیں۔ اب پھر ہمارا موضوع تمام اداروں میں تسلط سے شراکت کی طرف جھکاؤ کی ضرورت ہے۔ اب ایک دفعہ پھر ہمارا زور ثقافتی اقدار میں تبدیلی کی ضرورت پر ہوگا تاکہ نگہداشت کے ممدحیات کام نیز احساس وتوجہ جیسے ''نسوانی'' خواص کی قدر و قیمت کو مزید نہ گرایا جائے۔

ایک ایسے معاشی نظام کے لیے کہ جس میں انسانی وفطری سرمایہ تباہی سے بچا رہے، معاشی اداروں میں ترکیبی تبدیلیاں اور ان اقدار میں ثقافتی تبدیلیاں درکار ہیں جو ان اداروں پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے لیے معاشیات کے بارے میں ایک جدید اور ایک ایسے اندازِ فکر کی ضرورت ہے جو ان معاملات کو بھی اعتنا بخشے کہ جن پر پرانے نظریات میں مناسب توجہ نہیں دی گئی۔

ایک ایسے معاشی نظام کی تشکیل کے لیے کہ جو واقعی سب کے وسیع تر مفاد کے لیے کام کرے ہمیں مناسب وقت اور بہت سے افراد کی مساعیاں درکار ہوں گی۔ اس میں سمے لگ سکتا ہے مگر یہ کام ہے بہت ضروری۔ جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے، جوں جوں ہم بعدالصنعتی دور میں آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں متوجہ معاشیات کی طرف پیش رفت کی ضرورت بھی شدید سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

باب ہشتم

ٹیکنالوجی، محنت اور بعد الصنعتی دُنیا

جب 1920ء میں چیک ڈرامہ نگار نے 'روبوٹ' کا لفظ اختراع کیا تھا تو انسانوں کی طرح سوچنے، حرکت کرنے اور کام کرنے والی مشینیں ابھی محض تخیل میں ہی تھیں۔ اب روبوٹ اور کئی دوسری خودکار مشینیں اور آلات حقیقت کا روپ دھار چکے ہیں اور انھیں امریکہ، جاپان اور دیگر صنعتی ممالک میں صنعتی میدان میں عام استعمال کیا جانے لگا ہے۔ اب خودکار آلات انٹرنیٹ پر لاکھوں سودے طے کرتے ہیں، بینک اور دوسرے کاروباری امور سے متعلق معاملات انجام دیتے ہیں، گاہکوں کی ٹیلی فون کالوں کا جواب دیتے ہیں، فوج کی خفیہ معلومات کی چھان پھٹک کرتے ہیں، حصص کے لین دین کی نگرانی کرتے ہیں اور ہزاروں دیگر ایسے کام سرانجام دیتے ہیں جواب سے پہلے تک صرف آدم زاد ہی کیا کرتے تھے۔

زیادہ دور کی بات نہیں کہ ''سٹار وارز'' کے مقبول عام آر ٹو۔ ڈی ٹو اور تھری سی۔ پی۔ او کی طرح کے انسان نما روبوٹ صرف سائنس فکشن میں ہی دیکھنے کو ملتے تھے۔ اب وہ جیتی جاگتی حقیقت بن چکے ہیں۔ امریکہ کی کارنیگی میلن یونیورسٹی کے سائنس دانوں کی ایک جماعت نے گھریلو استعمال کے لیے ایک ایسا متحرک روبوٹ تیار کیا ہے جو عام انسانی آواز کی کمانڈز استعمال کرتا ہے اور انٹرنیٹ کی مدد سے موسم اور ٹی وی پروگراموں کے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے اور تو اور روبوٹی کتے بھی منظر عام پر آنے والے ہیں۔ امریکہ کی مشہور دانش گاہ ایم۔ آئی۔ ٹی کی سائنس دان سنتھیا بریزیل کمپیوٹر سے کام کرنے والا ایک ایسا کتا تیار کر رہی ہے جو وزن، تحرک اور غذائی عادات سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے قدم پیماؤں اور

غسل خانوں میں نصب ترازوؤں کو پڑھ سکے گا۔ یہ سگ نما روبوٹ لوگوں کو ان کی خوراک اور ورزش کی نگرانی اور جانچ پڑتال کر کے اور انھیں ممنوعہ غذاؤں سے پرہیز کے متعلق خبردار کر کے انھیں وزن کم کرنے میں مدد دے گا۔(2)

اس میں شک نہیں کہ فی الحال ایک ایسا مستقبل جب روبوٹ انسانوں کی جگہ لے لیں گے صرف سائنس فکشن فلموں میں ہی دیکھا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض انواع کے روبوٹ پہلے ہی بازار میں فروخت کے لیے آ چکے ہیں۔ ستمبر 2005ء میں مشہور جاپانی کمپنی مٹسوبشی کی جانب سے گھر کے کام کاج کرنے والا ایک تین فٹا روبوٹ فروخت کے لیے پیش کیا گیا تھا جو دو ہزار الفاظ اور 10 مختلف چہروں کی شناخت کرنے کی صلاحیت کا حامل تھا۔ وہ دِن دُور نہیں جب اس طرح کے روبوٹوں کی جلد ہی تجارتی پیمانے پر تیاری ہونے لگے گی۔ جاپان کی انجمن روبوٹاں کے مطابق اس ملک میں روبوٹوں کی خرید و فروخت 2010ء تک 14 بلین ڈالر اور 2025ء تک 37 بلین ڈالر تک پہنچنے کی توقع ہے۔(3)

روبوٹ سازی کے شعبے میں دکھائی دینے والا یہ حرفتی انقلاب اس مظہر کا محض ایک چھوٹا سا جزو ہے جسے سائنسدان نئے حرفتی سنگم (New Technological Convergence) کا نام دے رہے ہیں۔ روبوٹوں کے علاوہ بائیوٹیکنالوجی کے میدان میں بھی خوب ترقی ہو رہی ہے جس نے ہم پر جاندار چیزوں کی جینیاتی ترکیب کو تبدیل کرنے کے امکانات وا کر دیے ہیں۔ پھر نینوٹیکنالوجی کی باتیں بھی سننے میں آ رہی ہیں جس نے جاندار اور بے جان دونوں قسم کے اجسام کے جوہروں اور سالموں کی ترتیب میں تبدیلی کا اختیار بھی انسانی ہاتھوں میں تھما دیا ہے۔ ذکاوت مصنوعی (Artificial Intelligence) انسانوں کی طرح کے سوچ و فکر کے عمل کو ان کی نسبت ہزاروں گنا زیادہ سرعت سے سرانجام دے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایسی حرفتی پیش رفتوں کی خبریں آئے دن کانوں میں پڑتی رہتی ہیں کہ جنھیں زمین واسیوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

بعض سائنسدان اور کاروباری عمائدین ان بعد الصنعتی حرفتوں کو جادو کی چھڑی کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔ وہ اپنے تخیلات سے بڑی مسحور کن تصویریں بنا رہے ہیں کہ ان حرفتی کامیابیوں کے طفیل ہماری زمین کیسے جنت کا ایک ٹکڑا بن جائے گی۔ دوسروں کا تخیل کچھ اور کہتا ہے۔ ان کی تصویریں قدرے بھیانک ہیں۔ انھیں ان نویکلی طاقتوں سے خطرے جھلکتے محسوس ہوتے

ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بھائی خلیوں اور جوہروں کو بدلنے کا کام خدا کے واسطے خدا پر ہی رہنے دو۔ بعض کو تو یہ خطرہ بھی لاحق ہو گیا ہے کہ یہ نئی حرفتیں نوع انسانی کو اس کے وناش تک لے جانے والی ہیں۔

لیکن بات یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کا یہ جن اب بوتل سے باہر آ چکا ہے اور اسے اب دوبارہ واپس بوتل میں بند کرنا ممکن نہیں ہو گا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ نئی حرفتیں جب وجود میں آتی ہیں تو انھیں پھر استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ اس کا حل یہ نہیں کہ ہم شترمرغ کی مانند اپنا سر ریت میں چھپا لیں اور سوچیں کہ یہ حرفتیں خود ہی رفو ہو جائیں گی۔ صحیح حل یہ ہے کہ اس چیز کو یقینی بنایا جائے کہ انسان ان نئی حرفتوں کو تسلط و تباہی کے لیے استعمال کرنے کی بجائے انھیں ایک زیادہ خوشحال اور بامروت دنیا کی تخلیق کے لیے استعمال کرے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان نئی حرفتوں میں ہی کوئی ایسی چیز مضمر ہے جس سے ہمارے سب عالمی مسائل حل ہو جائیں گے۔ ہاں ہماری حکومتیں ہمارے کاروباری ادارے اور ہم سب انھیں کس طور استعمال کرتے ہیں، یہ اصل بات ہے اور ان کا صحیح یا غلط استعمال ہی اس بات کا تعین کرے گا کہ یہ حرفتیں ہمارے معاشی و معاشرتی مستقبل پر کیا اثرات مرتب کرتی ہیں تاہم ایک بات واضح ہے کہ یہ اثرات ہوں گے بہت گہرے۔

ٹیکنالوجی اور محنت کا مستقبل:

روبوٹوں اور دیگر خودکار آلات نے ہمارے معاشی منظرنامے کو کیا سے کیا کر دیا ہے۔ صرف ایک ملک امریکہ میں روبوٹ اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے کارن 1969ء سے لے کر 1999ء تک کارخانہ ملازمتوں میں پچاس فیصد تک کمی دیکھنے میں آئی ہے (4) اور کام میں تخفیف کی یہ لہر جس میں ایک کروڑ کے قریب ملازمتوں کی جگہ خودکار مشینوں نے لے لی ہے کہانی کا محض ایک جزو ہے۔ ٹیلی فون آپریٹروں اور استقبالیہ کارکنوں کی طرح کے لاکھوں دفتری ملازمین بھی خودکار آلات کے سبب اپنے معاش سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اس کے علاوہ تگڑی تنخواہوں والی بہت سی ملازمتیں بھی ختم ہو چکی ہیں۔

صنعتی اوور دفتری ملازمتوں اور ان کے ساتھ ساتھ پروگرامنگ اور دوسری ہائی ٹیکنالوجی ملازمتوں میں کمی کا ایک سبب ملازمتوں کی ان ممالک کی طرف برآمد ہے جہاں کارکنوں کو

MashalBooks.com

تنخواہیں کم دینا پڑتی ہیں لیکن جوں جوں روبوٹ اور دیگر خودکار آلات ارزاں اور عام ہوں گے ان میں سے بھی بہت سے کارکن نوکریاں کھوبیٹھیں گے۔

تحقیقی ادارے سٹریٹیجی اینالٹکس کی 2005ء کی ایک رپورٹ کے مطابق کسٹمر سروس' ہیلپ ڈیسک اورڈائریکٹری اسسٹنس سے متعلقہ خدماتی صنعتوں کی بہت سی اعلیٰ ملازمتوں کی جگہ مصنوعی ذہانت کے حامل خودکار آلات لے لیں گے۔ (5) اس رپورٹ کے مصنف ہاروے کوہن نے یہ متنبہ بھی کیا ہے کہ متوسط اور اعلیٰ درجے کی ملازمتوں کو فیصلے' مشاورت اور تجزیاتی افعال کی صلاحیت کے حامل خودکار آلات سے خطرہ لاحق ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ یہ آلات مکمل طور پر انسانوں کی جگہ نہیں لے سکتے، وہ کاروباری اور حکومتی سرگرمیوں کے لیے درکار افرادی قوت میں ایک قابل قدر تخفیف ضرور لے آئیں گے۔ (6)

امریکہ میں پہلے ہی بیروزگاری اور مالی طور پر کم محفوظ صارفی حلقے کے نتائج کو محسوس کیا جا رہا ہے۔ ملازمتیں بھی اب دو قسموں میں بٹ گئی ہیں۔ ایک طرف تو پرکشش تنخواہوں والی ملازمتیں ہیں جن میں زیادہ تر اونچی ڈگریاں اور اعلیٰ حرفتی مہارات درکار ہیں اور دوسری طرف کم اجرت کی چھوٹی موٹی نوکریاں ہیں جن میں اکثر جزوقتی ہوتی ہیں اور ان میں ملازمین کے لیے کوئی خاص سہولیات بھی نہیں ہوتیں۔

جیسے جیسے ہم بعدالصنعتی دور میں آگے بڑھ رہے ہیں اس نوع کی پیش گوئیاں سامنے آ رہی ہیں کہ امریکہ میں صنعتی حلقہ اتنی ہی تیزی سے سکڑے گا جیسے کہ پہلے زرعی حلقہ سکڑا تھا لیکن صنعت کاری کے برعکس خودکاری زیادہ مقدار میں متبادل ملازمتیں فراہم نہیں کرے گی۔ خصوصاً ان غیر پیشہ وارانہ کاموں میں جن سے کہ اب تک زیادہ روزگار نکلتا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان ''بے کار'' لوگوں کا کیا کیا جائے کہ جو روبوٹوں' خودکار آلات اور ذکاوت مصنوعی کی وجہ سے بیروزگار ہو جاتے ہیں۔ ماہر معاشیات رابرٹ تھیوبالڈ نے اس مسئلے اور اس مسئلے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے اندازہ آزردگی کی پیش بینی کرتے ہوئے ضرورت مند افراد کو ایک مستقل سالانہ آمدن دینے کی تجویز پیش کی ہے۔ (7) ایسی ہی وجوہات کے پیش نظر اور بے تحاشہ تشدد اور معاشی و معاشرتی ڈھانچوں کے انہدام کے سدباب کے لیے قدامت پسند ماہر معاشیات ملٹن فریڈمین نے منفی انکم ٹیکس کی تجویز پیش کی

ہے اور کہا ہے کہ کم آمدنی والے لوگوں اور ان لوگوں کو کہ جن کے پاس سرے سے کوئی روزگار ہے ہی نہیں حکومت کی طرف سے وظیفہ دیا جائے۔

تاہم ان اقدامات کو ان نتائج وعواقب کا کوئی قرار واقعی حل قرار نہیں دیا جا سکتا جو زرعی' صنعتی اور علمی معیشت میں نئی حرفتوں کی آمد کی وجہ سے پیداواری تصور کیے جانے والے کام کی بتدریج معدومیت سے پیدا ہوں گے۔ ان اقدامات سے فقط پیسہ صرف ہو گا، معاشی وافرادی ترقی کے ضمن میں ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔

پیداواریت اور اختراعیت کی حوصلہ افزائی نہ تو مستقل سالانہ آمدن سے ہوتی ہے اور نہ ہی منفی انکم ٹیکس سے۔ ان دونوں صورتوں میں شہری اس بامعنی کام کے موقع سے محروم ہو جائیں گے جو انھیں یہ احساس مہیا کرتا ہے کہ وہ کوئی اہم کردار سرانجام دے رہے ہیں۔

اسی طرح مستقل سالانہ آمدن اور منفی انکم ٹیکس سے مثبت رویوں کی جزا اور مضر رویوں کی حوصلہ شکنی کا مقصد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے کسی کو بھی ہم بے مہر معاشی پالیسیوں یا کاروباری وتیروں کا توڑ قرار نہیں دے سکتے۔ ان میں سے کوئی بھی ہماری صحت اور ہمارے قدرتی مسکن کو ان غلط پالیسیوں اور وتیروں سے پہنچنے والے نقصان اور اس کے نتیجے میں انسانی صلاحیت پر پڑنے والے منفی اثرات کو پیش نظر رکھتا دکھائی نہیں دیتا۔ یہ تجویزیں پیش کرنے والے میرے مہربان معاشی بے انصافی اور نااہلی کے پیچھے کارفرما طاقت کے عدم توازنوں کی طرف توجہ نہیں دے رہے۔

ہماری بعدالصنعتی دنیا کے مسائل کا ایک اس سے بھی کاری علاج موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم متوجہ معاشیات پر عمل پیرا ہو جائیں تو خودکار بعدالصنعتی حرفتوں میں بھی کوئی قباحت والی بات نہیں رہ جائے گی۔ (9) اس کے برعکس یہ حرفتیں ہمارے لیے مفید کردار ادا کرنا شروع کر دیں گی۔

ہمارا بعدالصنعتی دور میں ورود ایسی معاشی پالیسیوں کا متقاضی ہے کہ جو ان وظائف کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کریں جنھیں مشینیں اور جدید آلات خواہ وہ جس قدر بھی زبردست کیوں نہ ہو' سرانجام نہیں دے سکتے اور یہ وظائف ہیں تخلیق' سوچ اور احساس وفکرمندی کے۔ یہ دور توجہ واحساس کی تعلیم وتربیت میں سرمایہ کاری اور اس انتہائی اہم کام کے مناسب اجر کا متقاضی ہے۔

بجائے مستقل سالانہ آمدن اور منفی انکم ٹیکس کی سکیموں کے اجراء کے کانگریس اور ریاستی گورنروں کو جلد از جلد ایسے پروگرام شروع کرنے چاہئیں کہ جو بڑھیا انسانی سرمائے کے فروغ کے لیے سرمایہ کاری کریں تا کہ ہم خود کو درپیش مسائل سے عہدہ برآ ہوسکیں۔ اس کا مطلب ہے ایسے اصولوں کی طرف پیش رفت جو ہمارے بچوں اور ہمارے بزرگوں کے احساس اوران پرتوجہ کو توقیر دیں اوران وظائف کی تربیت وسرپرستی کے لیے مناسب رقوم مہیا کریں۔

ان اصولوں کے تحت رخصت والدینی' نگہداشت اطفال' تعلیم اور صحت عامہ کے اخراجات ہر سال نہیں کرنا پڑیں گے اور جیسا کہ آج کل دیکھنے میں آتا ہے، ان سے سرکاری خسارہ جات میں اضافہ نہیں ہوگا۔ ان مصارف کو اہم ترین قومی اثاثے یعنی اس کے مستقبل کے افرادی سرمائے پر ضروری سرمایہ کاری کے طور پر دیکھا جانے لگے گا۔

سرکاری وظیفوں کی تفویض کے وقت اس بات کو ملحوظ رکھا جانا چاہیے کہ وہ توجہ ونگہداشت کے عمل کو اور انھیں سرانجام دینے والوں کو نوازیں خواہ یہ انسانوں کے لیے ہو' فطرت کے ممد حیات نظاموں کے لیے ہو' خاندانی معیشت میں ہو یا گروہی معیشت میں۔ ارباب اختیار کو اعلیٰ معیار کی توجہ ونگہداشت کے لیے مطلوب تعلیم وتربیت کے لیے مناسب فنڈ مہیا کرنے چاہئیں کیونکہ یہ وظائف انسانی ترقی کے لے اساسی اہمیت کے حامل ہیں اور نفسیات اور عصبی سائنس دونوں شعبوں میں ہونے والی جدید تحقیقات بھی اس دعوے کی توثیق کرتی ہیں۔

یہ طرزعمل بعدالصنعتی دور کی افرادی قوت کے لیے درکار اختراع و لچک اور احساس وتوجہ کی صلاحیتوں کے حامل افراد کی تیاری وفراہمی کو یقینی بنا سکتا ہے۔ جو شواہد سامنے نظر آ رہے ہیں ان کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آئندہ دور میں امریکہ میں ملازمتوں کی تعداد میں سب سے زیادہ اضافہ خدمات کے شعبے میں ہوگا جس میں توجہ واحساس کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔

افراد وفطرت کے لیے احساس وتوجہ کی قدر افزائی اس امر کو بھی یقینی بنائے گی کہ ہمارے قدرتی وسائل آلودگی اور تلفی سے بچے رہیں اور دنیا بھر میں جبر وتشدد میں کمی پیدا ہو۔ اس سے زیادہ متوجہ خاندان اور زیادہ مطمئن ومسرور افراد وجود میں آئیں گے۔

جب سب عالم کے لوگ مل کر توجہ واحساس کو فروغ دینے والی پالیسیوں کا تقاضا کریں گے اور ان پالیسیوں کا عالمی پیمانے پر نفاذ عمل میں آ جائے گا تو اس سے ساری دنیا میں زیادہ

متوجہ اور موثر کاروباری اور سرکاری وتیرے وجود میں آئیں گے اور جب لوگ توجہ و احساس کو اس کی صحیح قدر و منزلت دینا سیکھ جائیں گے تو اس کے نتیجے میں ایک زیادہ ذمہ دار قسم کی سائنسی و حرفتی اقدار پروان چڑھیں گی۔

ٹیکنالوجی کے درست اور غلط استعمال:

جدید ٹیکنالوجی کے تباہ کن اثرات ہم اپنے اردگرد باآسانی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ جدید ہتھیاروں کی جنگی تباہ کاریوں، صنعتی آلودگی اور زمین کے خطرناک حد تک بڑھتے ہوئے درجہ حرارت سے کون واقف نہیں۔ لہٰذا اگر بعض حلقے ان مسائل کا موردالزام ٹیکنالوجی کو ٹھہراتے ہیں تو اس میں کوئی ایسی اچنبھے والی بات بھی نہیں تاہم گہرائی میں جا کر دیکھیں تو یہ مسئلہ ٹیکنالوجی کا نہیں۔

ہم کسی ٹیکنالوجی کے بارے میں پہلے سے یہ یقین نہیں کر سکتے کہ آگے جا کر اسے کس طرح استعمال میں لایا جائے گا۔ ایک ہی ٹیکنالوجی کا اطلاق کئی مختلف طریقوں سے ہوسکتا ہے اور اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ آیا مروجہ سماجی ڈھانچے اور عقائد تسلط و استحصال کے تعلقات کو فروغ دیتے ہیں یا باہمی احساس و نفعے کے تعلقات کو۔

ہمارے کارخانوں کو اس طرح وضع کرنا کوئی ایسا ناگزیر بھی نہ تھا کہ انسان اس صنعتی مشین میں کل پرزوں کی حیثیت اختیار کر جاتے جیسے کہ وہ آج کل نظر آتے ہیں۔ اس طرح کا غیرانسانی نظام کوئی مشینوں کی ایجاد کا منطقی نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ تسلطی اقدار اور ان کے پیدا کردہ معاشی و معاشرتی چلن کا نتیجہ ہے۔

کارخانے اس نوع کے صنعتی جمہوریت کے مناسبات بھی بروئے کار لا سکتے تھے جیسے کہ بعد میں سویڈن اور ناروے جیسے شراکت پسند معاشروں میں رواج میں آئے۔ وہ ایسے پیداواری طریقے بھی استعمال کر سکتے تھے جس میں لوگ ٹیموں میں کام کرتے کارکن اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لیتے اور منیجر جبر و دھونس سے کام لینے کی بجائے کارکنوں کے لیے کام کی انجام دہی میں سہولتیں پیدا کرتے۔

اسی طرح صنعتی ٹیکنالوجی میں بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ یہ ورکشاپوں، کانوں اور دیگر کاروباری اداروں کو عورتوں، مردوں اور بچوں کے لیے بندی خانوں میں بدل کے رکھ دیتی۔

اس کے برعکس جدید ٹیکنالوجی کو انسانوں کو جانکاہ اور غیر انسانی کام سے نجات دلانے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔

ماحولیاتی تباہ کاری کے پیچھے بھی بنیادی طور ر ٹیکنالوجی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ بھی درحقیقت تسلطی اقدار کا ہی کیا دھرا ہے جو خواتین کے حیات آفریں وظائف کی طرح فطرت کے حیات آفریں قوئی کو بھی مرد کے فطرتی استحقاق کے طور پر دیکھتی ہیں جنھیں وہ جس طرح چاہے اچھے یا برے استعمال میں لے آئے۔

بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ آیا ٹیکنالوجی کے پیچھے تسلطی اقدار کارفرما ہیں یا کہ شراکتی اور جیسے جیسے سائنس دان بائیوٹیکنالوجی اور نینوٹیکنالوجی جیسے شعبوں میں قبل ازیں نا قابل تصور چیزیں اختراع کرتے چلے جاتے ہیں، یہ مسئلہ بھی زیادہ سے زیادہ اہمیت اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔

بائیوٹیکنالوجی سے بہت سے فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ انسانی خلیات اور جینیات پر تحقیقات سے اخذ کردہ علم سے انسانی صحت کو بہتر بنایا جا سکتا ہے اور یہ ہمارے عرصہ حیات میں اضافہ بھی کر سکتا ہے۔ اس سے سرطان، ایڈز، رعشہ اور پارکنسن روگ جیسی اب تک نا قابل علاج تصور ہونے والی امراض کا علاج بھی دریافت کیا جا سکتا ہے۔

حمل کے دوران جینیاتی جراحت کے عمل سے بچے کو کئی نوع کی معذوریوں سے بچایا جا سکتا ہے۔ یہ بھی سننے میں آ رہا ہے کہ جینیاتی طریقوں سے کاشت کی گئی فصلیں عالمی بھوک کا درماں بھی فراہم کر سکتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ جدید ٹیکنالوجی اور اس کے استعمالات بعض سنجیدہ مسائل کو بھی جنم دے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر جینیاتی طریقوں سے تیار کی گئی غذا سے صحت عامہ پر مرتب ہونے والے منفی اثرات تشویش کا باعث بن رہے ہیں۔ بعض سائنسدان اس خدشے کا اظہار کر رہے ہیں کہ جینیاتی طریقوں سے تیار کی گئی فصلیں مویشیوں اور انسانوں کے جسمانی نظام میں اینٹی بائیوٹک مزاحمت پیدا کر سکتی ہیں۔ ماحولیاتی اعتبار سے یہ خدشہ لاحق ہے کہ اگائی ہوئی فصلوں سے خارج ہونے والی ٹرانس جین جنگلی نباتات یا نزدیکی کھیتوں میں موجود عام پودوں اور فصلوں کو بھی اپنا شکار بنا سکتی ہیں جیسا کہ آج کل سننے میں بھی آ رہا ہے۔ پھر مونسانٹو جیسی بڑی کمپنیوں کا اپنا مسئلہ ہے جو کسانوں پر اپنے تیار کردہ بیج کے غیر قانونی استعمال کا الزام لگا کر انھیں عدالت میں گھسیٹ لاتی ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک واقعہ پڑھنے کو ملا جس میں ان کے جینیاتی طریقے سے تیار کردہ بیج ہوا کی وجہ سے ایک

نزدیکی کسان کی زمینوں میں چلے گئے تو کسان پر مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ جواباً کسان نے بھی کمپنی پر اپنی زمینوں کو آلودہ کرنے کے الزام میں رپٹ درج کرا دی۔(10) اس سے بھی بڑھ کر تشویش کی بات یہ ہے کہ جینیاتی طریقوں سے تیار کی گئی فصلیں جینوم کے اندر غیر متوقع تعاملات میں اضافہ کر سکتی ہیں جن سے منفی اثرات بھی برآمد ہو سکتے ہیں۔(11)

عسکری مقاصد کے لیے استعمال کی گئی جینیاتی ٹیکنالوجی اور بھی زیادہ خطرات کا باعث بن سکتی ہے۔ حیاتیاتی ہتھیار صدام حسین پہلے ہی کردوں پر استعمال کر چکا ہے اور اسلحے کے پھیلاؤ کی روک تھام پر تحقیقات کے مرکز کی ایک رپورٹ کے مطابق الجیریا' کینیڈا' چین' فرانس' جرمنی' ایران اور امریکہ سمیت کوئی درجن ایک ممالک اینتھریکس اور بوٹولینم سے لے کر چیچک اور ٹائیفس تک کی طرح کے مادوں کے استعمال سے کیمیائی اور حیاتیاتی اسلحہ تیار کر رہے ہیں۔(12) پھر حیاتیاتی دہشت گردوں کا دیو بھی مسلسل افق پر منڈلا رہا ہے۔ کوئی سی تنظیم یا افراد کسی حکومت کے ایما پر یا اپنے داخلی فتور کے طفیل کسی بھی وقت ''دشمن'' شہریوں کو اپنے کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیاروں کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔

جینیٹک انجینئرنگ کو ذہنی و فکری کنٹرول کے لیے ایک آلہ کار کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ فوج حیاتیاتی مادوں کو اپنے فوجیوں یا شہریوں کو کنٹرول کرنے کے لیے استعمال کر سکتی ہے یا آمر حکومتیں انھیں اپنے عوام کو کنٹرول کرنے کے لیے استعمال کر سکتی ہیں۔

علاوہ ازیں جیسا کہ جیریمی رفکن ''دی بائیوٹیک سنچری'' میں رقمطراز ہے ایسے دور میں جبکہ نسل کش پالیسیاں ایک حقیقت کا روپ اختیار کر چکی ہیں بائیوٹیکنالوجی کو بھی ''غیر پسندیدہ'' گروہوں کو نابود کرنے کے لیے تیار کیے گئے نسلی تطہیر کے پروگراموں میں استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ اس کے کچھ آثار نازیوں کے نسلی تطہیر کے پروگراموں میں بھی ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ ان نازی منصوبوں کے تحت 60 لاکھ یہودیوں اور کئی لاکھ یورپی خانہ بدوشوں اور پولش نسل کے افراد کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ نیز بیشمار معذور جرمنوں کو بھی گیس کی مدد سے ہلاک کیا گیا اور نطشے اور ہٹلر کا ''سپرمین'' کا تصور ضروری نہیں کہ دوبارہ پھر کبھی پیدا نہیں ہوگا۔ اس طرح کے تصور اور اس طرح کے تصورات کے حامل افراد پھر بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ آج کل یورپ کے سفید فام نسل پرست اور جدید نازی گروہوں کی طرف دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔(13)

آج کل جینیٹک انجینئرنگ کے ذریعے ''ناقص'' جینوں کو حذف کرنے کی بات کا بہت چرچا ہے مگر جیسا کہ رفکن صاحب لکھتے ہیں اگر اس سلسلے میں سوچ بچار اور پیش بینی سے کام نہ لیا گیا تو انسانی جینیں خطرناک حد تک محدود ہوسکتی ہیں۔تقلیب نے ارتقائے حیات میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے اور انجام کار اس سے انسانی ارتقاء بھی متاثر ہوسکتا ہے۔ حال ہی میں اٹلی کے سائنس دانوں نے دماغی خلیات کا سیلیکان سرکٹوں سے ملاپ کرایا ہے جس سے کئی سوالات جنم لے رہے ہیں۔ خیال کیا جا رہا ہے کہ اس طریقے سے کسی روز عصبی امراض کا علاج کیا جاسکے گا اور ایسے نامیاتی کمپیوٹر بنائے جاسکیں گے جو زندہ عصبیوں کی مدد سے اعداد کی جمع وتفریق کریں گے۔ یہ ایک اور ڈراؤنے خواب یعنی انسانی اور الیکٹرانی خواص کی حامل ایک جدید نوع کا دیباچہ ہوسکتا ہے۔(14)

نینوٹیکنالوجی سے بھی مشکل سوالات ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ یہ ٹیکنالوجی بہت زیادہ چھوٹے اجزاء کو جمع کر کے نئی جوہری اور سالماتی تراکیب بناتی ہے۔ ایک نینومیٹر' میٹر کے بلین ویں حصے کے برابر ہوتا ہے۔ کبھی اس قدر چھوٹے اجزاء پر عمل کرنا بعید از قیاس تصور کیا جاتا تھا مگر آج کل یہ وظیفہ سائنسدانوں کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل بن گیا ہے اور وہ اس ٹیکنالوجی کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسے تجربات کر رہے ہیں جن سے صنعت سے لے کر طب تک ہر شعبے میں انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔

خیال کیا جا رہا ہے کہ نینوٹیکنالوجی جسم میں تشخیصی مقاصد کے لیے سائیومیڈیکل آلات کی تنصیب کے توسط طب میں انقلاب برپا کر دے گی۔ مثال کے طور پر آج کے دور میں ہمارے پاس سرطان کی ابتدائی مراحل میں تشخیص کے کوئی طریقے موجود نہیں اور نہ ہی ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ ابتدائی مرحلے میں کون سا سرطان پروان چڑھ رہا ہے۔ نینوٹرانز سٹروں سے اطباء یہ امید کر رہے ہیں کہ ان کی تشخیص اس وقت بھی ممکن ہو سکے گی جب سطان صرف دو تین خلیوں تک ہی پہنچا ہوگا۔ لازمی بات ہے کہ اس کی بدولت سرطان کی نشوونما کی روک تھام کے امکانات میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔(15)

پیش گوئی یہ کی جا رہی ہے کہ نینوٹیکنالوجی ویکسینز اور کمپیوٹروں سے لے کر گاڑیوں کے ٹائروں تک ہر چیز کی وضع اور بنانے کا طریقہ یکسر بدل کے رکھ دے گی۔ وہ ننھے ننھے لیکن انتہائی مضبوط سالمے جنھیں نینوٹیوبز کہا جاتا ہے اور جو کاربن اور دوسرے ایٹموں سے ازخود

وجود میں آتے ہیں، چیزوں کی ساخت وصنعت کو سرے سے تبدیل کر سکتے ہیں۔(16) امریکہ کی کیلیفورنیا یونیورسٹی کے سائنس دان پہلے ہی ایسے نینوٹرانز سٹر تیار کر چکے ہیں جو سالموں کو برقیاتی طور پر کنٹرول کرتے ہیں۔اس پیش رفت سے کیمیائی اور حیاتیاتی عمل کو کمپیوٹر کے ذریعے کنٹرول کرنا ممکن ہو جائے گا۔(17)

اس نوع کی دریافتیں انسانوں کو یکسانیت سے بھی آزاد کر سکتی ہیں۔خودکاری کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں ایک ایسے دور میں لے جا سکتی ہیں جہاں انسان اپنی ان صلاحیتوں کو نشوونما دینے اور انھیں استعمال کرنے میں پوری طرح آزاد ہوں گے جو انھیں دوسروں سے ممیّز کرتی ہیں۔نینوٹیکنالوجی ان معاشی قدر پیمائیوں کو بھی تبدیل کر سکتی ہیں جن کا انحصار کمیابی پر ہے۔

تجربات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کل کو ہم ٹیکنالوجی کی مدد سے اس قابل ہو جائیں گے کہ ہم ایٹموں کی ترکیب بدل کر کاربن کو الماس میں بدل سکیں۔اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر ہیرے کمیاب نہیں رہیں گے بلکہ منڈی میں ہیروں کی بہتات ہو جائیگی۔اس سے اس نئی بحث کا دور بھی وا ہوتا ہے کہ کون سی چیز حقیقت میں قیمتی ہے اور خاندان کے افراد اور فطرت کے سرانجام دیے جانے والے وظائف کی قدر کیا ہونی چاہیے۔

لیکن طب' سپر کمپیوٹنگ اور توانائی کے شعبوں میں حیرت انگیز کامیابیوں کی پیشین گوئی کے ساتھ ساتھ نینوٹیکنالوجی سے خوفناک خدشات بھی پیدا ہو رہے ہیں۔کوئی شخص بھی یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس قدر چھوٹی مصنوعات کہ جنھیں انسانی آنکھ دیکھ بھی نہیں سکتی' کس طرح سے کام کریں گی اور ان کا رویہ کیسا ہو گا' خاص طور پر جبکہ دنیائے نینو کے بنیادی اجزاء یعنی جوہر اور سالمے بڑے اجسام کی معروف نیوٹنی طبیعیات کی بجائے کوانٹم مکینکس کے ان قوانین کے تحت کام کرتے ہیں جنھیں ابھی تک بہت کم سمجھا جا سکا ہے۔

ایک خدشہ یہ بھی ہے کہ زیادہ سخت پرکھ پڑچول کے فقدان کے سبب نینو سائنسدان فرینکسٹائن نما خطرناک قسم کی عفریتیں بھی دنیا میں چھوڑ سکتے ہیں۔

کاربن نینوٹیوبوں اور ان سے مشابہ دیگر نینوسکیل ذرات کو ان کے ممیّز خواص کی بدولت دماغ میں ادویات بھیجنے کے لیے بہت پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے مگر بعض سائنسدانوں کو یہ پتا لگی ہے کہ عین انھی خواص کی بدولت یہ ذرات زہریلے مادوں کی منتقلی کا

باعث بھی بن سکتے ہیں۔ بعض حضرات کو اس بارے میں تحقیق کے فقدان پر بھی تشویش ہے کہ جراثیم میں جذب شدہ نینو ذرات غذائی چکر میں کیسے داخل ہوں گے۔ (18)

سب سے بڑا خوف تو اس بات کا ہے جسے سائنس دان ''گرے گو'' کا نام دے رہے ہیں۔ ذرا سوچیں کہ اگر اپنی تعداد میں ازخود اضافہ کرنے والے خردبینی روبوٹ ہی پوری دنیا پر چھا جائیں اور پھر ہم سب انسانوں کا صفایا کر دیں تو!(19)

لاتعلقی یا احساس؟

سائنسی ایجادات و اختراعات کو کس طرح کام میں لایا جاتا ہے، اس کا دارومدار ان رہنما اقدار پر ہے جن کے زیراثر کوئی سائنس پروان چڑھتی ہے۔ آج کل کی سائنس ''بے لاگ معروضیت'' کے اصول پر عمل پیرا ہے۔ ظاہراً یہ محاورہ بھلا لگتا ہے کیونکہ یہ غیر جانبداری کی باس دیتا ہے لیکن حقیقتاً بہت سی ایسی وابستگیاں ہم سب کی (اور ہم میں سائنس دان بھی آ جاتے ہیں) گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں جو کہ تسلطی نظاموں کو برقرار رکھتی ہیں۔ لہٰذا وہ لاتعلقی یا عدم وابستگی جسے بہت سے سائنس دان سائنس کا اصول اولین مانتے ہیں' دراصل مروجہ مفروضات و اعتقادات کی تقویت و استمرار کا باعث بنتی ہے۔ مزید برآں اگر ہم اس معاملے کا قریب سے جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو عدم وابستگی یا لاتعلقی کہا جاتا ہے، وہ دراصل توجہ و ہمدردی جیسے ''لطیف'' اوصاف کو دبانے کے مترادف ہے اور لبادہ اس پر اس دلیل کا چڑھا دیا جاتا ہے کہ ''معروضی'' سائنس میں ''داخلی'' عنصر شامل کرنا مناسب نہیں۔

سائنس کے بارے میں یہ تصور ہم تک زیادہ شدید تسلطی ادوار سے توارثاً پہنچا ہے۔ سائنسی مورخ ڈیوڈ نوبل اپنی کتاب ''عالم غیراز وجود زن: مغربی سائنس کی عیسائی عالمانہ ثقافت'' میں کہتا ہے کہ جدید سائنس اس مسیحی عالمانہ (بلکہ خانقاہی) منہج سے ماخوذ ہے جس کی بنیاد خواتین اور ہر نرم و نازک یا نسوانی شے سے تنفر پر ہے۔ خواتین اور ''نسوانی'' کی تحقیر اس روایت میں اس درجہ نفوذ کر گئی کہ خواتین کو پادری بننے کی اجازت تک نہ دی گئی۔ یہ کیا عیسائی راہب تو اپنے ہاں صفائی کے لیے آنے والی عورتوں سے مس ہونے سے بھی بچتے تھے کہ کہیں وہ انھیں بھرشٹ ہی نہ کر دیں۔ (20)

جدید سائنس نے پرانے مذہبی عقائد کو تو خیرباد کہہ دیا لیکن اس نے ابتدائی مذہبی ثقافت

میں موجود تحقیرزن کی روایت کو جاری وساری رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس روایت سے جو سائنس برآمد ہوئی وہ احساس و ہمدردی کا گلا گھونٹنے والی سائنس تھی اور دوسرا نتیجہ ایسی سائنس کی صورت میں برآمد ہوا کہ جس میں ہمہ گیریت اور منطقی سوچ کا فقدان تھا۔

حالیہ برسوں میں خواتین کے سائنسی دنیا میں ورود کے طفیل توجہ و احساس کے جھونکے سائنس کا رنگ بدلنے لگے ہیں اور اب سائنسی منہاج سے ہمدردی وفکرمندی اور خواتین سے نسبت رکھنے والے خصائل کو ایسے نکال باہر نہیں کیا جاتا جیسے کہ پہلے کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر باربرا مکلنٹک کے نباتی توارث پر کام جس پر اسے 1983ء میں نوبل پرائز ملا' میں اختیار کیے جانے والے طرزِ عمل کے لیے ''جاندار اجسام کے لیے احساس'' کے الفاظ استعمال کیے جا رہے ہیں۔ زیادہ ہمدردانہ اور ہمہ جہت سائنسی وتیرے کی ایک اور مثال ماہرین علم الانساب الحیوانات جین گڈال' ڈائن فوسی اور سنھتیاموس کا کام ہے۔ ان خواتین نے اپنے ہمدردانہ رویے اور صبر آزما مشاہدے کو یکجا کر کے اپنے شعبوں کو کیا سے کر دیا ہے۔ نتیجتاً مرد وخواتین سائنسدانوں کی ایک تیزی سے بڑھتی ہوئی تعداد اب وجدانی / ہمدردانہ اور معروضی منہاجات کے امتزاج کی طرف پیش رفت کرتی دکھائی دیتی ہے۔(21)

بہت سے سائنس دان اب اس نظریے کو بھی مسترد کرنے لگے ہیں کہ سائنس لازماً اقدار سے عاری ہی ہونی چاہیے۔ سائنسدانوں کی ایک روز افزوں تعداد اب اس بات پر تشویش و پریشانی کا اظہار کرتی ملتی ہے کہ آئے دن زیادہ سے زیادہ طاقتور ٹیکنالوجی وجود میں آ رہی ہے لیکن ہمارے سیارے پر اس کے دوررس اثرات پر کوئی توجہ نہیں دی جا رہی۔

سن مائیکرو سسٹمز کے مکھیا سائنسدان بل جوائے کو انفارمیشن ٹیکنالوجی کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے 2000ء میں تحریر کردہ مضمون ''مستقبل کو ہماری ضرورت کیوں نہیں'' کو بین الاقوامی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ اس مضمون کا رواں رواں اس بات سے بحث کرتا محسوس ہوتا ہے کہ اگر جدید ٹیکنالوجی ہمارے قابو سے نکل گئی تو پھر ہمارا اور ہماری تہذیب کا کیا بنے گا۔(22) جوائے کا کہنا ہے کہ بیسویں صدی کی نیوکلیائی' حیاتیاتی اور کیمیائی (ن ح ک) ٹیکنالوجی کے لیے باافراط (اکثر نایاب) خام مال' تکنیکی علم اور وسیع پیمانے کی صنعتیں درکار ہیں لیکن اس کے برعکس اکیسویں صدی کے جینیاتی ردوبدل' نینوٹیکنالوجی اور روبوٹوں (ج ن ر) کے لیے نہ تو بڑے بڑے پلانٹوں کی ضرورت ہے اور نہ ہی خام مال کی۔ صرف

یہی نہیں بعض جدید حرفتوں میں ازخود افزائش نسل کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ ایٹم بم اپنے جیسے مزید بموں کو جنم نہیں دے سکتا یا زہریلے مادوں سے مزید زہریلے مادے پیدا نہیں ہو سکتے لیکن اگر ازخود اپنی تعداد بڑھانے والی ج ن ر حرفتیں دنیا میں چھوڑ دی گئیں تو انھیں الف لیلوی جن کی طرح دوبارہ واپس بوتل میں بند کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ لہٰذا جوائے ہم سب کو اس وسیع پیمانے کی علمی ہلاکت خیزی سے متنبہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم اس اٹکل پچو ترقی اور ج ن ر حرفتوں کے استعمال سے باز نہیں آتے تو ہو سکتا ہے کہ ہماری نسل اس سیارے کی آخری انسانی نسل ہو۔

یہ منظر گو کچھ زیادہ ہی وحشت انگیز محسوس ہوتا ہے مگر جوائے کی یہ بات برحق ہے کہ ہمیں بائیوٹیکنالوجی' نینوٹیکنالوجی' روبوٹ اور دیگر اقسام کی جدید اور طاقتور ٹیکنالوجی کی اختراع وتوضیع کے لیے توجہ و ذمہ داری کی اقدار وافکار کی روشنی میں طے کے گئے معیارات کی فوری اور اشد ضرورت ہے۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم سائنسی تحقیق کی راہیں بند کر دیں بلکہ اس کے برعکس ہمیں تو چاہیے کہ ہم فکری و اطلاقی دونوں قسم کی تحقیق کو اور بھی زیادہ زور وشور سے جاری رکھیں اور اس کے لیے مناسب سرمایہ بھی مختص کریں۔ سائنسی تحقیق نہ صرف اقتصادی طور پر منافعہ بخش ہے بلکہ اس کے انسانی فوائد بھی بہت ہیں۔ اس نے ہمیں کمپیوٹر' لیزر اور انٹرنیٹ سے لے کر دل کی پیوندکاری تک بہت سے حرفتی اطلاقات کا راستہ دکھایا ہے مگر ہمیں ضرورت ایسے اصول وضوابط کی ہے کہ جو کسی ٹیکنالوجی کے تجارتی پیمانے پر استعمال سے قبل اس کے نتائج وعواقب کی صحیح آ نک کو یقینی بنائے۔

لیکن حقیقت میں مروجہ معاشی سانچے اور قوانین ایک ذمہ دارانہ تخمینے کی حوصلہ افزائی کی بجائے حوصلہ شکنی کر رہے ہیں۔ اگر معاشی پیداواریت کو قلیل المدتی بکری ومنافع کے پیمانے سے ہی ماپا جاتا رہا تو پالیسیوں میں بھی یہی ہوگا۔ وہ بھی طبی و ماحولیاتی خطرات اور ان سے جنم لینے والے معاشی و معاشرتی خسارے سے اغماض کی روش پر گامزن رہیں گی۔

اگرچہ ان کے طویل المیعادی اثرات کے بارے میں کوئی نہیں جانتا' نینوٹیکنالوجی کے تجارتی اطلاقات پہلے ہی ہماری زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ نینوسکیل ذرات کو دھوپ سے حفاظت کرنے والے ایٹنو ں' دھبوں سے محفوظ رہنے والی وردیوں اور جراحی کی پٹیوں میں عام

استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ نینو ٹیوبوں' جن کا بہت چرچا ہے' کے استعمالات پر تحقیقات بھی پورے جوبن پر ہیں اور یہ بھی آج نہیں تو کل بازار میں آنے والی ہیں' ہاں البتہ ان کے طویل المدتی اثرات آنکنے کے لیے کسی مناسب ٹیسٹ کی خبر سننے میں نہیں آ رہی۔

منڈی کے اُلٹے قوانین اور ٹیکنالوجی:

یہ تصور کے اصل چیز بس فوری مالی اضافہ ہی ہے' نہ صرف یہ کہ نئی مصنوعات کے اثرات کی بابت ذمہ دارانہ آنک کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے' بلکہ ایسے معاشی اصول جو منافعہ کو دیگر ہر چیز پر فائق سمجھتے ہیں' اچھی اور شفا بخش ادویات کو بھی مریضوں تک پہنچنے سے روکتے ہیں۔

مثال کے طور پر لوگ صدیوں سے جانتے ہیں کہ صنوبر کی چھال میں شفا ہے۔ امریکہ کے ریڈ انڈین باشندے ابھی تک صنوبر کو اس کے عملی' طبی اور روحانی خواص کے سبب ایک مقدس اور مذہبی درجہ دیتے ہیں۔ قدیم روسیوں کو اس ٹوٹکے کا علم تھا کہ صنوبر کی چھال کے ضماد سے زخم اچھا ہو جاتا ہے اور یہ چھال ارزاں بھی ہے اور کم و بیش ہر جگہ آسانی سے دستیاب بھی۔

منی سوٹا یونیورسٹی میں کیمیا کے پروفیسر رابرٹ کارلسن کو صنوبر کے طبی استعمال پر سند کا درجہ حاصل ہے اور انھیں اس سلسلے کا بانی بھی سمجھا جاتا ہے۔ باوجودیکہ انھوں نے اور ان کے رفقاء نے اپنے تجربات سے یہ ثابت کر کے دکھا دیا کہ صنوبر کی چھال سے حاصل ہونے والے رس سے درد کا علاج کیا جا سکتا ہے دواساز ادارے راستے کی دیوار بن کر محض اس لیے کھڑے ہو گئے کہ اس مفرد کو کارخانوں میں مصنوعی طریقے تیار نہیں کیا جاتا۔ کارلسن اس سارے ماجرے کا ملخص یوں بیان کرتا ہے: ''آپ کسی عمل کو تو پیٹنٹ کروا سکتے ہیں لیکن آپ فطرت کو پیٹنٹ نہیں کرا سکتے۔ لہٰذا درد کی بہترین دوا اس کی دریافت کے ایک عشرہ بعد تک بھی لوگوں کے ہاتھ نہیں پہنچ سکی۔(23)

یہاں مسئلہ کسی دریافت یا ایجاد کو پیٹنٹ کروانے سے متعلق قوانین کا نہیں ہے۔ جنھیں کہ بائیو کیمیکل کمپنیوں کے دباؤ کی وجہ سے تبدیل بھی کیا جا رہا ہے تا کہ وہ جینوں کو بھی پیٹنٹ کروا سکیں۔ مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ بڑے دوا ساز ادارے جو کہ مصنوعی مرکبات اپنے کارخانوں میں تیار کرتے ہیں جڑی بوٹیوں اور دیگر ارزاں اور روایتی دواؤں کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس روش میں تب ہی کوئی تبدیلی آ سکتی ہے کہ جب کاروباری

اداروں سے متعلقہ قوانین سب لوگوں کے طویل المدتی مفادات کو بھی ملحوظ رکھیں، صرف کمپنیوں کے قلیل المدتی منافعے پر توجہ نہ دیں۔

ہم میں سے بہت سے افراد کو اس صورتحال کے متعلق تشویش لاحق ہے لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ باتیں بہت سننے میں آتی ہیں، صنعتی وحرفتی قوانین میں کوئی خاص تغیر دیکھنے میں نہیں آتا۔

ٹیکنالوجی جدید تناظر میں:

بعدالجدیدی حرفتی سنگم کے مثبت استعمال کو یقینی بنانے کے لیے ہمیں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان ثقافتی اقدار اور معاشرتی اداروں پر توجہ دیں جو ہمارے اس بارے میں نظریے تشکیل دیتے ہیں کہ ہمیں کس نوع کی حرفتوں کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیے اور کس قسم کی حرفتوں کو بازار میں لانا چاہیے۔ ہم اس کا آغاز ٹیکنالوجی کی تعریف کی توسیع اور اس میں ان تمام آلات کے اشتمال سے کر سکتے ہیں جنھیں ہم انسان مختلف مقاصد کے لیے بروئے کار لاتے ہیں۔

ٹیکنالوجی سے مراد محض ہتھوڑی، چھینی، ویکیوم کلینز اور کمپیوٹر جیسے مادی اوزار و آلات ہی نہیں ہیں۔ مشہور مستقبل بین مفکر بک منسٹر فلر کے تصور کو آگے بڑھاتے ہوئے میں یہ تجویز دوں گی کہ ہم ٹیکنالوجی کی تعریف کو وسعت دے کر اس میں اپنے انسانی آلات یعنی اپنے ہاتھوں اور دماغوں کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔

وہ آلات اور افعال جو دماغی تخیل کے بل پر وجود میں آتے ہیں لامحالہ انسانی تخلیقات ہیں۔ اصل میں یہ ہمارے دماغ ہیں، بلکہ شروع سے ہی یہ ہمارے دماغ ہی ہیں جن سے کہ ہم اپنے اہداف و مقاصد کے حصول کے لیے بنیادی اوزاروں کا کام لیتے رہے ہیں۔ لوہے۔ لکڑی کے آلات نہیں بلکہ یہ ہمارے دماغ میں جنم لینے والے تصورات ہی ہیں جو کہ اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ کون سے مقصد کے لیے کون سی ٹیکنالوجی کو استعمال کیا جانا ہے۔

مقاصد و اہداف پر توجہ مرکوز کر کے ہم کسی ٹیکنالوجی کے مثبت اور منفی استعمالات میں تمیز کر سکتے ہیں۔ بجائے ٹیکنالوجی کو ایک ہی بڑی ٹوکری تصور کر کے استرے قینچی سے لے کر ہائیڈروجن بم تک اس میں ٹھونسنے کے ہم ٹیکنالوجی کو تین بنیادی انواع میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلی قسم ممد حیات حرفتوں کی ہے۔ یہ حرفتیں ہمارے اجسام اور ہمارے ماحول کی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے وضع کی جاتی ہیں۔ اس میں کھیتی باڑی' نور بافی' تعمیر اور ہماری زندگی کی بنیادی حاجات کو پورا کرنے کے دیگر طریقے آ جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہماری زبان اور ہماری ٹانگوں سے لے کر جیٹ ہوائی جہاز' ریڈیو' ٹیلی فون اور ای میل تک مواصلات ونقل وحمل کی حرفتوں کا ایک وسیع سلسلہ بھی اس میں شامل ہے۔

معاون حیات حرفتوں میں وہ طریقے بھی آ جاتے ہیں جو بچے کی درست پیدائش میں مدد دیتے ہیں اور والدین کی بچوں کی پیدائش میں وقفہ رکھنے میں اعانت کرتے ہیں تا کہ وہ انھیں مناسب طریقے سے پال پوس سکیں۔ اس میں مرض کے تدارک وعلاج کی حرفتیں اور ہمارے قدرتی ماحول کو آلودگی وتلفی سے بچانے میں کام آنے والی حرفتیں بھی شامل ہیں۔

دوسری قسم ان حرفتوں کی ہے جو شعور' استدلال' احساس' اختراع اور شفقت کی ہماری اعلیٰ ترین صلاحیتوں کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے وضع کی جاتی ہیں۔ میں انھیں تکمیلی حرفتوں (Technologies Actualization) کے نام سے موسوم کرتی ہوں۔ یہ حرفتیں ہمیں ملتفت روابط' معنویت' عدل اور آزادی کی ہماری عمیق انسانی آرزوؤں کی تکمیل میں ہماری معاونت کرتی ہیں۔

ان حرفتوں میں مادی وغیر مادی دونوں قسم کے عوامل شامل ہیں۔ موسیقی' مراقبہ' فنون لطیفہ اور روحانی بالیدگی کے لیے استعمال کی جانے والی دیگر تکنیکیں ان حرفتوں کی قدیمی مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں بچوں کی بہتر نگہداشت اور تعلیم وتربیت کے طریقوں کی طرح کی تعلقاتی حرفتیں اور تعلیم عامہ' جمہوری سیاست' منصفانہ معاشیات اور دیگر انسانی ایجادات کی طرح کی سماجی حرفتیں بھی شامل ہیں۔

تیسری قسم کی حرفتوں کو میں نے ہلاکتی حرفتوں کا نام دیا ہے۔ یہ والی حرفتیں پہلی دو انواع کی حرفتوں سے قطعی مختلف ہیں۔ ان کا مقصود نظر تخلیق نہیں تباہی ہے۔ ان میں قدیم جنگجو باشندے کی نوکیلی برچھی سے لے کر جدید ایٹمی اسلحے اور جراثیمی ہتھیاروں تک تشدد ودہشت کی ساری تکنیکیں آ جاتی ہیں۔

بیشک ممد حیات حرفتوں کو لازم نہیں کہ ہمیشہ مفاد عامہ کے لیے ہی استعمال میں لایا جائے۔ تسلطی نظام اقدار کے زیر اثر یہ حرفتیں ان طریقوں سے بروئے کار لائی جائیں گی کہ

ان سے زیادہ فائدہ اوپر والوں کو پہنچے اور باقی ''کھرچن'' نیچے والی خلقت تک بھی پہنچ جائے یا پھر انھیں ان طریقوں سے استعمال میں لایا جائے گا کہ جن سے ہم اپنی انسانی صفات سے ہی محروم ہو جائیں اور یہ بات ان حرفتی ایجادات پر بھی صادق آتی ہے جو کہ شراکت مائل نظام میں انسانیت کو روح فرسا مشقت سے خلاصی بھی دلا سکتی ہیں۔

لیکن ہمارے مستقبل کو درپیش سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ تسلطی ثقافتوں میں ایسا کوئی طریقہ نہیں ہوتا کہ جس سے ہلاکتی حرفتوں کے استعمال کی روک تھام کی جا سکے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسی ثقافتوں میں ہلاکتی حرفتوں کو ہمیشہ اولین ترجیح کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

آج کے دور میں ایٹمی اور جراثیمی حرفتیں اس قدر تخریبی طاقت کی حامل ہیں جو کبھی صرف ایک قادر مطلق اور قہار و جبار پدر خدا سے ہی منسوب کی جاتی تھی......یعنی روئے عالم کی تمام مخلوقات و موجودات کو یک لخت تباہ کر دینے کی طاقت اور بائیوٹیکنالوجی' نینوٹیکنالوجی اور روبوٹ عسکری ٹیکنالوجی کو ایسی ایسی ہلاکت آفرین چیزوں سے لیس کر رہے ہیں کہ جنھیں ہم نے کبھی تخیل میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

ٹیکنالوجی اور ہماری زندگی:

ٹیلی ویژن' کمپیوٹر' ویڈیو' فیکس' ای میل اور موبائل فون جیسی آج کے دور کی الیکٹرانی حرفتیں ہمیں تعلیم وتخلیق اور مواصلات کی حیرت انگیز نئی راہوں سے روشناس کرا رہی ہیں۔ ہم اپنے ٹی وی کے ذریعے ہزاروں میل دور رونما ہونے والے واقعات کو بڑے مزے سے گھر بیٹھے ملاحظہ کر سکتے ہیں' دوسرے براعظموں میں بیٹھے اپنے عزیز واقارب سے ایک ثانیے میں بات چیت کر سکتے ہیں اور کمپیوٹر پر بیٹھ کر پوری کی پوری کتاب لکھ سکتے ہیں، اس کی تدوین کر سکتے ہیں بلکہ اسے شائع بھی کر سکتے ہیں لیکن یہ محیر العقول آلات بعض مسائل کا باعث بھی بن رہے ہیں۔ بچے گھنٹوں ٹی وی سکرین پر نظریں جمائے بیٹھے رہتے ہیں جس پر ایسی کارٹون فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں جن میں ایک گھنٹے کے دورانیے میں اوسطاً 25 پرتشدد مناظر پیش کیے جاتے ہیں۔ (24) پھر اسی طرح کی تشدد سے پر ویڈیو گیمز بھی ہیں۔ ان کے طفیل بچوں میں فربہی اور جرائم ایک وبائی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ بچوں میں ویڈیو گیمز' انٹرنیٹ اور چیٹنگ کا خبط ان کی تعلیمی سرگرمیوں

> اور ان کی صحت پر انتہائی منفی اثرات مرتب کر رہا ہے جس نے ماہرین نفسیات کو تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔
>
> بلاشبہ بہت سے بالغ حضرات بھی اس لت کا شکار ہیں۔ انٹرنیٹ' موبائل فون' فیکس مشینیں' ای میل جیسی جدید اختراعات ہمارا بہت سا وقت چٹ کر جاتی ہیں۔ ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ پر اخبار و معلومات کی اس قدر بھرمار ہوتی ہے کہ اس کے بار تلے دب کر ہمارے ذہن کے لیے یہ سمجھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے کہ فی الواقع دنیا میں ہو کیا رہا ہے اور بجائے اس کے کہ ایسے جدید آلات کی بدولت کام کے دورانیے میں کوئی کمی آتی' ان الیکٹرانی ذرائع مواصلات کی تیز رفتاری کو ملازمین کو مزید سخت اور مزید لمبے دورانیے کے لیے کام کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔(25)
>
> یہ سب کوئی ایسا ناگزیر بھی نہیں اور اس کا ثبوت ہمیں مغربی یورپ کے ممالک سے ملتا ہے جہاں ملازمین اب پہلے کی نسبت کم دورانیے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ہم امریکہ میں بھی یہ دورانیہ کم کر سکتے ہیں تا کہ لوگ اپنے اہل و عیال اور عزیز و اقارب کے ساتھ زیادہ وقت گزار سکیں۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس سے پیداواریت میں کوئی کمی آ جائے گی کیونکہ جب لوگ تازہ دم اور مطمئن ہوں گے تو ان کی کام کرنے اور بہتر کام کرنے کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہو گا۔
>
> اسی طرح الیکٹرانک ٹیکنالوجی کے ساتھ در آنے والی تنہائی' بیگانگی اور ذہنی تھکاوٹ بھی کوئی ایسی ضروری اور ناگزیر چیز نہیں۔ اس سے بھی بچا سکتا ہے۔ ٹیکنالوجی کو اس طرح وضع کیا جا سکتا ہے کہ وہ انسانی احتیاجات کو پیش نظر رکھے۔ ہم ایک ایسے معاشی نظام کی طرف پیش رفت کر سکتے ہیں جس میں اعلیٰ حرفتوں کو اس ڈھنگ سے کام میں لایا جائے کہ جو ہمیں مزید ہیجان میں مبتلا کرنے کی بجائے ہمارے جسم کے تال و توازن کا خیال رکھے۔ اس طور ہم حرفتوں کو اس انداز سے بھی ڈیزائن اور استعمال کر سکتے ہیں کہ جو فطرت کے تال و توازن کو بھی خیال میں رکھیں۔

پینٹاگون یعنی امریکی وزارت دفاع کے ایک ذیلی ادارے نے حال ہی میں بغیر ڈرائیور کے چلنے والی بار برداری کی ایسی گاڑیوں کا ٹیسٹ کیا ہے جو اپنے اردگرد کے ماحول کے بارے میں استدلال کی صلاحیت کی حامل ہیں' زمین و آسمان میں امتیاز کر سکتی ہیں اور از خود بجلی کی سی سرعت سے فیصلے کر سکتی ہیں۔ اور یہ تو ابھی محض ایک آغاز ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

2004ء میں امریکی جوائنٹ فورسز ریسرچ سینٹر کے ایک افسر نے نیویارک ٹائمز کے ایک نمائندے سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ وقت کوئی زیادہ دور نہیں جب امریکی افواج میں بہت سی ذمہ داریاں روبوٹ اپنے کندھوں پر سنبھال لیں گے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ وقت بھی دور نہیں جب انتہائی ترقی یافتہ کمپیوٹروں سے لیس ایسی مشینیں استعمال کی جانے لگیں گی کہ جن میں ہلاک کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت بھی ہو گی۔ اس افسر نے اپنے بیان میں مزید کہا کہ ''مجھے وکیلوں نے بتایا ہے کہ اگر روبوٹ زندگی وموت کے فیصلے سرانجام دینے لگے تو اس میں کوئی قانونی امتناع حائل نہ ہوگا۔(26)

زندگی وموت کے فیصلوں کے لیے روبوٹوں کو استعمال میں لانا دیوانگی محسوس ہوتی ہے لیکن تسلطی ذہن کے لیے یہ بات بڑی صاف اور واضح ہے۔ انسان بعض اوقات کسی پر گولی چلاتے وقت یا کسی کی ٹانگ یا بازو توڑتے وقت متذبذب بھی ہو جاتا ہے مگر روبوٹوں کو کوئی احساس تنگ نہیں کر سکتا اور نہ ہی وہ کوئی تامل کریں گے۔ لہٰذا اگر بعد الجدیدی حرفتی سسٹم کو مثبت مقاصد کے لیے استعمال میں نہیں لایا جاتا تو جوائے کا ''مستقبل کو ہماری ضرورت کیوں نہیں ہے'' میں پیش کیا گیا تخیل حقیقت کا روپ دھار سکتا ہے۔

حرفتی تخیلات اور عالمی حقائق:

والدین اور صنعت وحکومت کے ہر پالیسی ساز کو اس بات کی فکر کرنی چاہیے کہ نئی حرفتوں کی توضیع او استعمال' احساس و ذمہ داری کی اقدار کے تحت عمل میں آئے۔ تاحال کمپنیوں اور حکومت کی جدید حرفتوں کی بابت رپورٹوں میں اس مسئلہ پر کم ہی توجہ دی جا رہی ہے۔

اکثر رپورٹوں میں صرف اور صرف منافع کی بات کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ادارہ برائے اقتصادی تحقیق کی 2002ء کی ایک رپورٹ میں یہ پیش گوئی کی گئی ہے کہ گھروں' کاروں اور دفاتر میں ذہانت کے حامل نیٹ ورکوں کی تنصیب کا کام جلد ہی 350 بلین ڈالر کی صنعت کی شکل اختیار کر لے گا۔ اس میں یہ بھی کہا گیا کہ جنیاتی طور پر ترمیم شدہ انواع اور عضویوں کی صنعت جلد ہی 140 بلین ڈالر کی سطح تک پہنچ جائے گی اور زراعت کی خودکاری چند برسوں میں 160 بلین ڈالر کی سطح تک پہنچ جائے گی۔ بجلی کی بجائے نوری امواج سے چلنے والے بصری کمپیوٹر 120 بلین ڈالر کے کاروبار کی شکل اختیار کر لیں گے اور گھر سے لے کر

کارخانے تک مختلف کام سرانجام دینے والے سمارٹ روبوٹ جلد ہی 90 بلین ڈالر کی صنعت بن جائیں گے۔(27)

امریکہ کی حکومتی رپورٹوں میں بھی بڑے جوش وخروش سے بیان کیا جاتا ہے کہ جدید حرفتیں کس طرح ملک کی کایاکلپ کردیں گی اوران سے کیا کیا ثمرات حاصل ہوں گے۔سی۔آئی۔اے کی قومی مجلس جاسوسی کی ایک رپورٹ عالمی رجحانات 2015ء میں سریع، کثیرالعمل اور ماحول دوست نئی مصنوعات کے اقتصادی اثرات کی بابت بہت سا اول فول پڑھنے کو ملتا ہے۔ اس میں یہ پیش گوئی بھی کی گئی ہے کہ ان سے صنعت، رسد اور لوگوں کے ذاتی طرز پر زندگی میں بہت سے فوائد حاصل ہوں گے۔(28) امریکہ کے قومی سائنسی ادارے اور وزارت تجارت کے تعاون سے تیار کی گئی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ''یہ حرفتیں ایک زریں دور کا باب وا کریں گی اوران سے انسانی تاریخ میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوگا۔اس میں یہ پیش گوئی کی گئی ہے کہ بائیوٹیکنالوجی، نینوٹیکنالوجی اور ذکاوت مصنوعی ارتقائے انسانی کو بیس برس کے عرصے میں بدل کے رکھ دیں گی۔(29)

کبھی کبھار ان رپورٹوں میں اس اعتراف کی جھلک بھی ملتی ہے کہ ان جدید حرفتی ایجادات سے اخلاقی، قانونی اور ماحولیاتی مسائل پیدا ہورہے ہیں لیکن وہ ان کے تجارتی و عسکری استعمالات سے لاحق ہونے والے خدشات کو شاذ ہی ذکر میں لاتی ہیں اور نہ ہی ان کی حرفتی یوٹوپیا کی تصویرکشی میں اس کا کوئی شائبہ نظر آتا ہے کہ جو اس بعدالصنعتی دور میں داخل ہونے کے بعد بنی نوع انسان کی اکثریت کے ساتھ ہورہا ہے۔

گزشتہ عشرے کے دوران کئی ممالک میں لوگوں کے حالات میں بجائے بہتری پیدا ہونے کے ابتری پیدا ہوئی ہے اور بالائی اور زیریں طبقات کے افراد کے درمیان خلیج میں اضافہ ہوا ہے۔ 25 اگست 2005ء میں اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ تقریباً ایک عشرے (1990ء تا 2001ء) کے دوران افریقہ میں صرف صحارا کے ذیلی منطقے میں غریب افراد کی تعداد میں 90 ملین کا اضافہ ہوا ہے۔لاطینی امریکہ میں بیروزگاری 1995ء میں سات فیصد سے بڑھ کر 2002ء میں نو فیصد تک پہنچ چکی تھی۔

باوجود ان دعاوی کے کہ سرمایہ داریت کی عالمگیریت سے سب کے معیار زندگی میں بہتری پیدا ہورہی ہے، اقوام متحدہ کی رپورٹ ''عالمی سماجی صورتحال اور ناہمواری کا مسئلہ'' ہمیں

MashalBooks.com

بتاتی ہے کہ زیادہ معاشی عالمگیریت کے ساتھ ممالک کے اپنے اندر اور ان کے درمیان ناہمواریوں میں بھی اضافہ ہوا ہے حتیٰ کہ امریکہ' کینیڈا اور برطانیہ جیسے امیر ممالک بھی اس رجحان سے بچ نہیں پائے ہیں اور اگرچہ چین اور بھارت میں بہت تیز معاشی ترقی دیکھنے میں آئی ہے، ان دونوں عظیم ایشیائی ممالک میں بھی ناہمواریوں کا سلسلہ بدستور وہیں پر ہے بلکہ چین میں تو معاملہ اور بھی خراب ہو رہا ہے۔(30)

متذکرہ بالا رپورٹ کے مطابق جنسی امتیاز کا شمار اب بھی ناہمواری وعدم مساوات کی دنیا میں سب سے زیادہ نمایاں مظاہر میں ہوتا ہے۔

افرادی قوت میں شامل ہونے کے زیادہ مواقع ملنے کی وجہ سے گو خواتین کو اب نسبتاً زیادہ معاشی آزادی حاصل ہو گئی ہے' وہ مردوں کے مقابلے میں پوری دنیا میں اب بھی بہت کم پیسہ کما رہی ہیں اور خصوصاً ترقی پذیر دنیا میں عورتوں کو اکثر وبیشتر محدود ہی غیر رسمی اور غیر منضبط بازاری معیشت تک دکھا جاتا ہے جہاں بقول لن چیو کے حالات کار ''انتہائی غلیظ' ذلت آمیز اور خطرناک ہوتے ہیں۔''(31)

دنیا کے غیر رسمی بازاری شعبے کے 60 فیصد کارکنان خواتین پر مشتمل ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ خواتین میں افرادی قوت میں شرکت کی شرح مردوں کی نسبت کس قدر کم ہے، 60 فیصد کا تناسب بہت بڑا محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ خواتین اور لڑکیوں میں تعلیم وخواندگی کی شرح میں اضافہ ہوا ہے' رسمی ملازمتوں میں ان کے تناسب میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہ وہیں کا وہیں رکا ہوا ہے بلکہ بعض ممالک میں تو یہ پہلے سے بھی کم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ان میں سے لاکھوں خواتین ایسی ہیں جو بڑی مشکل سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہیں۔

اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسیف کی 2005ء کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا کے نصف بچے غربت' جنگ اور ایڈز کے ہاتھوں انتہائی کسمپرسی اور محرومی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان محرومیوں کے طفیل ان بچوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے اور اس سے حقوق انسانی اور معاشی ترقی کے سفر میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی ہیں۔ (32) عالمی ادارہ صحت کی 2005ء میں جاری کردہ ایک رپورٹ کے مطابق بجائے اس کے کہ ان کے معیار زندگی اور دورانیہ حیات میں کوئی بہتری واضافہ ہوتا' افریقہ کے 35 فیصد بچے گزشتہ دس سال کی نسبت اب موت کے خطرے کا زیادہ شکار ہیں۔

MashalBooks.com

ان اعدادوشمار کو درپیش صورتحال کی بھیانکتا کی محض ایک ہلکی سی جھلک ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ہمیں قلت خوراک کے ہاتھوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتی معصوم جانوں کی شکلیں نہیں دکھاتے۔ ان سے ان یتیم اور بے سہارا معصوموں کا دکھ ہمارے سامنے نہیں آ تا جن کا بچپن گلیوں اور فٹ پاتھوں پر گزرتا ہے۔ یہ ہمیں ان عورتوں اور مردوں کی تکلیف نہیں دکھلاتے جنھیں صبح سے شام تک مشقت کرنا پڑتی ہے۔ان سے ہمیں ان خواتین کی بپتا کا کوئی پتہ نہیں چلتا جو بے چاری مناسب طبی سہولیات نہ ہونے کے کارن بچہ جنتی آگے سدھار جاتی ہیں۔

عالمگیریت' تسلط اور مشارکت:

بعض اوقات ہمارے سب عالمی مسائل کا الزام عالمگیریت کے سر تھوپ دیا جاتا ہے۔ اصل میں عالمگیریت کا مرقع اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔
ڈیوڈ کورٹن اور عالمگیریت کے دیگر نقادوں کا کہنا بالکل درست ہے کہ کشادہ سرحدوں اور غیر منضبط منڈیوں کے متقاضی معاہدے اکثر کم اجرتوں' غیر انسانی حالات کار اور قدرت کے وحشیانہ استحصال کا کارن بنتے ہیں۔ بعض مہربانوں کا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ بنیادی اشیائے ضروریہ' خدمات اور روزگار مقامی طور پر مہیا ہونے کی صورت میں مقامی آبادیاں معاشی اعتبار سے زیادہ مامون ہوسکتی ہیں۔ ان ماہرین میں یہ تصور زور پکڑ رہا ہے کہ دور پار کے آجروں کی کارپوریشنوں کے برعکس چھوٹی مقامی کمپنیوں سے یہ امید زیادہ کی جاسکتی ہے کہ وہ مقامی وسائل کو زیادہ احساس و ذمہ داری سے برتیں گی کیونکہ ان کی اپنی خوشحالی کا انحصار بھی انھی وسائل پر ہوتا ہے اور اگر ان کی کاروباری سرگرمیوں کے کارن صحت عامہ یا علاقے کے قدرتی ماحول کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اس کا بھگتان بھگتنے والوں میں وہ اور ان کے مالک خود بھی شریک ہوتے ہیں۔
لیکن معاشیات کی یہ مقامیت بھی سارے مسئلوں کا درماں نہیں۔ مقامی ثقافتی روایات نیز معاشی و معاشرتی ڈھانچے بھی بہت غیر منصفانہ ہو سکتے ہیں۔معروف ماہر معاشیات آگسٹولو پیز کارلوس عالمگیریت کی ناکامیوں کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اس کے ذمے لگائی جانے والی بہت سی بیماریاں اصل میں ان نااندیش سماجی پالیسیوں اور ثقافتی عادات و روایات کی دین ہیں جن کا عالمگیریت کے معاملے سے کوئی سروکار ہی نہیں۔'' آگے جا کر وہ ایک مثال سے وضاحت کرتے ہیں کہ ''نقد آور فصلوں سے حاصل ہونے والے پیسے کو یہ پیسہ کمانے والے حضرات کس طرح استعمال میں لاتے ہیں' اس کا انحصار

عالمگیریت سے زیدہ جنسیت اور شراب کی لت جیسے معاشرے میں گہرائی تک دھنسے مسائل سے زیادہ ہے۔'' ان کا کہنا ہے کہ ان خطوں میں جہاں مردانہ تسلط بہت زیادہ ہے، عالمگیریت خواتین کو روزگار کے حصول میں مدد دے رہی ہے اور اس طرح ان کی جبرواستبداد سے نجات حاصل کرنے میں معاونت کر رہی ہے۔ لہٰذا یہاں آ کر ہمیں ایک بار پھر یہ چیز نظر آ رہی ہے کہ فقط معاشیات پر ساری توجہ مرکوز کر کے معاشی پالیسیوں اور وتیروں کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ ایک زیادہ عادلانہ اور پائیدار معاشی نظام ایک وسیع تر ثقافتی تناظر پر توجہ کا بھی متقاضی ہے۔

آیا منڈیوں کی عالمگیریت مثبت رنگ اختیار کرتی ہے یا منفی اس کا زیادہ انحصار ان اصولوں اور پالیسیوں پر ہے جو سے کنٹرول کرتے ہیں۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ آیا کارکنوں، صارفین اور قدرتی وسائل کو کوئی تحفظ ملتا ہے یا کہ نہیں اور ہاں اس کا انحصار متوجہ قومی اور بین الاقوامی پالیسیوں پر بھی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ عالمی تجارت سے سب کے معیار زندگی میں بہتری آئے، جیسا کہ اس کے علمبرداروں کا دعویٰ ہے تو ہمیں معاشی اصولوں اور ڈھانچوں میں تبدیلی لانا ہوگی۔ اس کے لیے ایسے بین الاقوامی اصولوں کی ضرورت ہے جو بڑی کارپوریشنوں کو اقتصادوسیاست پر تسلط جمانے سے روکیں۔ اس واسطے ایسے قواعد وضوابط مطلوب ہیں جو معاشی وماحولیاتی ذمہ داری اور قلیل المدتی کاروباری اہداف کی بجائے طویل المدتی اہداف پر توجہ کو یقینی بنائیں۔

بقول لوپیز کارلوس ''معاشی عالمگیریت کے ساتھ ساتھ ہمیں معاشرتی پالیسی کو بھی ایسے رخ موڑنے کی ضرورت ہے کہ جس سے عالمگیریت کے مثبت اثرات کو برقرار رکھا جا سکے اور ان کی افزائش کی جا سکے اور آخر کلام اس بات کا انحصار کہ معاشیات فقط چند افراد کے مفادات پوری کرتی ہے یا کہ سب کے وسیع تر مفاد میں کام کرتی ہے، اس بات پر ہے کہ آیا اس کے پیچھے کارفرما سماجی ڈھانچے اور ثقافتی اقدار کا میلان تسلطی نظام کی طرف ہے یا کہ شراکتی نظام کی طرف اور یہ بات مقامی سطح پر بھی صادق آتی ہے اور بین الاقوامی اعتبار سے بھی۔

لب لباب ساری گفت شنید کا یہ ہے کہ تجارتی عالمگیریت آج کے بعد الصنعتی عہد کی معاشی زندگی کی ایک حقیقت ہے اور دارومدار سارا اس بات پر ہے کہ آیا یہ تسلطی نظام اقدار کے تحت پروان چڑھتی ہے یا کہ شراکتی۔(33)

جیسے کہ ''عالمی سماجی صورتحال'' کے مصنفین نے لکھا ہے، ترقیاتی حکمت عملی میں صرف اور

صرف معاشی نشوونما اور پیدائش دولت پر ہی ساری توجہ مرکوز کر دینا غیرانسانی بھی ہے اور غیرسودمند بھی۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ طرزِعمل نہ صرف دولت کے چند ہاتھوں میں ارتکاز اور بہت سے لوگوں کی غربت میں اضافے کا موجب بنتا ہے بلکہ یہ ہمیں معاشی عدم استحکام کی طرف بھی لے جاتا ہے ''جس کی قیمت ہر کسی کو ادا کرنا پڑتی ہے۔''(34)

یہ بات واضح ہے کہ اگر اس دنیا کے باسیوں کی اکثریت فلاکت و مفلس کا شکار ہو گی تو اعلیٰ ٹیکنالوجی یا کسی ''عہدِ زریں'' کی بات کرنا فضول ہو گا۔ انسانیت کو کسی بہتر عہد تک لے جانے کے لیے ہمیں انسانوں اور ان کی زندگیوں کو درپیش حقائق پر توجہ دینا ہو گی اور ان حقائق کے پیچھے کارفرما عوامل پر بات کرنا ہو گی۔

ہمیں اس حقیقت پر غور کرنا ہو گا کہ فی منٹ ایک بچہ قابل تدارک وجوہات کے باعث موت کا نوالہ کیوں بن جاتا ہے اور ہر سال ہزاروں نہیں لاکھوں عورتیں زچگی و حمل سے متعلقہ پیچیدگیوں کے ہاتھوں جان سے ہاتھ کیوں دھو بیٹھتی ہیں۔ یہ پیچیدگیاں اکثر اسقاطِ حمل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں اور اسقاطِ حمل کی روش وہ افراد اختیار کرتے ہیں جو اور بچہ نہیں جننا چاہتے۔ بے تحاشا بڑھتی عالمی آبادی کے آگے بند باندھنا آج کے اس بعد الصنعتی حرفتوں کے دور کی اہم ضرورت ہے جس میں انسانی کارکنوں کی جگہ حساس مشینیں اور خودکار آلات لے رہے ہیں اور بہت سی بنیادی اشیاء و خدمات کے لیے پہلے کی طرح زیادہ افرادی قوت کی ضرورت ختم ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔

ہمیں اس مسئلے پر توجہ دینا ہو گی کہ اس بے تحاشا بڑھتی آبادی کے طفیل کرہ ارض کی ایک تہائی غیرانسانی انواع کے ناپید ہونے کا خدشہ لاحق ہو گیا ہے۔ سائنسدانوں کے بقول ماضی میں ناپید ہو چکی انواع کے علاوہ کم و بیش 24 فیصد (1130) ممالیہ اور 12 فیصد (1183) طائرانہ انواع ہماری زمین سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو سکتی ہیں۔(35)

ہمیں سائنسدانوں کی اس تشویش کے بارے میں سوچنا چاہیے کہ انسانی سرگرمیوں کے سبب ہونے والی ہمارے قدرتی ممدِ حیات نظاموں کی تباہی و بربادی کو کس طرح روکا جا سکتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے ہزار سالہ ماحولیاتی تخمینے کے مطابق صرف گزشتہ پچاس برسوں کے دوران عالمی آبادی بڑھ کر دگنی ہو چکی ہے اور ہم آدھے سے زیادہ جنگلات، زرعی اراضی، چراگاہوں، دریاؤں اور جھیلوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ یہ جائزہ مرتب کرنے والے 95

MashalBooks.com

ممالک کے سائنسدانوں کی متفقہ رائے ہے کہ اگر ہم پالیسیوں اور اداروں میں کوئی بڑی تبدیلی پیدا نہیں کرتے تو آئندہ پچاس برسوں میں دنیا کی آبادی 6.5 بلین سے بڑھ کر 9.1 بلین تک پہنچ جائے گی اور خوراک، پانی، ایندھن اور توانائی کی بڑھتی ہوئی طلب سے ہمارا جینا دوبھر ہو جائے گا۔ ان سائنسدانوں نے آنے والے وقت سے متعلق جن خدشات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں نئی اقسام کی امراض' پانی کی ابتر ہوتی صورتحال' سواحل کے ساتھ ساتھ ''مناطق مردار'' کا ظہور' ماہی گیری کی صنعت کا خاتمہ اور علاقائی آب و ہوا اور موسموں میں بڑی تبدیلیاں شامل ہیں اور قارئین کرام ان خدشات میں سے بعض تو پہلے ہی حقیقت بن کر ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔

بے قابو آبادی اور معاشی ناہمواریاں بھی عالمی دہشت گردی او رجنگ وجدال میں اضافے کا باعث بن رہی ہیں۔ یہ بڑھتا ہوا تشدد جیسا کہ اکثر خیال کیا جاتا ہے' صرف مفلسین کی معاشی وسائل پر دسترس کی جدوجہد کا ہی نتیجہ نہیں ہے۔ اس کی جڑیں اس سے زیادہ گہری ہیں۔ اس کی جڑیں دوسروں پر تسلط جمانے کے لیے جبر و زبردستی کے استعمال کی ریت تک جاتی ہیں جس کی شروعات تسلطی خاندانوں سے ہوئی۔ مثال کے طور پر نیویارک کے عالمی تجارتی مرکز کے واقعے میں ملوث اکثر دہشت گردوں کا تعلق مالدار سعودی گھرانوں سے تھا جہاں عورتوں اور بچوں کو بہت زیادہ دبا کر رکھا جاتا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ مسلسل بڑھتی ہوئی آبادی' غریب ممالک میں نوجوانوں کا غیر معمولی تناسب اور اوطان عالم کے اندر اور ان کے درمیان بے حد معاشی ناہمواریاں عالمی تشدد میں اضافے کے پیچھے کارفرما اہم عوامل ہیں۔

نئی حرفتوں سے یہ مسائل حل نہیں ہوں گی۔ بلاشبہ یہ جدید حرفتیں زندہ رہنے اور بہتر زندگی بسر کرنے مین انسان کی مدد کر سکتی ہیں لیکن یہ تبھی ہوگا کہ جب ہم صرف قلیل المدتی کاروباری منافعہ دینے والی حرفتوں پر ہی سرمایہ کاری نہ کریں بلکہ ان حرفتوں کو بھی کھاد پانی دیں جو طویل المدتی معاشی و ماحولیاتی فائدے دیتی ہیں۔ اس کی مثال آبادی کی شرح اضافہ میں استحکام کے لیے خاندانی منصوبہ بندی کی حرفتوں پر سرمایہ کاری اور ان اقدار کو تبدیل کرنے کے لیے مواصلاتی حرفتوں کا زیادہ استعمال ہے جو خواتین کی تعریف مردوں کے تابع تناسلی حرفتوں کے طور پر کرتی ہیں۔ اس کی مثال شمسی سیلوں پر مال صرف کرنا اور ترقی پذیر ممالک میں شمسی تنوروں پر سرمایہ کاری کرنا ہے تا کہ درختوں کو تلف ہونے سے بچایا جا سکے اور لکڑی اور کوئلے

کی انگیٹھیوں سے اٹھنے والی زہریلی گیسوں اور شعلوں سے لوگوں کو محفوظ رکھا جا سکے۔ اس سے مراد سائنس وٹیکنالوجی کے ایسے معیارات ہیں جو بعدالجدیدی حرفتی سنگم کو تخریبی حرفتوں کی بجائے ممدحیات اور تکمیلی حرفتوں میں ڈھال سکے۔

تاہم اگر بائیوٹیکنالوجی' نینوٹیکنالوجی اور روبوٹ ٹیکنالوجی کو ممدحیات اور تکمیل حرفتوں کے طور پر استعمال کیا بھی جاتا ہے تو بھی یہ ہمیں درپیش مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کافی نہ ہوگا۔ یہ مسائل اتنی جلد حل ہونے کے نہیں اور مادی حرفتوں سے تو ان کے جلد حل ہونے کی آس کرنا ویسے ہی فضول ہے۔ ہمیں مادی حرفتوں کے ساتھ ساتھ سماجی حرفتوں کی ترقی پر بھی توجہ دینا ہوگی۔

ہمارے مستقبل کا سب سے اہم مسئلہ حرفتی نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ہم اس سے انکار واغماض کی روش کو کتنی جلد ترک کرتے ہیں کہ جو دنیا میں فی الواقع ہو رہا ہے اور یہ ہے کہ ہمیں زندگی گزارنے اور روزی کمانے کے ایسے ڈھنگ پر آنے کے لیے کیا کرنا چاہیے کہ جس سے انسان اور ہمارے قدرتی ماحول کے لیے احساس وفکرمندی کو فروغ ملے۔ جیسا کہ ہم آئندہ دو ابواب میں دیکھیں گے ہم یہ ڈھنگ اختیار کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر کی گہرائی میں بیٹھے ان اعتقادات کو تبدیل کریں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم انسان کیا ہیں اور کیا بن سکتے ہیں۔

MashalBooks.com

باب نہم

ہم کون ہیں اور کہاں کھڑے ہیں

ریان کی عمر چھ برس ہو گی جب شمالی گرینول کینیڈا میں اس کے پہلی جماعت کے معلم نے اپنے شاگردوں کو بتایا کہ افریقہ میں بچے صاف پانی نہ ملنے کے کارن بیماریوں میں مبتلا ہو کر موت کا شکار بن رہے ہیں۔ ریان نے ٹھانی کہ وہ ان بچوں کی امداد کے لیے چندہ جمع کرے گا۔ اس نے گھریلو کام کاج کر کے 70 ڈالر جمع کر لیے اور پھر دوسرے لوگوں سے چندہ لے کر 2000 ڈالر کی رقم اکٹھی کر لی جس سے 1999ء میں شمالی یوگنڈا میں واقع ایک مقام انگولو کے ایک مدرسے کے نزدیک پانی کا ایک کنواں تعمیر کیا گیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک ریان کے رفاہی ادارے ویل فاؤنڈیشن نے واٹرکین اور فری دا چلڈرن جیسی دوسری مخیّر تنظیموں کے تعاون سے کوئی دس لاکھ ڈالر سے زائد کی رقم جمع کی ہے جس سے دس پسماندہ ممالک میں 196 کنویں تعمیر ہوں گے اور 350,000 سے زیادہ افراد کو فائدہ پہنچے گا۔ (1)

جب کلارا ہیل کا 1992ء میں انتقال ہوا تو تب تلک وہ 800 سے زائد ایسے بچوں کا سہارا بن چکی تھی جو ایڈز کے موذی مرض میں مبتلا تھے یا پھر وہ نشے کی لت میں گرفتار ماؤں کے بچے تھے یعنی ایسے بچے جنھیں کوئی بھی نہیں پوچھتا تھا۔ شروع میں اس نے یہ کارِ خیر ہارلم میں واقع اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں لاوارث بچوں کی نگہداشت سے کیا جہاں چھ ماہ کے عرصے میں 22 ایسے بچے جمع ہو چکے تھے جو سب کے سب ایڈز کا شکار تھے۔ کچھ عرصے بعد اس نے مقامی حکام کے تعاون سے ایک عمارت حاصل کر لی جہاں وہ اپنے اس دھرم کو عمل شکل دے کر دنیا کو دکھلاتی رہی کہ سب بچوں کو پیار کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ سب اس کے مستحق بھی ہوتے ہیں۔ (2)

MashalBooks.com

یہ ایسے افراد کی محض دو مثالیں ہیں جو ایسے لوگوں کو شفقت اور سہارا دینے کا بیڑا اُٹھاتے ہیں جن سے ان کا کوئی بھی رشتہ یا ناطہ نہیں ہوتا۔ اس طرح کے درددل رکھنے والے افراد دنیا میں ہزاروں ہوں گے۔ یہ لوگ بعض اوقات ایسے لوگوں کو بچانے کے لیے اپنی زندگیوں کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں کہ جن سے کبھی ان کی ملاقات بھی نہیں ہوئی ہوتی۔ یہ اسی قبیل کے لوگ ہوتے ہیں جو کسی ڈوبتے کو بچانے کے لیے بپھری لہروں میں چھلانگ لگا دیتے ہیں اور موت میں گھرے انسانوں کو نکالنے کے لیے جلتی ہوئی عمارتوں میں کودنے سے گریز نہیں کرتے۔ بعض موتی تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو ناشناسا انسانوں کی مدد کرنے میں اپنی اور اپنے کنبے کی جان کو خطرے میں ڈالنے سے بھی نہیں چوکتے۔ یہ اسی سلسلے کے لوگ تھے جنھوں نے دوسری جنگ عظیم میں یہودیوں کو ان نازی درندوں سے بچانے کے لیے پناہ دی تھی جو انھیں چوہوں کی طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر مار رہے تھے اور یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ اگر نازیوں کو بھنک پڑ گئی تو وہ انھیں تو کیا ان کے سب بال بچوں کو بھی بنا کسی تامل بھون کر رکھ دیں گے۔

اس نوع کے کارہائے خیر اس روایتی عقیدے کی تکذیب کرتے ہیں کہ مہر و مودت کی دنیا ہماری خلقی خودغرضی اور کمینہ سرشتی سے کوئی میل نہیں رکھتی لیکن یہ عقیدہ ایسے ہی نہیں آ گیا۔ یہ سرشت انسانی سے متعلق ہماری زبان زدعوام حکایات کے اندر بڑی گہرائی میں جاگزیں ہے۔ ''ازلی گناہ'' کی مرتکب ناقص انسانی نسل سے متعلقہ مذہبی حکایات کے اندر اور ان عمرانی و حیاتیاتی نظریات کے اندر جو ہمیں بتلاتے ہیں کہ انسانی ارتقاء ایسی ''کمینہ جینوں'' سے عمل میں آیا ہے جو ہمیں دوسروں کی مدد پر صرف اس صورت میں مائل کرتی ہیں کہ جب ہمیں اس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی فائدے کی امید ہو۔''

آج کی اس باہم متصل دنیا میں جہاں سات سمندر پار ہونے والے واقعات بھی ہم پر اچھے برے اثرات مرتب کر سکتے ہیں، یہ کہنا بجا ہے کہ دور دراز کے لوگوں کی مدد کرنے سے ہمیں فائدہ پہنچے گا۔ لہٰذا اس طرح اجانب وخوارج کے لیے احساس ہمدردی کو بھی ذاتی مفاد کے زمرے میں ڈالا جا سکتا ہے اور اس بات سے بھی انکار نہیں کہ یہ ایک بہت اہم انسانی محرک ہے۔ بلاشبہ ہے لیکن انسانی رویے اور انسانی سرشت کی بات صرف خودغرضی پر آ کر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ یقیناً ہم میں بےحسی، جبر، حرص اور زیادتی کے جراثیم بھی وافر ہیں لیکن اس کے ساتھ ہم انسانوں میں توجہ و احساس اور جود و سخا کی خصلتیں بھی موجود ہیں۔

ہمارے ارتقا نے توجہ وعنایت کی صلاحیت بھی ہماری گھٹی میں اسی طرح ڈالی ہے جیسے جور وجبر کی بلکہ توجہ و احساس کی کچھ زیادہ ہی ہوگی۔ توجہ ونگہداشت انسانی بقا کا اولین تقاضا ہے۔ بچے کی دیکھ بھال تو ممالیوں میں پہلے ہی لازم تھی لیکن چونکہ انسانی کو ایک طویل عرصے تک بڑوں کی نگہداشت پر انحصار کرنا ہوتا ہے، ہماری نوع یعنی نوع بشر کے ارتقائی منظر پر نمودار ہونے پر اس صفت کی اہمیت اور بھی دوچند ہوگئی۔

اسے اس ارتقائی عمل کی دین ہی کہہ لیں کہ ہم انسانوں کے عصبیوں کی کیمیائی ساخت کچھ اس طرح کی ہے کہ ہم جب دوسروں پر توجہ دیتے ہیں اور ان کا خیال کرتے ہیں تو یہ عمل ہمیں ایک داخلی مسرت اور خوشی سے ہمکنار کرتا ہے۔ ہم سب زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے میں اس مسرت اور شادمانی سے بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ ہم جب کسی بچے، معشوق، سنگی حتیٰ کہ کسی پالتو جانور پر بھی اپنی شفقت اور التفات نچھاور کرتے ہیں تو ہمیں ایک نادیدنی سی اور ایک لفظوں کی گرفت میں نہ آنے والی اندرونی فرحت اور طمانیت کا احساس ملتا ہے۔ اسی طرح ہم دوسروں، خواہ وہ غیر اور اجنبی ہی کیوں نہ ہوں، کی مدد کر کے بھی اچھا محسوس کرتے ہیں۔

دوسروں پر شفقت اور دوسروں کی مدد کے انسانی جذبے کا مشاہدہ ننھے بچوں میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ ابھی حال ہی میں میکس پلانک ادارہ برائے ارتقائی بشریات کے سائنس دان فیلکس وارلیکن کے تجربوں سے بھی اس چیز کے شواہد ملے ہیں۔ ایک تجربے کے دوران وارنیکسن نے ڈیڑھ سال کی لگ بھگ عمر کے 24 بچوں کو ایک جگہ بٹھا کر ان کے سامنے تولیہ لٹکانے یا کتابوں کو جوڑنے جیسے معمولی کام کرنے شروع کر دیے۔ بار بار کے اعادے سے اس کے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ جب بھی ''اتفاقاً'' اس کے ہاتھ سے تولیہ گر جاتا تھا یا کتابیں ڈھے جاتی تھیں تو تجربے میں شامل ہر بچہ فوراً اس کی امداد کو لپکتا تھا لیکن وہ ایسا صرف اسی صورت میں کرتے تھے جب انھیں محسوس ہوتا تھا کہ وارلیکن کو اعانت کی ضرورت ہے۔ جب وہ کوئی چیز یونہی فرش پر پھینکتا یا کتابیں گراتا تو بچے کوئی ردعمل ظاہر نہ کرتے اور کوئی بھی اس کی مدد کو آگے نہ بڑھتا لیکن دوسری جانب جب انھیں لگتا کہ اسے مدد کی ضرورت ہے تو سب بچے رینگتے اس کے پاس پہنچ جاتے اور چیزیں پکڑ پکڑ اسے پکڑانے لگتے۔(4)

بچوں کے داخلی محرکات کو آنکنے کے لیے وارلیکن نے کیا کیا کہ ان کا شکریہ ادا کرنا بند کر

دیا۔ اس سے اس کے سامنے جو بات آئی وہ یہ تھی کہ بچوں کے اندر فقط احساس اور بے لوث خدمت کا جذبہ کارفرما ہے نہ کہ کسی طور کی مدح وانعام کا لوبھ۔

لہٰذا ایسے تجربات وشواہد پر اساس کر کے ہم کہہ سکتے ہی کہ نصرت واعانت اور توجہ و عنایت کی خصلتیں اور جذبے بھی ہماری سرشت کے تاروپو میں بدرجہ اتم موجود ہیں اور ہمارے خمیر کا حصہ ہیں لیکن کسی طرف سے سوال آ سکتا ہے کہ اس کے باوجود ہماری دنیا میں توجہ اور جذبہ خدمت کی اس قدر کمی کیوں ہے؟ اس سوال کی تسلی کے لیے ہمیں حیاتیات کی اقلیم سے ہٹ کر ثقافت کے شعبے کا رخ کرنا ہوگا۔

عصبی سائنس کیا کہتی ہے؟

ہمارا دماغ ہمارے اردگرد کے ماحول سے کس طرح اور کیا اثر قبول کرتا ہے‘ اسے سمجھنے کے لیے گزشتہ چند عشروں میں ہمارے سائنسی بھائیوں نے بہت کام کیا ہے۔ فطرت بمقابلہ فطرت کی پرانی دلیل کی جگہ اب یہ خیال لے رہا ہے کہ دماغ اور ماحول دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں کام کرتے ہیں۔

سائنسدانوں کے مطابق انسان کے دماغ کی بیشتر نشوونما پیدائش کے بعد عمل میں آتی ہے اور یہ کہ ہماری ابتدائی عمر کے واقعات وتجربات اس نشوونما کی سمت متعین کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہمارے دماغ کے عصبی تاروپو ہماری جینوں اور ہمیں ابتدائی عمر میں ملنے والے ماحول (خصوصاً انسانی ماحول اور جس قسم کی نگہداشت ہمارے حصے میں آتی ہے) کے باہمی تعامل سے تشکیل پاتے ہیں۔

ابتدائی تجربات کی اہمیت اپنی جگہ لیکن ہم انھیں پتھر پر لیک بھی قرار نہیں دے سکتے۔ ہماری بقیہ عمر میں بھی ہماری جینوں‘ ہمارے ماحول اور ہمارے فیصلوں کے باہمی تعامل کے طفیل ہمارے دماغ میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔

ہم جو راستے اختیار کرتے ہیں وہ ہمارے رویوں پر بہت زیادہ اثرانداز ہوتے ہیں۔ بیشک ہماری جینیں اور ہمارے تجربات بھی ہمارے فیصلوں کو متاثر کرتے ہیں لیکن ہم انسانوں میں یہ ایک خاص خصوصیت بھی موجود ہے کہ ہم شعوری فیصلے بھی کر سکتے ہیں۔

ارتقائے حیات نے ہمارے دماغ میں ایسے منطقے بھی رکھے ہیں جن کی مدد سے ہم

لاشعوری ہیجانات سے بالا ہو کر دانستہ فیصلے بھی انجام دے سکتے ہیں اور شعوری طور پر اپنی روشیں بھی چن سکتے ہیں اور یہ روشیں بعدازاں ہمارے تجربات اور ثقافتی ماحول پر بھی اثرانداز ہوسکتی ہیں۔

ہمارے اختیارکردہ راستے اور روشیں ہمارے دماغ کو کیسے متاثر کرتی ہیں، اس کا پتہ ہمیں حال ہی میں ہونے والی سائنسی تحقیقات و تجربات سے چلتا ہے۔ 2002ء میں ایمری یونیورسٹی کے عصبی سائنس کے ماہرین نے جدید عکسی آلات اور تکنیکوں کی مدد سے یہ پتہ چلانے کی کوشش کی کہ جب لوگ محض حرص یا منفعت باہم کے جذبے کے زیراثر کام کر رہے ہوتے ہیں تو ان کے دماغ میں کیا عوامل وقوع پذیر ہوتے ہیں۔(5) انھیں یہ جان کر تعجب ہوا کہ دماغ کے شدید ترین ردعملوں کا انحصار کسی بازی کو مالی منفعت کے لیے جیتنے یا ہارنے پر نہیں ہے۔ دماغ میں صحیح معانوں میں نور تب کوندتا ہے جب کھلاڑی ''بس میں'' کی بجائے باہمی تعاون کی سوچتے ہیں اور صبنور اس سے دماغ کے وہ گوشے اور مراکز منور ہوتے ہیں جن کو خوشی و مسرت کے جذبات و ہیجانات سے منسوب کیا جاتا ہے۔(6)

ان تجربوں کے نتائج کے بارے میں نیویارک ٹائمز کے صحافیوں سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر گریگری برنز نے بتایا کہ سب سے درخشاں لمعات اجتماعی تعاون اور باہمی تمتعات کے نتیجے میں پیدا ہوئے اور یہ لمعات دماغ کے ان مناطق میں رونما ہوئے جو شیرینی، خوبرو افراد کی تصویروں، مال وزر، حشیش اور دوسرے متعدد جائز وناجائز تلذذات جیسے محرکات کے ردعمل میں تحرک میں آنے کے لیے معروف ہیں۔ (7) دوسرے لفظوں میں وہ دماغ کے تفریحی وانبساطی مراکز میں پیدا ہوئے۔

مرقومہ بالا تجربے کے دوران کھلاڑی جس قدر زیادہ دورانیے کے لیے باہمی منفعت و تعاون کی روش پر رہے، ان کے دماغ کی انبساطی راہداریوں کی جانب خون بھی اسی قدر زیادہ رواں ہوتا دیکھنے میں آیا۔ تاہم کسی انسان کی بجائے کمپیوٹر سے بازی لگانے کی صورت میں معمولین میں تعاون کے جذبے کی کمی بھی دیکھنے میں آئی اور گو تجربے کی شمولیت میں مالی تحریص کا عنصر بھی شامل تھا لیکن جہاں تک تجربے کے دوران کھیلے جانے والے کھیل کا تعلق ہے۔ اس میں بیشتر اوقات تعاون کی خوشی ہی سودی جذبے پر بازی لیتی نظر آئی۔(8)

یہ تجربہ کہ مالی منفعت کے خیال کے بجائے مونسیت وانسانی تعلق کی سوچ انسان میں

سب زیادہ نشاط انگیز تاثرات پیدا کرتی ہے اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ ہماری نوع کے ارتقائی مراحل کے دوران ہماری بقاء کو زیادہ یقینی بنانے کے لیے باہمی اعتنا واحساس اور تواضع باہمی کو ہماری سرشت کے بنیادی اجزائے ترکیبی میں ایک اہم عنصر کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اس تجربے میں شامل کھلاڑیوں کی طرح ہمیں اپنے راستے خود منتخب کرنے کا اختیار ملے تو ہم حرص وخودغرضی کی بجائے باہمی توجہ وتواضع کو اختیار کرنا زیادہ پسند کریں گے کیونکہ اس سے ہمیں زیادہ خوشی ملتی ہے۔

انتخاب کے بارے میں ہم عموماً یہ سوچتے ہیں کہ یہ ایک انفرادی معاملہ ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ بات ہے بھی ٹھیک لیکن ہم جو بھی انتخابات عمل میں لاتے ہیں وہ اسی تنگ دائرہ اختیارات کے اندر رہ کر ہی عمل میں لا سکتے ہیں جو ہمیں دیا جاتا ہے یا جو ہم سوچتے ہیں کہ ہمیں دیا گیا ہے۔

ایمری والے تجربے میں شرکاء کے اختیارات کا تعین محققین نے کیا لیکن حقیقی زندگی میں ہمارے اختیارات کا تعین زیادہ تر وہ ثقافت اور معاشرہ کرتا ہے کہ جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر ہماری ثقافت کا میلان تسلطی نظام کی جانب بہت شدید ہے تو لوگوں کے حقیقی اور یا متصورہ اختیارات بھی بہت محدود ہوں گے اور ان کی اختیار کردہ روشوں میں اپنے سے نیچے والے انسانوں کے لیے اعتنا واحساس کا عنصر بھی بہت کم ہوگا یا سرے سے ہوگا ہی نہیں۔

مثال کے طور پر ہمارے سامنے یہ خبر آ سکتی ہے کہ بھارت میں کسی غریب گھرانے نے اپنی گیارہ سالہ بچی کو جنسی کنیز کے طور پر فروخت کر دیا ہے اور یہ سب جانتے بوجھتے فروخت کر دیا ہے کہ وہ آئندہ ساری زندگی کے لیے ذلت اور جبر کی چکی کاٹنے پر مجبور ہو جائے گی اور پھر ایڈز یا کسی اور ایسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دے گی۔ ممکن ہے کہ وہ سوچیں کہ ان کے پاس تو کوئی اور راستہ ہی نہیں تھا۔ واحد راہ یہی تھی جس سے وہ اپنی روٹی پوری کر سکتے تھے، ٹھاکر کا قرض چکا سکتے تھے، جہیز کے خرچے سے بچ سکتے تھے اور اپنے لڑکے کو تعلیم دلا سکتے تھے۔ ان کے لیے یہ راستہ بہت معقول تھا اور اس خطے میں یہ کوئی نئی بات بھی نہیں۔ جنوبی ایشیا میں بچپن کی شادیوں کی ریت بڑے پرانے وقتوں سے چلی آتی ہے۔ (9) اور اس کے بڑے تو ایک طرف ممکن ہے کہ خود وہ بچی بھی اس سودے کو ہنسی خوشی

قبول کر لے اور کسی خفگی کا اظہار نہ کرے کیونکہ اس نے اس معاشرے میں اپنی بے قدری کو قبول کر لیا ہوا ہے اور اسے یہ قبول کرنا معاشرے کی طرف سے سکھایا گیا ہے کہ جس میں بچیوں کو لڑکوں کے مقابلے میں ہمیشہ حقیر اور کمتر تصور کیا جاتا رہا ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ بے چاری کے پاس بھاگنے کا کوئی اور راستہ بھی تو نہیں کیونکہ سارا گاؤں اس سودے کے پیچھے ہوگا اور اس کی توثیق کرے گا۔

کوئی پوچھ سکتا ہے کہ بھلا والدین' والدین ہو کر اپنے ہی بچوں پر ایسا ظلم کیوں کرنے لگے؟ بلاشبہ ثقافتی عوامل اس کا بڑا سبب ہیں لیکن عصبی سائنس کچھ اور اشارے بھی فراہم کرتی ہے جو ہمیں بتلاتے ہیں کہ شدید اور دائمی دباؤ ہمارے احساس و ہمدردی کے جذبے نیز اختیارات کو آنکنے اور صحیح راستوں کا انتخاب کرنے کی صلاحیت کو بھی مار دیتا ہے۔

عصبی سائنس کی ماہر ڈیبرا ایہوف کے مطابق مسلسل ذہنی دباؤ عصبی کیمیائی ترکیب کو اس طرح تبدیل کر دیتا ہے کہ دوسروں کا ہوش ہی نہیں رہتا بلکہ اپنا بھی جاتا رہتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ذہنی دباؤ کے شکار شخص کا دماغ بہت زیادہ عصبی توانائی اذیت کا چارہ تلاش کرنے میں اور احساس اذیت کو ذہن سے محو کرنے میں صرف کر رہا ہوتا ہے۔ ڈیبرا کا کہنا ہے کہ ''دباؤ کے مارے' تھکے ہارے اعصابی نظام کی ناسودگی کے تناظر میں وہ جذبہ جسے ہم ہمدردی یا احساس کہتے ہیں' بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔(10) اور یہ جو احساس ہے اسے توجہ و تواضع کا جزو اکبر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ذہنی دباؤ اور تھکن ہماری مختلف راستوں کے انتخاب بلکہ ان راستوں کے تخیل کی صلاحیت کو بھی فنا کر دیتی ہے۔ ذہنی دباؤ کے ممتاز محقق بروس مکیون کہتے ہیں ''لوگوں کا کہنا ہے کہ دباؤ آپ کو احمق بنا دیتا ہے لیکن اندر کی بات یہ ہے کہ دباؤ آپ کے راستے محدود کر دیتا ہے۔''(11)

لامحالہ کچھ نہ کچھ دباؤ تو ساری زندگی ہمارے ساتھ رہتا ہی ہے۔ بعض صورتوں میں تو یہ دباؤ ہم میں نئے راستے تلاش کرنے اور نئے ہنر سیکھنے کی جستجو کا باعث بھی بنتا ہے لیکن یہ دباؤ جب شدت اور مداومت اختیار کر جائے تو ایک مسئلے کی شکل اختیار کر لیتا ہے جیسا کہ تسلطی معاشروں میں زندگی بسر کرنے والے اکثر افراد کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس صورت میں دباؤ کے ادابھاؤ مختلف ہو جاتے ہیں۔

مسلسل ذہنی تناؤ اور دباؤ کا ایک منفی پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے ہمارے اندر اس بابت

MashalBooks.com

احساس وشعور کم پڑنے لگتا ہے کہ ہمارے اپنے ساتھ اور ہمارے اردگرد کے ماحول میں کیا بیت رہا ہے۔ یہاں میں ڈیبرا کے الفاظ کا ایک بار پھر سہارا لوں گی۔ ان کا کہنا ہے کہ ''دباؤ ہمارے اعصابی نظام کو کمزور کر دیتا ہے جس سے اندیشہ آنکنے کی صلاحیت خراب سے خراب تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بتنگڑ لگنے لگتی ہیں۔ بے ضرر چیزوں سے انتہائی درجے کی تشویش ہونے لگتی ہے......اور مریض ہر طرف سے حقیقی اور متصورہ خطرات وخدشات میں گھرا پھر بقاء کی اسی پرانی حکمت عملی یعنی فرار' جنگ یا انجماد پر آ جاتا ہے۔''(12)

سو قارئین گرامی بات یہاں پہنچی کہ یہ جو ذہنی دباؤ کا بھتنا ہوتا ہے' یہ ہماری صحیح راستے کی آنک چھانٹ بلکہ دستیاب راستوں اور اختیارات کو دیکھنے کی صلاحیت کو بھی مفلوج کر دیتا ہے اور اعتناء واحساس کی ہماری فطری صلاحیت ہمارے ہاتھوں سے جاتی رہتی ہے۔

مسلسل ذہنی دباؤ کی وجہ سے احساس واعتناء کی حس پر پڑنے والے منفی اثرات سے آپ اس بھارتی گھرانے کی واردات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ اس قدر ظالم کیونکر ہوئے۔ بات یہ ہے کہ ان کی ذہنی وجذباتی حسیں غربت کے عذاب اور تسلطی تعلقات کی دیگر اذیتوں کے کارن تو پہلے ہی موقوف ہو چکی ہیں اور اگر اب وہ اپنی بچی کو بھی باندی بنا کر بیچ دیں گے تو ان کے لیے کون سی بڑی بات ہو گی اور چونکہ ان کا معاشرہ لڑکے کو لڑکی پر فائق سمجھتا ہے تو یہ اس لحاظ سے بھی اچھا ہوا کہ اب ان کا لڑکا اچھی طرح پڑھے گا۔ اسے تعلیم کے لیے پیسے کی محتاجی نہیں رہے گی۔

بھارتی بچی کی مثال تو میں نے آپ کو ظلم کی حد دکھانے کے لیے دی تھی لیکن نسل در نسل بہت سے والدین اپنے بچوں سے ناروا سلوک کرتے چلے آئے ہیں کیونکہ تسلطی معاشروں میں بچے کی دیکھ بھال کو مکمل فرمانبرداری اور کڑی سزاؤں سے یعنی جبر اور اذیت سے مشروط کیا جاتا رہا ہے۔ بچوں کی اس طرح کی پرورش میں ان کے شعور کو مفلوج کرنا ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ والدین اپنے بچوں سے پیار بھی جتا رہے ہوتے ہیں اور ان سے بدسلوکی بھی کر رہے ہوتے ہیں۔

ہم اس طرح کی پیار کی باتوں کو ریاکاری سے تعبیر کر سکتے ہیں لیکن اکثر والدین کو اپنے بچوں سے پیار ہوتا بھی ہے۔ والدین کو جو چیز اپنے بچوں سے درشت اور غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ تسلطی نظاموں کے استمرار کی میکانیت یعنی انکار ہے جس میں

ذہنی دباؤ کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ خود سے سرزد ہونے والے ظلم کا انکار کر کے تسلطی نظاموں کے تحت زندگی بسر کرنے والے والدین اکثر صورتوں میں اس ظلم کے انکار کا اعادہ کر رہے ہوتے ہیں جو تسلطی گھرانوں کے بچوں کے طور پر کبھی خود انھیں برداشت کرنا پڑا تھا۔

انکار کا مطلب سچے انسانی ادراکات و تجربات کو تحت الشعور میں دفن کرنا ہے۔ شدید تسلطی گھرانوں میں بچوں کو اکثر اس بات سے انکار سکھلایا جاتا ہے کہ ''حقداروں'' کے خلاف جبر و تشدد کوئی برا فعل ہے۔ ایسے گھرانوں میں بچوں کو اکثر یہی بتایا جاتا ہے کہ وہ سزا کے ہی لائق ہیں۔ وہ اپنے ان بزرگوں کے خلاف کہ جو انھیں اذیت پہنچاتے ہیں' غصے اور بے اطمینانی کے اظہار کی بجائے اس غصے اور بے اطمینانی کو پینا سیکھتے ہیں کیونکہ انھیں یہ خوف ہوتا ہے کہ دوسری صورت میں انھیں اور زیادہ اذیت پہنچائی جا سکتی ہے۔ چونکہ وہ اپنے ان منفی احساسات کا اظہار کھلے بندوں نہیں کر سکتے، وہ انھیں ان لوگوں پر نکالتے ہیں جن کے متعلق انھیں سکھایا جاتا ہے کہ وہ کمتر' کمزور اور بداخلاق ہیں۔(13)

خوش قسمتی سے تسلطی گھرانے میں پرورش پانے والا ہر شخص ایسا نہیں کرتا۔ بعض لوگ بڑے ہو کر اس نوع کی پرورش کو مسترد کرنے لگتے ہیں بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی بے حسی' ظلم اور ناانصافی کے خلاف مصروف عمل ہو جاتے ہیں۔

اس کا مطلب ہے کہ لوگ تبدیل ہو سکتے ہیں لیکن تبدیلی کے لیے لوگوں کو اس بات کا شعور حاصل کرنا ہوگا کہ متبادل راستے بھی موجود ہیں اور اگر ہم لوگوں کو تسلطی عقیدوں اور اداروں کے علاوہ کوئی اور وتیرے سکھلانا چاہتے ہیں تو ہمیں ان کو شراکت مائل عقیدوں اور اداروں سے آگاہی دلانا ہوگی۔

معاشیات' سیاست اور ذہنی دباؤ:

دنیا کی بہت سی ثقافتی حکایات تسلطی نظام کو واحد انسانی طریق کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ بچوں کی کہانیوں میں بادشاہوں اور ملکاؤں کے ''عام لوگوں'' پر راج بڑا رومانوی رنگ دے کر بیان کیا جاتا ہے۔ ہومر اور شیکسپیئر کی شہرہ آفاق تخلیقات میں بھی بطلانہ تشدد کو رومانوی انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ بہت سی مذہبی حکایات عورت پر مرد کے تسلط بلکہ ملکیت کو بھی جائز اور اخلاقی قرار دیتی نظر آتی ہیں۔

ان حکایات کا تعلق ان زمانوں سے ہے جن کا میلان اب کی نسبت تسلطی نظام کی طرف بہت زیادہ تھا۔ یہ حکایات اس نئی حکایت کے ساتھ مل کر کہ جو فطرت انسانی کے بارے میں ان تنگ نظر اعتقادات کی تائید کرتی ہے' اس دنیا اور اس دنیا میں ہماری زندگی اور اس زندگی کے انداز کے بارے میں ہمارے تصورات کی صورت گری میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ (14) لیکن عین اس وجہ سے کہ حکایات تشکیل اقدار میں اتنا اہم کردار ادا کرتی ہیں' نئی حکایات غیر صحت مند اقدار کو تبدیل کرنے میں ہمارے بہت کام آ سکتی ہیں۔

زیادہ اہمیت ان حکایات کی ہے جو فطرت انسانی سے متعلق ہیں۔ ہمیں ایسی جدید حکایات درکار ہیں جو ہمیں اس بارے میں ایک زیادہ مکمل اور صحیح تصویر مہیا کریں کہ ہم کون ہیں اور ہم کیا بن سکتے ہیں۔ ایسی حکایات جو یہ بتاتی ہیں کہ ہمارے آ گہی و تخلیق اور توجہ و احساس کے خصائل انسانی ارتقاء کا جزو لازم ہیں اور یہ کہ یہی وہ خصائل ہیں جو انسانوں کو انسان بناتے ہیں۔(15)

لیکن ان حکایات کو بدلنا ہی کافی نہیں۔ ثقافتی حکایات اور سماجی ڈھانچوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہمیں سیاست و اقتصاد کے اجتماعی شعبے اور خاندان اور دیگر قریبی تعلقات کے نجی شعبے کے تمام اداروں میں تسلطی ڈھانچوں کی جگہ شراکتی ڈھانچوں کو لانے کی بھی سعی کرنا ہوگی۔

جیسا کہ ہم نے پہلے ملاحظہ کیا' تسلطی ڈھانچے دانستۂ ذہنی دباؤ کی فضا پیدا کرتے ہیں اور یہ ذہنی دباؤ جبر واطاعت کے تعلقات کے نفاذ و استمرار کے لیے ایک وسیلے کا کام کرتا ہے۔ ہم پیچھے یہ مطالعہ بھی کر آئے ہیں کہ مسلسل اور شدید قسم کا ذہنی دباؤ ہماری آ گہی و احساس کی خلقی صلاحیتوں کا ناس مار کے رکھ دیتا ہے۔

جبری اور تسلطی ماحول کے حامل گھرانوں میں پرورش پانے والے بچوں کا یہ ذہن بن جاتا ہے کہ اس قسم کے تعلقات دیگر روابط میں بھی ناگزیر ہیں۔ وہ یہ ذہنیت اپنے دوستوں اور ہمجولیوں میں بھی لے جاتے ہیں اور وہاں جا کر دوسرے بچوں کو بدمعاشی دکھاتے ہیں اور اگر اس ثقافت کہ جس کا وہ حصہ ہیں کے بقیہ اجزاء مثلاً کھلونے' کھیلیں' تعلیم' مذہب اور ذرائع ابلاغ بھی اس رنگ کے روابط کی توثیق کرتے ہوں اور انھیں درست' اخلاقی اور پر تفنن انداز سے پیش کرتے ہیں تو پھر یہ چالے تمام روابط کے لیے بچے کے ذہنی و جذباتی سانچوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔(16)

اوراگراس میں مرد برتر / زن کمتر کے اس تصور کو بھی شامل کرلیں جو تسلطی گھرانوں کے بچوں کے ذہن میں بڑے باقاعدہ طریقے سے ڈالا جاتا ہے تو پھر یہ عقیدہ کہ تسلطی درجہ بندیاں ایک عادی چیز ہیں اور بھی راسخ ہو جاتا ہے۔ ایسے گھرانوں میں بچے فرق و امتیاز کو برتری و کمتری، تسلط و طاعت اور خدمت و مخدومیت کے ترازو سے تولنا سیکھ جاتے ہیں اور اگر آگے جا کر انھیں کوئی اور ماحول میسر نہ آئے تو پھر وہ معاشی و معاشرتی ناہمواری کو معمول سمجھ کر قبول کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ماہر نفسیات ایلس فرینکل برنسوک کی جابرانہ شخصیت پر تحقیق سے برآمد ہونے والے شواہد کے مطابق جن گھرانوں میں خوف وسزا کا دور دورہ ہوتا ہے اور ''جہاں تعلقات کی بنیاد صریحاً تسلط و طاعت کے لحاظ سے بٹے مناصب وفرائض پر ہوتی ہے...... تجربے کے بعض پہلوؤں کی آگہی کو دبانا پڑتا ہے۔'' ان دائمی دباؤ سے اٹے گھرانوں میں ضبط آگہی کا یہ عمل ''چپقلش وتشویش میں تخفیف اور روایتی وتیروں کے استمرار کے کام آتا ہے۔''(17)

ایلس کی اس تحقیق سے جو کہ نازی جرمنی کے وقوعات و حوادث کو گہرائی میں جا کر سمجھنے کی سعی کا ایک حصہ تھی، یہ بھی پتہ چلا کہ تسلطی گھرانوں میں پرورش پانے والے بچوں میں خصومت وخطر پر زور دینے کا رجحان زیادہ پایا جاتا ہے کیونکہ یہ رویہ ان کے اپنے روزانہ کے تجربات سے زیادہ ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اس سے دنیا کے بارے میں ایک مخاصمانہ تصور کی راہ ہموار ہوتی ہے جو واقعات کے بارے میں ذہنی بے لچک پن اور کور چشمی کو فروغ دے کر غیر مفاہمتی شخص وسیاسی رویے پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔

اس محرکیات سے آپ تسلطی سوچ اور جذباتی عادات میں گرفتار قائدین کی پالیسیوں کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ تسلطی گھرانوں میں ڈنڈے کا اصول چلتا ہے۔ طاقتور کو ہمیشہ حق پر اور کمزور کو غلط سمجھا جاتا ہے۔ ایسے گھروں میں پروان چڑھنے والے قائدین کو اگر کوئی زیادہ منصفانہ طریق دیکھنے سمجھنے کا موقع نہ ملے تو وہ انھی تسلطی وتیروں کو آگے منتقل کرتے چلے جاتے ہیں جن کا مشاہدہ اور تجربہ انھیں اپنے گھر کی چار دیواری میں ہوا ہوتا ہے اور چونکہ ایسے گھرانوں میں نگہداشت کے نسوانی کام کو مردوں کے فرائض سے حقیر سمجھا جاتا ہے، وہ بھی توجہ و نگہداشت کی تنقیص قدر کا شیوہ سیکھ جاتے ہیں۔

تسلط و طاعت پر مبنی خاندانی روابط بھی تشدد کے بارے میں اہم باتیں سکھلاتے ہیں۔

جب بچوں کو جبر و تشدد کا تجربہ ہوتا ہے یا وہ اپنی ماؤں پر تشدد ہوتا دیکھتے ہیں تو ان کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ دوسروں پر اپنی مرضی ٹھونسنے کے لیے طاقت کا استعمال جائز ہے۔ یہ رویہ ازاں بعد دیگر تعلقات کی طرف بھی منتقل ہوتا چلا جاتا ہے جن میں بین الاقوامی تعلقات بھی شامل ہیں۔ اس رویے کے حامل افراد کے ذہن میں یہ سوچ پروان چڑھتی ہے کہ قومی سلامتی کے لیے تشدد ضروری ہے لہٰذا وہ تشدد کو فروغ دینے والی معاشی و معاشرتی عوامل میں بدلاؤ پیدا کرنے والی پالیسیوں کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔

قصہ مختصر جب لوگ ایسے ماحول میں نشوونما پاتے ہیں کہ جہاں شراکتی روابط کا فقدان ہوتا ہے تو ان کے دل میں یہ بات گھر کر جاتی ہے کہ واحد راستہ تسلط کا ہے یا پھر چپ چاپ ہاتھ باندھ کر تسلط جمانے والوں کے پیچھے چلتے جانے کا۔ ان کا یہ یقین بھی بن جاتا ہے کہ انسان فطری طور پر بے حس اور ظالم ہے اور یہ کہ خواتین سے منسوب اور ''زنانہ'' ہر شے...... مثلاً توجہ ونگہداشت...... مردوں سے منسوب اور ''مردانہ'' ہر شے کے مقابلے میں حقیر اور کمتر ہے۔

یہ وہ سب عوامل ہیں جو ان سیاسی و اقتصادی فیصلوں کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں جو بھوک، افلاس، بہتات آبادی اور ماحولیاتی تباہی جیسے عالمی مسائل کو خاطر میں نہیں لاتے بلکہ ان میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ ان پالیسیوں کے پیچھے کارفرما عوامل بھی یہی ہوتے ہیں جن کی وجہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ ہم سب کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

میں اس بات پر ایک مرتبہ پھر زور دینا چاہوں گی کہ تسلطی گھرانوں میں پرورش پانے والا ہر فرد تسلط و طاعت کے تعلقات کو تسلیم نہیں کرتا اور اسے آگے منتقل نہیں کرتا۔ بعض موتی ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود یہ سب برداشت کرنے کے باوجود بھی تسلطی روایات کو نہیں اپناتے، جو خود ان کا نشانہ بننے کے باوجود اپنی باری آنے پر انھیں مسترد کرتے ہیں بلکہ انھیں تبدیل کرنے کے لیے جدوجہد بھی کرتے ہیں۔

میں یہ بات بھی زور دے کر دوبارہ کہنا چاہوں گی کہ تسلطی گھرانوں میں ابتدائی عمر کے ذہنی دباؤ کے تجربات ہی لوگوں کے غیر منصفانہ روابط کو قبول کرنے کی واحد وجہ نہیں ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا سادہ نہیں۔ تھوڑا پیچیدہ ہے۔ تسلطی گھرانے، ذرائع ابلاغ، مذہب اور دیگر ادارے بچے کی تسلطی پرورش اور دوسرے ابتدائی تجربات سے متعامل ہو کر باہم ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور تسلطی معاشی پالیسیاں اور وتیرے اس سلسلے میں ایک بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے باب ششم میں دیکھا' اثری و بشریاتی حقائق ظاہر کرتے ہیں کہ شدید تسلطی ثقافتیں صحراؤں' ریگستانوں اور چراگاہوں جیسی درشت اور سنگلاخ سرزمینوں میں وجود میں آئیں جہاں وسائل کی بہت قلت تھی۔(18) لیکن تسلطی معاشی نظام دائمی قلتیں اور ان کے وسیلے سے دائمی دباؤ پیدا کر کے زرخیز وادیوں اور ساحلی خطوں جیسے متواضع مناطق میں بھی جڑ پکڑ سکتے ہیں۔

تسلطی نظام معاشرہ کے سرکردہ افراد کو وسائل کی غلط ترسیل سے مصنوعی قلتیں پیدا کرتے ہیں۔ وہ ماحولیاتی استحصال، مسلسل جنگوں اور تشدد کے دیگر وسیلوں کے توسط مادی وا نسانی وسائل کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ تسلطی پالیسیاں بھی بچوں کی جسمانی' ذہنی اور جذباتی نشوونما پر سماجی سرمایہ کاری میں تخفیف سے قلت پیدا کرتی ہیں۔ اس سے بڑھیا افرادی سرمائے کی ترسیل رک جاتی ہے جس سے انسداد قلت کے لیے ضروری معاشی ترقی کی رفتار دھیمی پڑ جاتی ہے۔ خصوصاً آج کل جبکہ جنگی اسلحے کی قیمتیں بہت چڑھ چکی ہیں' تسلطی معاشیات حربی سازوسامان پر اندھا دھند پیسہ خرچ کر کے مصنوعی قلتیں پیدا کرتی ہے جبکہ اس پیسے کو بنیادی تعلیم' صحت عامہ اور افرادی سرمائے پر خرچ کر کے عام خوشحالی کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

عصبی سائنس کے معاشی مضمرات:

> ہم اپنی زندگی میں جن راہوں کا انتخاب کرتے ہیں ان کا براہِ راست اثر ہماری عصبی کیمیائی ترکیب پر پڑتا ہے۔ جدید تحقیقات سے افشا ہو رہا ہے کہ مراقبے' غذائی ردوبدل اور ورزش جیسے عوامل بھی ہمارے دماغ کی عصبی کیمیا پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہم جس قسم کے تعلقات تجربہ کرتے ہیں ان میں تبدیلی سے بھی زیادہ بڑا فرق پیدا ہو سکتا ہے۔ اس طرح عقیدوں اور سماجی ڈھانچوں پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ یہ سب چیزیں ہمارے دماغ کی عصبی کیمیا اور ہم کیسے سوچتے' محسوس کرتے اور عمل کرتے ہیں' اس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔
>
> بڑی عمر کے افراد کے رویوں اور شعور میں بھی تبدیلیاں واقع ہو سکتی ہیں۔ تاہم ابتدائی عمر کے تجربات ہماری عصبی و کیمیائی نشوونما میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ بروس پیری اور دیگر عصبی ماہرین کے مطابق بچپن کے تجربات ہمارے دماغ اور خصائل اور رویوں کے لیے ایک تنظیمی سانچہ مہیا کرتے ہیں۔(19)

پیری اور دوسرے سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ زیادتی اور غفلت کے شکار بچوں میں ڈپریشن میں مبتلا ہو کر معاشرے سے کٹ جانے کے میلانات ان خوش نصیب بچوں کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں جن کو پرشفقت اور باعزت ماحول میسر آیا ہوتا ہے۔ ان میں ناروا تعلقات کو سہنے اور برداشت کرنے کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔ نیز اس بات کا امکان بھی زیادہ ہوتا ہے کہ وہ بھی آگے جا کر دوسروں پر زیادتیاں کریں گے۔ یہ چالے بہت زیادہ زیادتی یا غفلت کے شکار بچوں میں زیادہ شدید صورت میں مشاہدے میں آتے ہیں۔ تاہم ہم سب کے سب ابتدائی عمر کے تجربات سے کسی نہ کسی طور اثر قبول کرتے ہیں۔

عصبی تحقیقات سے سامنے آنے والے یہ شواہد ایسی پالیسیوں کے متقاضی ہیں جن سے بچوں کی اچھی نگہداشت کو یقینی بنایا جا سکے۔ اگر زیادہ لوگ اور تنظیمیں اس کا مطالبہ کریں تو حکومتوں کو مدارس میں نگہداشتی تعلیم و تربیت کی حوصلہ افزائی کرنے' صحت عامہ اور نگہداشت اطفال کے لیے زیادہ سے زیادہ رقوم مختص کرنے اور اچھی نگہداشت کی پذیرائی کرنے والی معاشی ایجادات کو ترقی دینے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

اگر آپ معاشرے میں ہونے والے جرائم' نفسیاتی بیماریوں' منشیات کے استعمال' انسانی صلاحیتوں کے ضیاع اور ناقص افرادی سرمائے کے معاشی مضمرات کا حساب لگائیں تو اس بے اندازہ مالی نقصان کی تصویر ازخود آپ کے سامنے آ جائے گی جو معاشرے کو معیاری نگہداشت اطفال پر پیسہ نہ لگانے کے کارن بھگتنا پڑتا ہے۔ اگر معاشرہ نگہداشت پر سرمایہ خرچ کرتا ہے تو اس کے ثمرات تھوڑی مدت میں ہی ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

قلت کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ذہنی دباؤ اس طرح کے جذباتی (اور عصبی) ردعمل پیدا کرتا ہے جیسے کہ بچے کی تسلطی پرورش کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے معاشی وسائل پر مسلط افراد سے خوف اور ان پر انحصار کے احساسات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ان بچوں کی مانند جو کہ جابر والدین پر انحصار کرنے لگتے ہیں تسلطی معاشی مخروط کے زیریں طبقات میں بسنے والے افراد بھی بالادست افراد پر انحصار کرنے لگتے ہیں۔ وہ حقیقی صورت کے شعور کو دبا کر ان افراد کو ماننا شروع کر دیتے ہیں جو ان کا استحصال کرتے ہیں اور ان پر ظلم ڈھا رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم اکثر مشاہدہ کرتے ہیں کہ غریب لوگ اپنا غم و غصہ اقلیتی گروہوں یا ان دیگر لوگوں پر نکالنا شروع کر دیتے ہیں جنھیں ان کے سیاسی و مذہبی قائدین دشمن قرار دیتے ہیں۔ تاہم تسلطی مخروط کے دامن میں رہنے والوں پر دباؤ کے پڑنے والے منفی اثرات کی وجہ محض

غربت ہی نہیں ہوتی۔ اس کا اندازہ ہمیں وائٹ ہال تحقیق سے بخوبی ہو جاتا ہے جو 1970ء میں سر مائیکل مارموٹ اور ان کے ساتھیوں نے انجام دی۔ وہائٹ ہال دراصل اس علاقے کا نام ہے جہاں برطانوی سول سروس کے اکثر ارکان رہائش پذیر ہیں۔ اس تحقیق کے دوران سول سروس کی نچلی صفوں سے تعلق رکھنے والے ملازمین میں دباؤ سے پیدا ہونے والی امراض کی شرح غیر معمولی حد تک زیادہ پائی گئی۔(20) ان افراد کو ہم غریب نہیں کہہ سکتے۔ دراصل وہ ذہنی دباؤ جس کی وجہ سے یہ افسران اختلاج قلب، ذیابیطس، ڈپریشن، کثرت شراب نوشی، ضیق النفس اور سرطان جیسے عوارض کا شکار ہوئے، تسلطی افسر شاہی نظام کی دین تھا۔

بہت سی دوسری افسر شاہیوں کی طرح خواہ وہ سرکاری ہوں یا نجی شعبے میں، برطانوی سول سروس کا ڈھانچہ بھی احکامات کے اوپر سے نیچے کی جانب بہاؤ پر مبنی ہے۔ نچلے افسروں کے پاس کوئی اختیارات نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کی سنی جاتی ہے۔ اس وجہ سے دفاتر میں اکثر سننے میں آتا ہے کہ "میری خواہش تھی کہ میں کچھ کر سکتا لیکن اصول اصول ہیں۔" اس طرح کی صورتحال میں اصولوں کی خلاف ورزی کا سیدھا نتیجہ برطرفی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس طرح کے نظام میں جو لوگ جس قدر نیچے ہوتے ہیں ان کے پاس اختیارات اس قدر کم ہوتے ہیں اور انھیں اسی قدر اپنے تخلیق و توجہ و شعور کے احساسات کو دبانا پڑتا ہے، بصورت دیگر ان کے لیے اتنے کٹھور قوانین کو نافذ کرنا بہت تکلیف دہ ہو جائے۔

تحقیقات یہ بھی بتاتی ہیں کہ زیادہ صحت مند لوگ امیر ملکوں میں نہیں بلکہ ان ممالک میں پائے جاتے ہیں جہاں مساوات زیادہ ہے۔ برطانوی ماہر وبائیات رچرڈ ولکنسن اور دیگر محققین کا کہنا ہے کہ آمدنیوں کے تفاوت میں کمی امیروں اور غریبوں دونوں میں بہتر صحت کی ضامن ہوتی ہے۔(21) اس کا ایک کارن یہ ہے کہ کسی گروہ میں افراد کی آمدنیوں میں جتنا بڑا فرق ہوگا، نفسی وسماجی دباؤ بھی اسی قدر زیادہ شدید ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ غریب لوگوں پر مالدار لوگوں کی نسبت دباؤ زیادہ ہوتا ہے لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ ان معاشروں میں کہ جن میں دولت کا ارتکاز اوپری طبقے کے افراد میں بہت زیادہ ہو جاتا ہے، وہاں نسبتاً امیر لوگ بھی ذہنی دباؤ سے بچے نہیں رہتے۔ ولکنسن کے مطابق یہ دباؤ اپنے حالات کو اپنے سے زیادہ مادی اشیاء کے حامل افراد کے حالات سے موازنے کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ سٹینفورڈ یونیورسٹی کے ماہر عصبی حیاتیات رابرٹ سپولسکی ناہمواریوں کے نتیجے میں بننے والے ذہنی دباؤ کا تجزیہ کرتے ہوئے

لکھتے ہیں ''ہماری اس عالمی گوٹھ میں بار باران مشہور اور بڑے لوگوں کی شبیہیں ہمارے سامنے لائی جاتی ہیں جن کے سامنے ہم خود کو بونے نظر آنے لگتے ہیں اور جن کے وسائل کے سامنے ہمارے وسائل پدی ہو جاتے ہیں۔'' (22)

لہٰذا خلاصہ کلام یہ ہے کہ تسلطی نظاموں میں مضمر سماجی ناہمواریاں نہ صرف یہ کہ معاشی منارے کی نچلی منزلوں میں بسنے والوں کو ذہنی دباؤ کا نشانہ بناتی ہیں، اوپری منزلوں میں بسنے والے بھی ان سے محفوظ نہیں رہ پاتے۔ جب مال واسباب جمع کرنے کا ایک مرحلہ طے ہو جاتا ہے تو ان مادی اشیاء کا لطف پھیکا پڑنے لگتا ہے کیونکہ یہ اشیاء انسان کو سچی خوشی نہیں دے سکتیں اور اس حقیقی اطمینان کا نعم البدل ثابت نہیں ہو سکتیں جو اپنے افراد خانہ اور دیگر احباب کی صحبت ومونسیت سے حاصل ہوتا ہے۔ (23)

تسلطی نظاموں کے متعدد دیگر پہلو بھی ذہنی دباؤ اور طبی مسائل کا باعث بنتے ہیں۔ صنعتی حرفتوں کا بلا احساس استعمال ماحولیات سے متعلقہ امراض واموات کا سبب بنتا ہے اور اگرچہ معاشی منارے کی نچلی منزلوں کے باسیوں پر ان کے اثرات زیادہ شدید ہوتے ہیں (مثلاً زہریلے صنعتی فضلات کو عموماً غریب علاقوں میں ہی ٹھکانے لگایا جاتا ہے) فضا وخوراک میں آلودگی کا باعث بننے والی صنعتی حرفتوں کے مضر اثرات ہم سب تک پہنچتے ہیں۔ تشدد خواہ یہ کنبوں پر ہو یا قوموں کے خاندان میں، یہ بھی ذہنی دباؤ پیدا کرتا ہے۔ خوف بھی دباؤ کا باعث ہے اور خوف اور تشدد دونوں تسلطی نظام کے خمیر کا حصہ ہیں کیونکہ کلس سے زمین تک بے لچک تسلطی درجہ بندیوں کے مناروں کو مآل کار خوف و دہشت کی بنیادوں پر ہی استوار کیا جاتا ہے۔

لہٰذا لب لباب اس ساری بات کا یہ نکلتا ہے کہ تسلط و طاعت پر مبنی عائلی تعلقات کی وساطت ابتدائے طفولیت میں شروع ہونے والا ذہنی دباؤ افراد کو حاصل اختیارات اور ان کے ان اختیارات کے شعور دونوں میں انقباض پیدا کرتا ہے۔ جب بچوں کے ذہن میں تسلط و طاعت کے کیش کو جائز بنا کر ڈالا جاتا ہے...... اور سماج کوئی دوسرا طریق بھی پیش نہیں کرتا...... تو اکثر صورتوں میں بچے اپنی احساس وآگہی کی صلاحیت کو مارنا سیکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب وہ بڑے ہوتے ہیں تو وہ خاندانی، تعلیمی، مذہبی، معاشی اور سیاسی اداروں کو انھی خطوط پر استوار کرتے ہیں اور اس طرح یہ چکر پود در پود خود کو دہراتا چلا جاتا ہے۔

تعجب کی بات یہ نہیں کہ ہماری دنیا میں اس قدر بے حسی اور بونگا پن کیوں ہے بلکہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس میں احساس و جودت اس قدر زیادہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حکایت اب بھی جوں کی توں چلی آتی ہے کہ سرشت انسانی خالصتاً خودغرض پر مبنی ہے یا جیسا کہ بعض عمرانی حیاتیات کے ماہرین کہتے ہیں ہم لاشعوری طور پر اپنے اندر کی ''بے رحم اور خودغرض جینوں'' کے تتبع میں سفر کرتے چلے جا رہے ہیں اور یہ ان سب شواہد کے باوجود ایسے ہے کہ ہم انسانوں میں اس سے کہیں زیادہ جذبوں کی استعداد موجود ہے اور یہ کہ انصاف' تعاون باہمی اور احساس کی آرزو ہماری جینیاتی بافتوں کا ایک جزو لاینفک ہے۔

پہلی بوندیں:

قرون وسطیٰ سے لے کر موجودہ زمانے تک مغربی ثقافت کی ہر بڑی پیش رفت کے پیچھے انصاف' پیار اور توجہ کی انسانی آرزوئیں کارفرما رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قرون وسطیٰ کا زمانہ چونکہ زیادہ مذہبی تھا اس لیے یہ زیادہ بہتر تھا اور اس میں توجہ و احساس کا عنصر زیادہ تھا لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ یہ اقلیتوں پر جبر' عورتوں پر ظلم اور مذہبی و فرقہ وارانہ جنگوں سے پُر سب سے زیادہ وحشیانہ دَور تھا۔ (24) فی الواقع یہ آج کے ان آمر اور بنیاد پرست معاشروں سے کوئی زیادہ مختلف نہیں تھا جہاں لوگوں کے ہاتھ سرعام قطع کیے جاتے ہیں، عورتوں کو سنگسار کیا جاتا ہے اور معصوم اور نہتے شہریوں پر گولہ بارود کی بارش کو اب بھی روا سمجھا جاتا ہے۔

یہ نام نہاد یورپی عہد ایمان' مسلسل جنگ وجدال اور خوفناک اذیت رسانیوں کا دور تھا جس میں نہ صرف یہ کہ لوگوں کو ہراساں کر کے انھیں اطاعت وتقلید پر مجبور کیا جاتا تھا بلکہ یہ ان کی ظلم واذیت کو محسوس کرنے کی حس کو بھی کند کر دیتا تھا۔ اگرچہ والدین اپنے بچوں سے پیار کرتے تھے۔ بچوں سے شدید قسم کی زیادتی اور غفلت عام تھی۔ زیادہ تر گھرانوں کی عورتیں صبح سے شام تلک گھریلو کام کاج اور کھیتی باڑی میں جتی رہتی تھیں اور ان کے پاس اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بہت کم وقت بچتا تھا۔ جیسا کہ یہ ریت بعد میں بھی چلتی رہی' بچوں کو بہت ابتدائی عمر میں ہی کام سیکھنے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا اور چھوٹی عمر کے بچوں سے جان لیوا مشقت اور مزدوری کرانا عام بات تھی۔ (25) امیر گھرانوں میں بچے دایوں کے سپرد کر دیے جاتے تھے۔ بہت سی عورتیں اپنے بچوں کو اس امید پر راہگزاروں میں چھوڑ کر چلی جاتی تھیں

کہ کوئی انھیں گود لے لے گا یا انھیں یتیم خانے پہنچا دے گا۔ گو ان یتیم خانوں میں بھی شرح اموات بہت زیادہ تھی۔(26)

مردانہ بالادستی، تشدد اور تسلط بھی زوروں پر تھا۔ اگر کسی عورت کے ہاتھوں اس کا خاوند مارا جاتا تو اسے اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔(27) مردوں کو اپنی عورتوں اور بچوں کو زدوکوب کرنے کا قانونی استحقاق حاصل تھا اور جابر حکمران اپنے لوگوں سے غلاموں کا سا سلوک کرتے تھے۔

لیکن انسانی معاشرہ جیسے جیسے زرعی حرفتوں سے صنعتی حرفتوں کی طرف سفر کرتا گیا، زیست و محنت کے مروجہ قرینوں میں بھی بدلاؤ آتا چلا گیا اور معاشرے کے خمیر میں نفوذ کر جانے والی تسلطی روایات کو للکارنے والی کئی سماجی تحاریک یکے بعد دیگرے منظر عام پر آتی چلی گئیں۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے دوران چلنے والی ''حقوق آدم'' کی تحریک نے بادشاہوں کے ''اوپر سے ودیعت شدہ'' حق حکومت کی قلعی کھولی۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ''حقوق نسواں'' کی تحریک نے تسلط کی ایک اور ریت یعنی مردوں کے اپنے گھروں کے ''قلعوں'' میں عورتوں اور بچوں پر ''اوپر سے تفویض کردہ'' حاکمیت جمانے کے حق کو بھی چیلنج کر دیا۔ انیسویں صدی میں غلامی کے خاتمے اور معاشی انصاف کے لیے چلائی گئی تحریکوں نے تسلط کی چند اور ریتوں مثلاً ''اعلیٰ'' نسلوں کے ہاتھوں ''ادنیٰ'' نسلوں کی غلامی کی روایت اور محنت کش طبقے کے افراد کے معاشی استحصال کی روایت کو بھی کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔ ذہنی امراض میں مبتلا افراد سے روا غیر انسانی سلوک کے خلاف ابھرنے والی تحریک نے ان افراد کی ''سماج دشمن جبلتوں'' کو ٹھیک کرنے کے لیے انھیں مارنے پیٹنے کرنے اور زنجیروں سے باندھے رکھنے کی رسم کے خلاف آواز اٹھائی۔ تعلیمی اصلاح کے لیے کام کرنے والی تحریکوں نے مدارس میں بچوں پر قابو رکھنے کے لیے جسمانی سزاؤں پر پابندی کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ بیسویں صدی میں آ کر شہری حقوق، استعماریت کے خاتمے، عدم تشدد اور ہم جنس پرستوں کے حقوق کے لیے چلائی گئی تحاریک نے تسلطی روایات کو مزید ننگا کر کے رکھ دیا۔ عالمی امن کی تحریک نے ایک قوم کے دوسری قوم پر طاقت کے زور پر تسلط جمانے کی ریت کے خلاف علم بلند کیا اور تحریک بقائے ماحول نے کسی دور میں مقدس خیال کیے جانے والے تسخیر فطرت کے تصور کے خلاف جدوجہد بپا کر دی۔

تسلطی روایتوں کے خلاف اس منظم پیکار سے بہت سے فوائد دیکھنے کو ملے۔ اگر اٹھارہویں صدی میں لوگ بادشاہ کی حکمرانی کے ''آسمانی'' حق کے خلاف آواز بلند نہ کرتے تو شاید ہم ابھی تک جابر بادشاہوں کی حاکمیت میں زندگی بسر کر رہے ہوتے۔ یہ غلامی کے خاتمے کے لیے چلائی گئی مہم کی دین ہے وگرنہ غلامی کے ادارے کو اب بھی قانونی تحفظ حاصل ہوتا۔ اگر انیسویں اور بیسیوں صدی میں حقوق نسواں کے لیے تحریکیں نہ چلتیں تو خواتین اب بھی مردوں کے استبداد تلے پس رہی ہوتیں' اپنی املاک کے انتظام کے حق سے قانوناً محروم رہتیں' مرد سے اپنے بچے نہ لے پاتیں' انھیں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخلے سے محروم رکھا جاتا' وہ اکیلی تجارت نہ کر پاتیں اور نہ ہی انھیں رائے دہی کا حق حاصل ہوتا۔ اگر مزدوروں اور محنت کشوں کے دن بہتر بنانے کے لیے کام نہ کیا جاتا تو غلیظ اور غیر محفوظ کارخانے' بارہ گھنٹے یومیہ مزدوری' چائلڈ لیبر اور شروع کی ڈاکوٹھا کر سرمایہ داریت کے ایام کے دیگر چلن آج بھی زندہ ہوتے۔ شہری حقوق کے لیے چلائی گئی تحاریک کے بغیر ہم اب بھی الگ الگ نل' بسیں' مطاعم' ہوٹل اور ہسپتال استعمال کر رہے ہوتے اور اگر قریبی تعلق داریوں میں تشدد و تسلط کے عنصر کے خاتمے کے لیے یہ جدید تحریک نہ چلتی تو عصمت دری' زن کوبی اور بچوں سے زیادتی جیسے جرائم اب بھی قانون کی گرفت سے مبرا ہوتے۔

ان تحریکوں میں شامل ہر شخص کا راستہ روکا گیا' شدت سے مزاحمت کی گئی اور ان مزاحمتوں سے سفر میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ گھڑی کی سوئیاں واپس بھی پلٹیں اور گاہے بگاہے یوں بھی ہوا کہ حاصل کردہ اہداف پھر دور ہونے لگے۔

اگر ہم گزشتہ تین سو برس کا شراکتی اور تسلطی نظام کے درمیان چپلقش کے تناظر میں جائزہ لیں تو جدید انسانی تاریخ کی ایک اور ہی کتھا ہمارے سامنے نمودار ہونے لگتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان بظاہر اٹکل اور بے ربط واقعات و حوادث میں بھی ایک طرح کی مسافت اور تسلسل موجود ہے اور یہ مسافت ہے منزل شراکت کی جانب متواتر ہلوں اور تسلط کے اندھیروں کی طرف وقفہ بہ وقفہ پسپائی کی۔

ہٹلر کا جرمنی' سٹالن کا سوویت یونین اور خمینی کا ایران جدید زمانوں میں ایک ''خالص'' تسلطی نظام کی طرف مراجعت کی ڈرامائی مثالیں ہیں اور حتیٰ کہ امریکہ میں بھی وقفہ بہ وقفہ ایک زیادہ شدید تسلطی نظام کی طرف مراجعت مشاہدے میں آتی رہتی ہے۔

اس نوع کی تازہ ترین مراجعت کا آغاز 1970ء کے عشرے میں ہوا اور یہ اب بھی جاری ہے۔ ہمارے اس ''گہوارہ جمہوریت'' میں جسے ہم امریکہ کہتے ہیں، سیاست دان جمہوریت، مساوات اور آزادی جیسے امریکی آدرشوں کے نعرے بہت لگاتے ہیں مگر ان کے یہ دلفریب نعرے محض ایک فریب سے زیادہ نہیں ہوتے اور در پردہ وہ پہلے سے حاصل شدہ شراکتی اہداف کو بھی دور دھکیل رہے ہوتے ہیں۔

آج کل بہت سے سیاست دان آزاد منڈی، آزاد تجارت اور ماحولیاتی ضوابط سے آزادی کی بات کرتے ہیں لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ اس آزادی سے ان کا اصل مطلب کیا ہے؟ درحقیقت وہ ہمارے اور ہمارے تحفظ کے لیے قائم کیے گئے وفاقی اداروں کو ضابطگی اختیارات سے محروم کر کے ارباب دول کو من مانیوں کی آزادی دلانا چاہتے ہیں تاکہ وہ ہمارے اور ہمارے اس گہوارہ فطرت کے ساتھ جو دل میں آئے کریں اور سرکار ان کا ہاتھ نہ روک سکے۔ (28) انھیں ان حلقوں پر سخت سرکاری جکڑبندی میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی جنھیں وہ ''اپنے مقام'' پر رکھنا چاہتے ہیں۔ جب خواتین کے انتخاب تولید کے حق سے انکار یا کسی معاشی ناانصافی کے خلاف مظاہروں کو کچلنے کی بات آتی ہے تو ان کے کم سے کم حکومتی کردار اور سرکاری مداخلت سے زیادہ سے زیادہ آزادی کے نعروں کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔

اسی طرح بعض سیاستدان معاشی پالیسیوں کے ضمن میں بھی جمہوریت و مساوات کا پرچار کرتے ہیں لیکن حقیقت میں ہوتا یہ ہے کہ یہ پالیسیاں ہمیں اور بھی زیادہ معاشی ناہمواریوں کی طرف دھکیل دیتی ہیں(29) اور سیاسی معاشیات کے ماہر جیف گیٹس کے مطابق ایک حقیقی جمہوریت کے لیے سنگین خطرے کا باعث بنتی ہیں۔(30)

امریکی حکومت کے مرتب کردہ اعداد و شمار کے مطابق اگر مہنگائی کو تناظر میں رکھا جائے تو گزشتہ چند عشروں کے دوران امریکہ کے متوسط وزیریں طبقات کے افراد کی آمدنیوں میں ٹھہراؤ پیدا ہوا ہے اور یا پھر وہ تنزلی کا شکار ہوئی ہیں جبکہ اس عرصے میں بالائی طبقے کے افراد کی آمدنیوں میں بے حساب اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ امریکہ کے داخلی محکمہ مالگزاری کے مطابق 1979ء میں مبینہ آمدن میں امیر ترین ایک فیصد افراد کا حصہ 9.6 فیصد تھا جو 2003ء تک بڑھ کر 17.5 فیصد تک پہنچ گیا۔ مگر اس دورانیے میں نیچے کے 40 فیصد عوام کا حصہ 11.3 فیصد سے گر کر 8.8 فیصد تک آ چکا تھا۔

MashalBooks.com

1965ء اور 2004ء کے درمیانی عرصے میں امریکی کاروباری اداروں کے سربراہوں کی تنخواہوں میں اس قدر اضافہ ہوا کہ جو پہلے کبھی بھی سننے میں نہیں آیا تھا۔ 2004ء میں انھوں نے مشاہرے' بونس اور حصص جیسے اضافی فوائد کو ملا کے 10.2 ملین ڈالر اوسط تنخواہ وصول کی۔ اس برس ایک کل وقتی کارکن کی کل اوسط تنخواہ 32.594 ڈالر بنی۔ یہ کارکن کو 1973ء کے عشرے میں ملنے والی اوسط تنخواہ 36.629 ڈالر (جو مہنگائی کے سبب تبدیل ہوئی) سے 11 فیصد کم ہے۔(32) امریکہ کے بالائی اور زیریں طبقات کے افراد کے درمیان کی خلیج کے عرض میں یہ اضافہ ہی واحد تشویشناک بات نہیں ہے۔ اسے زندگی کے تمام شعبوں میں بالاتر زیریں بے لچک درجہ بندیوں کی طرف ایک بڑی مراجعت کے ایک جزو کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔

اس مراجعت کا ایک خطرناک پہلو پوری دنیامیں نام نہاد مذہبی بنیاد پرستی کا اضافہ ہے۔ سچی پوچھیں تو اسے تسلطی بنیاد پرستی کہا جانا چاہیے کیونکہ اس کا مطمع نظر تسلطی نظام کی بنیادوں کو نئے سرے سے استوار کرنا ہے: خاندان اور ریاست دونوں میں بے لچک بالاتازیریں کنٹرول' شدید مردانہ تسلط' تشدد کا کنٹرول قائم کرنے کے ایک ذریعے کے طور پر استعمال اور ان کے ساتھ ساتھ یہ عقیدے کہ یہ سب نہ صرف معمولی ہے بلکہ اخلاقی تقاضوں کے بھی عین مطابق ہے۔

امریکہ میں مسیحی انتہاپسندوں کی ساری توجہ دو اہداف پر لگی ہے: اول ملک میں مذہبی حکومت کا قیام اور دوم گھر کی چاردیواری کے اندپدرسری نظام کا دوبارہ نفاذ۔ انوں نے اپنی کارروائیوں کا آغاز 1970ء کے عشرے میں مساوی حقوق کی ترمیم کے خلاف شروع کی گئی کوششوں سے کیا۔ اس ترمیم سے جنسی تفاوت پر مبنی حکومتی امتیاز پر روک لگائی جا سکتی تھی۔ ازاں بعد وہ مسیحیت کی آڑ لے کر ایسی پالیسیوں کو فروغ دینے کی کوشش کرتے رہے جن کا حضرت مسیحؑ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی تعلیمات سے کوئی دور پار کا بھی واسطہ نہیں۔ حضرت مسیحؑ تو لوگوں کو توجہ واحساس اور امن ومحبت کی تعلیم دیتے رہے جو سب شراکت کی بنیادیں ہیں اور ان عیسائی انتہاپسندوں کو دیکھیں جو تسلطی روایتوں کی تبلیغ کرتے نہیں تھکتے۔

وہ لوگوں کو ''تمھیں خدا کے خوف کو لوگوں کے اندر ڈالنا ہے'' کے کلمات بار بار سنا کر خوف ''تم گناہ میں لتھڑے ہو' سنا کر احساس گناہ ''مقدس جنگوں'' کی حوصلہ افزائی کر کے

نفرت اور مختلف نسلوں، مذہبوں اور جنسی عقیدوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو برا بھلا کہہ کر تعصب کا پرچار کرتے ہیں۔سب سے بڑھ کر یہ بنیاد پرست قائدین

ماضی کے اچھے زمانے:

ہم ان گزرے اچھے دنوں کے بارے میں بہت کچھ سنتے ہیں کہ جب خاندان ''اکٹھے'' تھے اور لوگ ایک دوسرے کا زیادہ خیال رکھتے تھے لیکن یہ مفروضہ کہ ماضی میں احساس و توجہ زیادہ تھی، حقیقت سے میل نہیں کھاتا۔ نہ صرف بے توجہی بلکہ اگلے زمانوں میں تو بچوں پر تشدد اور زیادتی بھی ایک عام بات تھی۔ زیادہ دور کی بات نہیں اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں لکھی جانے والی سرگزشتیں بھی ہمیں گھروں اور مدارس میں شدید جسمانی تشدد کے قصے بتاتے دکھائی دیتی ہیں۔ان میں سے کئی اداروں میں تو بچوں اور بچیوں کے استادوں اور والدین کے ہاتھوں تشدد سے مارے جانے کے بارے میں بھی لکھا ملتا ہے۔(33)

بجا کہ توجہ اور احساس والے لوگ ہمیشہ اس دنیا میں موجود رہے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زرعی معیشت میں خواتین کو دن چڑھے سے شام تک کام میں جتا رہنا پڑتا تھا اور ان کے پاس اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے کم وقت ہی بچتا تھا۔ علاوہ بریں ان کے پاس غذا و صفائی کے بارے میں علم کی بھی کمی تھی اور بچوں کی پرورش میں تادیبی اور جبر و طاقت پر مبنی اصول روا رکھے جاتے تھے۔

آج کے دور میں بچے کی اچھی پرورش و نگہداشت کے بارے میں لکھی جانے والی کتابوں اور رسالوں کے انبار دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بچے کی نشوونما کے مختلف مراحل اور اس بارے میں علم کی ضرورت کی اہمیت سے کہ ہم بچوں کی دیکھ بھال بہترین طریقے سے کیسے کر سکتے ہیں، آئے دن زیادہ سے زیادہ لوگ آگاہ ہو رہے ہیں۔ امریکہ جیسے ممالک میں اب خواتین پر تعلیم حاصل کرنے یا دفتروں اور کارخانوں میں کام کرنے کی پابندی نہیں رہی۔ دوسرا یہ کہ متوسط امریکی گھرانوں کے لیے بھی اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ خرچ پورے کرنے کے لیے میاں بیوی دونوں کام کریں۔لہٰذا یہ کہنا بجا ہے کہ امریکی خواتین گھر پر زیادہ وقت نہیں گزارتیں اور اس کی وجوہات بھی میں نے عرض کر دی ہیں مگر اس کا حل یہ نہیں کہ ہم واپس انھی ایام کی طرف لوٹ جائیں کہ جب خواتین کی حیثیت لونڈیوں اور باندیوں سے زیادہ نہ تھی۔ جب وہ سارا سارا دن گھر کے کام

کاج میں جتی رہتی تھیں اور محنتانے کے طور پر انھیں پھوٹی کوڑی بھی نہ ملتی تھی۔
حل اس کا یہ ہے کہ گھروں' مدرسوں اور ان جگہوں سے باہر پورے معاشرے میں سرانجام دیے جانے والے توجہ ونگہداشت کے کام کو اس کی حقیقی قدر و قیمت دی جائے' خواہ یہ کام خواتین سرانجام دیں یا مرد۔

خواہ وہ امریکہ میں ہوں' ایران میں ہوں' بھارت میں ہوں یا پاکستان میں' کا مقصد ہمیں اس خاندانی نظام کی طرف واپس لوٹانا ہے کہ جس میں باپ کو گھر میں مطلق حاکمیت حاصل تھی اور کسی کو بھی اس کے بارے میں کوئی سوال اٹھانے کی جرات نہ ہوتی تھی۔(34)

بعض ممالک میں عورتوں پر مردوں کی بالادستی مسلط کرنے والے مذہبی قوانین کو دوبارہ نافذ کیا جا رہا ہے۔ ہندو بنیاد پرست آج بھی مردانہ بالادستی' بچپن کی شادی اور حتیٰ کہ ستی کی اس رسم جیسی روایات کا دفاع کرتے نظر آتے ہیں جس میں بیوہ کو زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ امریکہ میں بعض گروہوں کے لوگ مردوں کو خواتین پر دوبارہ بالادستی جمانے پر اکسا رہے ہیں اور دوسری طرف خواتین کے کانوں میں وہ یہ پھونک رہے ہیں کہ خدا نے انھیں مرد کی مکمل اطاعت اور فرمانبرداری کا حکم دیا ہے۔(35)

بنیاد پرست یہ بھی تبلیغ کرتے ہیں کہ بچوں کو سخت سے سخت سزاؤں کے زور پر بڑوں کی مکمل فرمانبرداری کی تربیت دی جائے۔ امریکی بنیاد پرست بچوں کو ''خدا کے بتائے ہوئے طریقے'' کے مطابق پرورش کا پرچار کر رہے ہیں اور وہ والدین کو کہتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو ''راہ راست'' پر رکھنے کے لیے کڑی سے کڑی سزائیں دے۔(36) اور بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ان کی کتابیں اور پروگرام پڑھ کر بہت سے لوگ ان کے پیچھے بھی لگ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے لیے یہ طریقے جانے پہچانے ہیں لہٰذا یہ بہت سے ایسے افراد کو عین فطری محسوس ہوتے ہیں جو خود ابھی تک اپنی تسلطی پرورش کا رنج' غصہ اور اذیت اپنے ساتھ اٹھائے پھرتے ہیں۔ اس طرح تسلط کی ان عائلی روایات کو مضبوطی مل رہی ہے جو مستقبل میں بھی تسلطی درجہ بندیوں کے استمرار و استحکام کا باعث بنیں گی۔

معاشیات اور انکار کی سیاست:

بنیاد پرست عائلی اقدار کا ایجنڈا صرف خاندانوں پر ہی اثرانداز نہیں ہو رہا۔ اس سے

سیاست واقتصاد پر بھی بہت گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ جابر اور تسلطی گھرانوں کے مرد ''مردآ ہن'' قسم کے قائدین کو ووٹ دیتے ہیں اور ان میں متوجہ معاشی و معاشرتی پالیسیوں کی بجائے تادیبی پالیسیوں کی حمایت کا رجحان زیادہ پایا جاتا ہے۔(37) ایک امریکی سروے کے مطابق بنیاد پرستی کے اس تازہ آغاز کے وقت سے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس بات پر یقین کرنے لگی ہے کہ ''باپ کو گھر کے بادشادہ کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔'' یہ محض ایک جابرانہ عائلی آدرش کی ہی عکاسی نہیں کرتا۔ یہ ان نفسی وعمرانی حرکیات سے پردہ بھی اٹھاتا ہے جو ان امریکی سیاستدانوں کے انتخاب کے پیچھے کارفرما ہے کہ جو خارجہ تعلقات میں طاقت پر زور دیتے ہیں، گھریلو اختلاف نظر کو دبانے کے قائل ہیں اور جو زیریں افراد کی ضرورتوں کو پس پشت ڈال کر بالائی افراد کو ہر طرح کے معاشی فائدے اور مراعات فراہم کر رہے ہیں۔(38)

ان لاشعوری نفسی وعمرانی حرکیات سے اس بات کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ مسیحی بنیاد پرستوں کی اتنی بڑی تعداد ایسی پالیسیاں نافذ کرنے والے سیاستدانوں کی حمایت کیوں کرتی ہے جو امراء اور بڑی کاروباری کارپوریشنوں کو اس قدر فائدہ پہنچاتی ہیں۔ بادی النظر میں یہ حمایت قدرے عجیب محسوس ہوتی ہے کیونکہ زیادہ تر مسیحی بنیاد پرستوں کا تعلق نچلے متوسط اور یا پھر بالکل ہی غریب طبقے سے ہے لیکن یہ بات ہم پر اس وقت واضح ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بہت سے افراد کا تعلق ایسے جابر اور تادیبی گھرانوں سے ہے جہاں وہ خود کو اہل حکم سے شناخت کرنا اور اس بات کو جھٹلانا سیکھتے ہیں کہ ''بزرگوں'' سے کوئی خطا بھی سرزد ہوسکتی ہے۔(39)

(یہ صفحات پڑھتے ہوئے فارسی ضرب المثل ''خطائے بزرگاں گرفتن خطا است'' ''پتہ نہیں کیوں بار بار میرے ذہن میں آ رہی ہے۔ مترجم)

میں یہاں دوبارہ اس بات پر زور دینا چاہوں گی کہ تسلط و طاعت پر مبنی خاندانوں سے آنے والا ہر شخص ان لاشعوری نفسی وعمرانی حرکیات میں گرفتار نہیں ہوتا جو اسے اپنے ہی ذاتی معاشی مفاد کے خلاف ووٹ دینے پر مائل کرتی ہیں لیکن اگر انھیں زیادہ مساواتی تعلقاتی سانچوں تک رسائی میسر نہ آ سکے تو زیادہ لوگوں کا حال یہی ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ آئے ہیں بچے عموماً اپنے والدین کے رویوں کے بارے میں انکار کا

وتیرہ سیکھ جاتے ہیں کیونکہ ان کا ان کی بقاء یعنی خوراک' رہائش اور حفاظت کے لیے سارا دارومدار والدین پر ہوتا ہے۔(40) اس طرح پروان چڑھنے والے افراد کے لیے ان ''آہنی'' قائدین کے بارے میں بھی انکار کا رویہ اختیار کرنا اور ان میں اپنا عکس دیکھنا آسان ہوتا ہے جو طاقت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں' علی الخصوص کسی حقیقی یا مفروضہ خارجی خطرے کی صورت میں۔

لوگوں کا بڑے کاروباری اداروں کے سربراہوں کی تنخواہوں میں غیر معمولی اضافوں پر اور امراء کو دی گئی ٹیکسوں کی لمبی چوڑی رعائتوں پر اف نہ کرنا درحقیقت ایک بہت زیادہ حد تک انھی انکاری رویوں کے سبب ہوتا ہے جو لوگ بچپن سے اپنے ساتھ لاتے ہیں اور کاروباری اداروں کے یہ کرتا دھرتا وہی لوگ ہوتے ہیں جو ملازمین کی چھانٹی کرتے وقت ضمیر کی ذرا سی بھی خلش محسوس نہیں کرتے اور وہ بھی ادارے کے مالی مصارف پر قابو پانے کے نام پر حکومت بھی ان بڑے بڑے ساہوکاروں کو تو ٹیکس میں چھوٹ دے کر اتنا اتنا مالی فائدہ دے دیتی ہے اور سماجی رفاہ کے پروگراموں کی بات کرنے والوں کو آگے سے ٹھینگا دکھا دیتی ہے۔ اسی طرح بعض لوگ شہریوں کی خفیہ نگرانی اور عراق پر مسلط جھوٹی جنگ جیسی قبیح اور غیر جمہوری حکومتی حرکات کو بھی بڑے مزے سے چپ بیٹھے دیکھتے رہتے ہیں۔ ایسے رویوں کے پیچھے کارفرما بڑا سبب بھی خاندان میں بڑے میاں کی کلی تابعداری کی بچپن سے چلی آنے والی عادات ہیں جن میں یہ انکار بھی شامل ہو جاتا ہے کہ ''طاقتور'' قائدین تو غلط ہو ہی نہیں سکتے۔

یقیناً اس میں دوسرے عوامل بھی آ جاتے ہیں۔ امریکی صحافتی اداروں اور ان کے چند ہاتھوں میں ارتکاز کو ہی دیکھ لیں۔ 2000ء تک امریکہ کے تمام ذرائع ابلاغ کا کنٹرول صرف چھ کمپنیوں کے ہاتھ میں آ چکا تھا۔(41) پھر ان ذرائع ابلاغ سے مسلسل کے جانے والے اس پروپیگنڈے کو دیکھیں جس میں یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ جو چیز مایہ داروں اور زورو الوں کے لیے اچھی ہے وہ سب عوام الناس کے لیے بھی بہتر ہے۔ اخباروں اور ٹیلی ویژن چینلوں سے نشر کی جانے والی حکایتیں ہمارے ذہنوں میں بار بار یہ پیغام گھسیڑنے کی کوشش کرتی ہیں کہ عالمی معیشت میں امریکی مقام کو برقرار رکھنے کے لیے کارکنوں کی تنخواہوں اور سہولیات میں کمی بہت ضروری ہے۔ بہت سے امریکی کارکنوں کو اپنی ملازمتوں' اپنی روزی

روٹی اور علاج معالجے جیسی بنیادی سہولتوں سے محروم ہونا پڑ رہا ہے اور لوگوں کے اس محرومی کے خوف سے فائدہ اُٹھانے کے لیے طرح طرح کے سیاسی ہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے ہیں۔

معاشی عدم تحفظ سے پیدا ہونے والا یہ خوف اور تشویش ایک طرف، دہشت گردی کے مہیب سے مہیب تر ہوتے عفریت کا خوف الگ ہے اور بدقسمتی سے یہ خوف کوئی ایسا غیر حقیقی بھی نہیں۔ نیویارک کے عالمی تجارتی مرکز پر ہونے والے المناک حملے سے ساری بات ہمارے سامنے آ ہی چکی ہے لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ دہشت گردی کے اس خوف کو بھی نظام میں تسلطی رنگ مزید گہرا کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

بعدالصنعتی دور کی طرف عاجلانہ منتقلی سے پیدا ہونے والا سماجی عدم استحکام اس خوف کا ایک اور بڑا کارن ہے، خصوصاً تسلطی شخصیت اور ذہنی کٹڑپن کے حامل افراد کے لیے۔ اس میں پھر ساہوکار کے پھیلائے ہوئے صارفانہ ہیجان، انٹرنیٹ' فیکس' صوتی ڈاک' آئی پوڈ' موبائل فون اور ای میل جیسی الیکٹرانی حرفتوں کی پیدا کردہ زندگی کی اندھی دوڑ کو بھی شامل کر لیں تو ساری بات خود ہی آپ کی سمجھ میں آ جائے گی کہ لوگوں کے پاس خود کے لیے اور اپنی اس دنیا کے بارے میں سوچنے کے لیے وقت اتنا کیوں کم ہے۔ مثبت تبدیلیوں کے لیے کوششیں کرنے کی بات تو میرا خیال ہے کہ فی الحال چھوڑ ہی دیں تو بہتر ہے۔

بایں ہمہ شراکتی نظام کی طرف پیش قدمی بھی جاری و ساری ہے۔ خوف' انتہاپسندی' بدعنوانی' بیگانگی اور دبدھا کے اس گھٹاٹوپ عہد میں بھی مساوات' عدل و انصاف' دیانت' وقار اور توجہ و عنایت جیسی انسانیت نواز اقدار لوگوں کو پیہم ایک بہتر دنیا اور ایک نئے مستقبل کے لیے کام کرنے پر ابھارتی رہتی ہیں۔

عالمی تحریک برائے مشارکت:

توجہ و شفقت انسانیت کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ایڈم سمتھ نے بھی اپنی تحاریر میں انسانی فطرت کے اس مثبت پہلو کو تسلیم کیا ہے۔ اس نے ''دولت اقوام'' میں اس موضوع پر کوئی خاص توجہ نہیں دی لیکن آزاد معیشت کے ضمن میں پیش کردہ اس کے دلائل کے پیچھے کارفرما اس تمنا کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ اپنے بھائی بندوں کا احساس مآل کار خودغرض و مفاد پرستی کے سفلی انسانی جذبات پر غالب آ جائے گا۔(42)

ہم ان دونوں انواع کے جذبات ومحرکات کو باہم متناقض قرار نہیں دے سکتے۔ ایک باشعور ذاتی مفاد میں دوسروں کا احساس بھی آ جاتا ہے۔ اس باہمی ربط ونسبت کی روزافزوں آگہی ان لاکھوں افراد کی مساعیوں کے پیچھے کارفرما نظر آتی ہے جو آج کے اس دور میں ریتوں، روایتوں، اداروں اور وتیروں کا رخ شراکت کی جانب پھیرنے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔

ایک طرف تسلطی نظام کا تجاذب ہے جو بعض نفسی وعمرانی حرکیات کی وساطت اپنی جڑیں پھر قائم کرنے کے درپے ہے۔ بعض لوگ ہماری بعدالصنعتی دور میں اس اچانک جست کے طفیل پرانے اداروں میں پیدا ہونے والے عدم استحکام کو ایک خوفناک خطرے سے تعبیر کر رہے ہیں۔ وہ پرانے اور شناسا نظام سے چمٹے ہوئے ہیں اور ہمیں جابر، تادیبی اور پدرسری خاندانی نظام کی طرف دھکیلنا چاہتے ہیں۔ وہ خاندان، مذہب اور تعلیم سے لے کر سیاست اور معاشیات تک تمام اداروں میں بالاتازیریں کنٹرول کو دوبارہ مستحکم ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔

دوسری طرف ایسے لوگ ہیں جو ہمیں اس نوع کے اداروں سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے تیز رفتار حرفتی معاشرتی بدلاؤ اور اس کے سبب پیدا ہونے والے عدم استحکام نے ہمیں آگے بڑھنے کا ایک موقع فراہم کیا ہے۔ ہزاروں غیر سرکاری تنظیمیں غربت اور معاشی ناانصافی کی صورتحال کو بدلنے، ماحولیاتی تحفظ اور غیر صحتمندانہ طرز زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے، تنازعات کے پرامن حل کو فروغ دینے اور بچوں، عورتوں اور مردوں کے انسانی حقوق کو تحفظ دینے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اگرچہ ان تنظیموں کی توجہ مختلف مسائل کی طرف بٹی نظر آتی ہے، دیکھا جائے تو ان سب کا ہدف ایک ہی ہے اور وہ ہے ایک زیادہ متوجہ اور بااحساس معاشی ومعاشرتی نظام کی منزل کا حصول۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل، ہیومن رائٹس واچ اور ان کے علاوہ بیشمار چھوٹی چھوٹی تنظیمیں سیاسی قیدیوں پر تشدد، لڑکیوں کے ختنوں اور اربوں ڈالر کی عالمی جنسی تجارت میں بچوں کی خرید وفروخت کے خلاف مصروف پیکار ہیں۔ فرینڈز آف دی ارتھ، سائینٹسٹس فار سوشل رسپانس بلٹی، دی ارتھ آئی لینڈ انسٹیٹیوٹ، دی سیرا کلب اور دوسری سینکڑوں جماعتیں ایسی پالیسیوں کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہیں جن سے ہمارے معاون حیات قدرتی نظاموں کو بچایا جا سکے، فضلات اور زہریلے مادوں کو ہمارے ماحول کو آلودہ کرنے اور ہماری صحت کو نقصان پہنچانے

سے روکا جا سکے اور فضائی درجہ حرارت میں اضافے کا سبب بننے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج میں کمی کی جا سکے۔ دیگر تنظیمیں نامیاتی کاشت کاری' نامیاتی خوراک اور ہمہ جہتی طبی نگہداشت کے فروغ کی کوششوں میں لگی ہوئی ہیں تا کہ زیادہ صحت مند' پرسکون اور حساس طور طریقوں کو رواج دیا جا سکتے۔ (43) امریکہ کی فیئر ٹریڈ الائنس امریکی منڈیوں میں ایسے رجحان کے لیے کوشاں ہے کہ لوگ ایسی کمپنیوں سے مال خریدنے کو ترجیح دیں جو اپنے ملازمین سے ٹھیک سلوک کرتی ہیں اور ان سے مال خریدنے سے گریز کریں جو اپنے ملازموں اور کارکنوں سے غلط سلوک کرتی ہیں اور ان کا استحصال کرتی ہیں۔ یہ تنظیم لوگوں کو وال مارٹ اور دیگر ایسی تنظیموں پر دباؤ ڈالنے پر مائل کرتی ہے تا کہ وہ اپنے مزدور کش وتیروں سے باز آ جائیں۔ یہ ماحولیاتی اور معاشرتی اعتبار سے ذمہ دار کاروباری اداروں کی فہرستیں بھی تیار کرتی ہے تا کہ مثبت رویوں کی حوصلہ افزائی کی جا سکے۔

ہنگر پراجیکٹ' عالمی فنڈ برائے خواتین' خواتین کی تنظیم برائے ترقی و ماحول' انجمن برائے معمر خواتین نیز ہزاروں دیگر چھوٹی چھوٹی تنظیمیں مثلاً مذہبی قوانین کے تحت زندگی بسر کرنے والی خواتین کی انجمن' سینگیال کاٹوسٹن پراجیکٹ اور سیاٹل کے ٹین ٹاکنگ حلقوں نے خود کو خواتین کو معاشرے میں ان کا جائز مقام دلانے کے لیے جاری جدوجہد کے لیے وقف کیا ہوا ہے۔ پلانڈ پیرنٹ ہڈ انٹرنیشنل پاپولیشن ایکشن انٹرنیشنل' دی پاپولیشن انسٹیٹیوٹ اور ایسی دوسری کئی تنظیمیں خاندانی منصوبہ بندی اور خواتین کے لیے تولیدی طبی خدمات کو دنیا بھر میں فروغ دینے کے لیے کام کر رہی ہیں۔

خاص طور پر اہمیت کے حامل بین الاقوامی مراکز برائے ہمدردی اطفال اور امریکی ادارہ برائے دفاع اطفال ہے جو کہ بچوں کے حقوق کے لیے کام کر رہے ہیں۔ مطالعات برائے خواتین' افریقی و امریکی مطالعات' مطالعات برائے امن اور مطالعات برائے حضرات جیسے جدید پروگرام بھی بہت اہم ہیں۔ اس کے علاوہ ہزاروں ملکی و بین الاقوامی کانفرنسیں ہیں جہاں ہر براعظم سے آنے والے مندوبین معاشی و معاشرتی ترقی کے لیے تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔

آج کے دور میں آئے روز سامنے آنے والی ان تصنیفات کی بھی انسانی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی جو پیہم اس حکایات کے توڑ میں مصروف ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ انسانیت تسلط و طاعت' تشدد اور مردانہ جبر کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ (44) ان کتب میں پیش کی جانے والی

ہمارے ماضی و حال اور ممکنہ مستقبل کے بارے میں متبادل حکایات بہت سے لوگوں کو آگے بڑھنے میں مدد دے رہی ہیں۔ جنسی تفاوت و تسلط پر انگشت نمائی کرنے والی کتابیں نہ صرف خواتین بلکہ مردوں کے لیے بھی نئے در وا کر رہی ہیں۔

کینیڈین مرکز برائے انسداد تشدد' سویڈش مین سینٹرم اور امریکی اساتذہ برائے انسداد تشدد جو کہ امریکی عساکر اور کالج طلباء کی معاونت سے کام کر رہا ہے' نے خواتین پر مردانہ تشدد کی روایتوں کا قلع قمع کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہوا ہے۔

ترقی پسند مدارس اور بچوں کی جذباتی نیز جسمانی و ذہنی ترقی ونشوونما اور مثالی متوجہ رویوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے کام کرنے والے دیگر ایسے ادارے بھی ہماری ایک زیادہ متوجہ اور عادلانہ معاشرے کی طرف پیش رفت میں بہت اچھا کردار ادا کر رہے ہیں۔

پھر مرکز برائے ذرائع ابلاغ و جمہوریت اور میڈیا واچ جیسے اداروں کا ایک اپنا کردار ہے جو بڑے ذرائع ابلاغ نیز خبروں اور سیاسی و معاشرتی تبصروں کا تجزیہ کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ نسلی مساوات' مقامی افراد کے حقوق' مذہبی رواداری' امن اور معاشی انصاف کے لیے کام کرنے والی تنظیمیں اور کوئیکرز' یونی ٹیرئنز اور تکن کمیونٹی نیٹ ورک جیسی ترقی پسند وہ روحانی جماعتیں آ جاتی ہیں جو فرسودہ تسلطی ''اخلاقیات'' کی متبادل دوسری راہیں سجھاتی ہیں۔ (45)

اشوک اور اون جیسی تنظیمیں ایسے مردوں' عورتوں اور سماجی کارکنوں کو مالی امداد مہیا کرتی ہیں جو اپنی قائدانہ ترقی کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ سماجی طور پر ذمہ دار سرمایہ کاری کا ایک نیا تصور ابھر کر سامنے آیا ہے جس کا مطلب ہے کہ صرف ایسے کاروباری اداروں میں پیسہ لگایا جائے جو مثبت سماجی اور ماحولیاتی پالیسیوں اور وتیروں کے حامل ہیں۔ پھر ایلا باٹ کے بھارت میں قائم کردہ ادارے سیوا اور لاطینی امریکہ میں کام کرنے والے نمستے ڈائریکٹ پروگرام جیسی تنظیمیں ہیں جو کہ خواتین کو کاروبار کے لیے آسان شرائط پر چھوٹے قرضہ جات فراہم کرتی ہیں تاکہ وہ اپنے کنبوں کی بہتر دیکھ بھال کر سکیں۔ انھیں انتہائی کامیاب پروگراموں میں شمار کیا جا سکتا ہے اور ان میں ادائیگیوں کی اوسط شرح سو فیصد کے قریب ہے۔

سماجی سرمایہ کاری:

ایک زیادہ متوجہ اوور پائیدار مستقبل کی تعمیر کے لیے سرمایہ کاری کا ایک نیا شعبہ سامنے آیا ہے۔ یہ اس بلا منافع تنظیمی شعبے یا سول سوسائٹی کا ایک مرکزی جزو ہے جس کی گزشتہ عشروں میں بہت زیادہ نشوونما ہوئی ہے۔

نائجیریا میں جمہوری طریقے سے منتخب ہونے والے پہلے صدر کی دختر ہفصت ابی اولا ایک ایسی ہی سماجی سرمایہ کار ہیں۔ اپنے ماں باپ کے نائجیری فوج کے ہاتھوں قتل کیے جانے کے بعد ابی اولا امریکہ بالکل تنہا تھی لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے آبائی وطن میں سیاسی جمہوریت کی بحالی کے لیے شبانہ روز کام کیا۔ بعد میں اس نے نائجیریا واپس لوٹ کر ایک ایسی تنظیم کی بنیاد رکھی جو خواتین کو قیادت کے لیے اور جنسی امتیاز کے خلاف لڑنے کے لیے تیار کرتی ہے۔

بنگلہ دیش میں ایک ایسی ہی سماجی سرمایہ کار شمس المومن پلاش، یونیورسٹیوں میں ماحولیاتی تحفظ کے لیے کام کرنے والے سماجی کارکنوں کو منظّم کرنے کا کام کرتے ہیں۔ ان کے دِل میں قدرتی ماحول سے محبت کا جذبہ بچپن میں پیدا ہوا جب وہ دریائے سیتالاکھ میں پیراکی کیا کرتے تھے جسے ایک کھاد فیکٹری نے آلودہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ طلباء کو ماحول کے تحفظ کے لیے کام کرنے کی تربیت دیتے ہیں۔

امریکہ میں روشن روبنز نامی ایک نوجوان نے ماحولیاتی تحفظ کے لیے پیس! کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی۔ اس وقت ان کی عمر فقط سولہ سال تھی۔ رابنز سات سال کی کچی عمر سے ہی رفاہی کاموں میں مشغول ہیں جب انھوں نے اپنے مدرسے میں ایک امن ریلی کا انعقاد کیا تھا۔ پیس! تمام دنیا سے مدعو کیے گئے نوجوان کارکنان کے لیے کیمپ منعقد کرتی ہے اور ان میں ایک بہتر دنیا کے لیے کام کرنے کی تحریک پیدا کرتی ہے۔

برازیل کے شہر ریوڈی جنیرو میں ایک اور سماجی سرمایہ کار تھائیس کورل نے سیمینا کے نام سے ایک تنظیم قائم کی ہے جو پرتگالی زبان میں مواصلات، تعلیم اور جنسیاتی علم کے الفاظ سے مل کر بنا ہے۔ یہ تنظیم مختلف علاقوں میں انٹرنیٹ کے مراکز بنا کر دیتی ہے جہاں مقامی خواتین ایسے پروگرام تیار کرتی ہیں جو چار سو سے زائد ریڈیو سٹیشنوں سے نشر کیے جاتے ہیں۔ کورل ان خواتین کارکنوں کے لیے سائبرلاز کا لفظ استعمال کرتی ہے جو سائبر اور سنڈریلاز کا مرکب ہے۔ کورل متعدد دوسری تنظیمیں بھی چلاتی ہیں اور امن واستحکام اور معاشی ومعاشرتی انصاف کے کام کی خاطر دنیا بھر کے ملکوں کا سفر کرتی ہیں۔

آج کی دنیا میں آپ کو ہزاروں ایسے سماجی سرمایہ کار ملیں گے جن میں مرد اور عورتیں حتیٰ کہ لڑکے اور لڑکیاں بھی شامل ہیں ان افراد کے پاس سماجی مسائل کے حل کے لیے نئے خیالات بھی ہیں اور ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا جذبہ بھی۔

بزنس فار سوشل رسپانسی بلٹی، ورلڈ بزنس اکیڈیمی اور سوشل وینچر نیٹ ورک جیسی تنظیموں نے کارپوریشنوں کے لیے نئے دساتیر العمل، سماجی ذمہ داری کے تخمینوں اور سماجی و کاروباری اور ماحولیاتی منافعے کی طرف پیش رفت کے نئے وسیلے تجویز کیے ہیں۔ کارخانے میں روحانیت کے موضوع پر منعقد ہونے والی کانفرنسیں اور سیمینار اس بات کا تجزیہ کرتے ہیں کہ کام کو زیادہ بامعنی کیسے بنایا جا سکتا ہے اور زیادہ متوجہ اور حساس کاروباری طریقوں کی حوصلہ افزائی کیسے کی جا سکتی ہے۔

اس نوع کی مساعیوں کے طفیل کاروباری اداروں کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد اپنے ملازمین، حصص میں پیسہ لگانے والوں اور اپنے اردگرد کے علاقوں کے سماجی و ماحولیاتی مسائل پر توجہ دینے لگی ہے۔ کمپنیوں کو اس بات کا احساس ہونا شروع ہو گیا ہے کہ وہ وتیرے جو توجہ و احساس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں زیادہ کاروباری استعداد، موثر مواصلات اور کامیاب اشتراک کار کا باعث بنتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب والد اور والدہ دونوں کے لیے والدینی رخصت اور لچک دار اوقات کار کے رواج میں اضافہ ہو رہا ہے۔

لوگوں کی عادات خرید میں بھی روز بروز تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ اب وہ ایسی کمپنیوں کو ترجیح دینے لگے ہیں جو اپنے کارکنوں کو مناسب اجرت دیتی ہیں اور بچوں سے محنت نہیں لیتیں۔ (46) وہ بازار میں ماحول دوست مصنوعات طلب کرنے لگے ہیں مثلاً وہ سنگھار کا سامان ایسے سٹوروں پر خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں جو مقامی لوگوں کو ملازمت دیتے ہیں اور ایسی قدرتی مصنوعات فروخت کرتے ہیں جن کی جانچ کے لیے جانوروں کو ظلم کا نشانہ نہیں بنایا جاتا۔

علاوہ بریں اکثر صنعتی ممالک کی حکومتیں عوامی دباؤ کے کارن لوگوں کو اپنے افرادی سرمائے کی افزائش کے لیے مفت طبی سہولیات بھی فراہم کرنے لگی ہیں۔ سویڈن، ناروے، فن لینڈ، فرانس، جرمنی، نیوزی لینڈ اور کینیڈا کے بشمول بہت سے ممالک تو اب ملازمین کو مع تنخواہ رخصت والدینی اور نگہداشت اطفال کے لیے مالی اعانت بھی دینے لگے ہیں۔

MashalBooks.com

سرکاری ترغیبات کی بدولت بہت سی یورپی اقوام کوئلے اور تیل سے ایسے قابل تجدید وسائل کی طرف منتقلی کے لحاظ سے امریکہ سے کہیں آگے نکل چکی ہیں جو کاربن ڈائی آکسائیڈ اور ماحول کے لیے مضر دیگر گیسوں کے فضا میں اخراج کا باعث نہیں بنتے۔ جرمن اپنی توانائی کا پانچ فیصد سے زائد حصہ بائیوماس، ہوا اور شمسی تختوں جیسے قابل تجدید اور ماحول دوست ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔ سپین اپنی 10 فیصد بجلی ہوائی طاقت سے حاصل کرتا ہے اور 2010ء تک اسے تین گنا کرنا چاہتا ہے۔ سویڈن میں ہائیڈروپاور اور بائیوفیول سے حاصل کی جانے والی توانائی، توانائی کی کل رسد کا 20 فیصد ہے جو کہ تیل کی فیصد تعداد کے برابر آ جاتی ہے۔(47)

یورپی اتحاد میں شامل ممالک کارخانے داروں پر یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ وہ اپنی مصنوعات کی پیکنگ کو دوبارہ استعمال میں لائیں۔ اس اقدام کی بدولت کمپنیاں اب نسبتاً زیادہ ماحول دوست قسم کی پیکنگ دینے لگی ہیں اور بہت سی مصنوعات کی پیکنگ میں فوم اور پلاسٹک کے لفافوں کا استعمال ترک کر دیا گیا ہے۔ یورپی یونین میں اس بات کی پابندی بھی عائد ہے کہ جینیاتی طریقے سے تیار کردہ مصنوعات کو اس وقت تک بازار میں فروخت کے لیے نہ لایا جائے جب تک کہ ان کے طویل المدتی اثرات کے لے ان کی جانچ نہ کر لی جائے۔

سکنڈے نیویا کے ممالک کی درسگاہوں میں حساس جنسی تعلقات اور پرورش اطفال کے متعلق تربیتی کورس کرائے جاتے ہیں۔ امریکی درسگاہوں میں غنڈہ گردی کے تدارک اور تصادم کے پرامن حل کے بارے میں پروگرام رواج میں آ رہے ہیں۔ لوگوں کو ماحولیاتی ذمہ داری کی مثال پیش کرنے کے لیے مدارس کی ایک روزافزوں بڑھتی تعداد ڈیزل سے چلنے والی بسوں کی جگہ قدرتی گیس اور بجلی سے چلنے والی گاڑیاں خرید رہی ہے۔

سیاستدانوں نے بھی اور نہیں تو کم از کم ایک زیادہ حساس دنیا کی بات کو اپنی تقریروں میں ضرور جگہ دینا شروع کر دی ہے اور بعض نے تو زیادہ متوجہ اور منصفانہ پالیسیاں اختیار کر کے اپنی باتوں کو عملی جامہ بھی پہنانا شروع کر دیا ہے۔ اقوام متحدہ کے بہت سے کنونشنوں اور قراردادوں نے بھی عالمی شعور میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے اثر قبول کیا ہے۔ یونیسکو پناہ گزین کیمپوں میں شمسی تنور تقسیم اور ان کے استعمال کی تربیت کا اہتمام کر رہی ہے۔ انسانی حقوق اور منصفانہ معاشی ترقی کی حوصلہ افزائی کرنے والے یونیسیف کی طرح کے اداروں نے

MashalBooks.com

بچوں اور عورتوں کے حقوق کی پاسبانی کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے۔ علاوہ ازیں اقوام متحدہ کے میلینیم ڈویلپمنٹ گولز' گلوبل مارشل پلان اور ارتھ چارٹر جیسے دیگر بین الاقوامی پروگرام ہیں جن پر ہزاروں بلدیاتی ادارے' غیر سرکاری تنظیمیں اور کمپنیاں دستخط کر چکی ہیں۔

ایسے اقدام' منصوبے اور تنظیمیں دنیا میں بہت زیادہ تبدیلی پیدا کر رہے ہیں۔ یہ تسلطی روایات کی بیخ کنی میں مصروف ہیں اور شراکتی روشوں کو فروغ دے رہے ہیں۔ سچ پوچھیں تو اس سے قبل مشارکت کے لیے کبھی اس قدر شدید تحریک دیکھنے میں نہیں آئی ہو گی۔ لیکن ہم ابھی اپنی دنیا کو تسلط کے شکنجے سے پوری طرح آزاد کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ ہم تبدیلی کے اس عمل کو تیز تر کرنے کے لیے کیا کر سکتے ہیں، اس کا جائزہ ہم اگلے باب میں لیں گے۔

باب دہم

ہم تبدیلی کیسے لا سکتے ہیں؟

جیسا کہ گاندھی جی نے ایک مرتبہ کہا تھا ہمیں عادی اور روایتی کے فرق کو سمجھنا چاہیے گو یہ اکثر ایک دوسرے سے گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔ ہم پیدائشی عادتوں کے ساتھ نہیں ہوتے ہیں۔ یہ عادتیں ہمیں سکھلائی جاتی ہیں۔ ہم ان عادتوں سے چھٹکارہ پا سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی ان سے چھٹکارہ حاصل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

ہماری بہت سی معاشی عادات انسانی فطرت کے بارے میں مشہور غلط حکایات اور اس معاشی دوہرے معیار کی دین ہیں جو توجہ و نگہداشت جیسے اہم کام کو کوئی قدر و قیمت تفویض نہیں کرتا اور اگر کرتا بھی ہے تو نہ ہونے کے برابر۔ ان پیداواری پیمائشوں میں جنھیں کہ ہم عادتاً استعمال میں لاتے ہیں، ہم ایسی بازاری سرگرمیاں بھی شامل کر لیتے ہیں جو ہماری صحت اور قدرتی ماحول کو نقصان پہنچاتی ہیں لیکن گھر اور فطرت کی ممد حیات سرگرمیوں کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔ اس دولت کا جسے کہ مرکزی بینک پیدا کرتے ہیں اور گردش میں لاتے ہیں، کسی ٹھوس اثاثوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کمپنیوں کی سہ ماہی رپورٹوں میں اس طبی اور ماحولیاتی ضرر کا ذکر نہیں کیا جاتا جو کمپنی کی مصنوعات اور اس کی سرگرمیوں کے کارن معاشرے کو پہنچتا ہے۔ سرکاری پالیسیاں بھی اکثر اوقات حقائق کی بجائے تخیلات پر مبنی ہوتی ہیں اور یہ بات بش انتظامیہ کے عالمی درجہ حرارت میں مسلسل اضافے کے سلسلے میں کسی فوری اقدام کی ضرورت سے انکار سے کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

MashalBooks.com

ہم جو چاہیں راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ ہم چاہیں تو حرص' فریب اور ظالمانہ کاروباری روایتوں کے خلاف شکوے ہی کرتے رہیں۔ چاہیں تو کنبے اور کام دونوں سے بیک وقت عہدہ برآ نہ ہو سکنے کی صورت میں حاصل ہونے والے ذہنی دباؤ کو قبول کر لیں۔ ہم خود کو یہ بھی سمجھا سکتے ہیں کہ بھئی ان پالیسیوں کے بارے میں بھلا ہم کیا کر سکتے ہیں کہ جو ہمارے قدرتی ماحول کو نقصان پہنچاتی ہیں' اغنیاء و مساکین کے درمیانی فرق کو سوا کرتی ہیں اور بے اندازہ دکھ وابتلا کا باعث بنتی ہیں یا پھر دوسری صورت میں یہ ہے کہ ہم متحد ہو کر ایک زیادہ خوبصورت' معقول اور حساس معاشیات وثقافت کی تعمیر کے خواب کو بھی شرمندہ تعبیر کر سکتے ہیں۔

آ گہی اور عمل:

ہمیں جب بہتر امکانات کا شعور ملتا ہے تو ہمارے لیے اپنے سوچنے' محسوس کرنے اور عمل کرنے کی عادات میں تبدیلی لانا بھی ممکن ہو جاتا ہے لیکن اسے محض آغاز ہی کہنا چاہیے۔ جب ہم میں سے کافی تعداد میں لوگ اپنے عقیدے اور عمل میں تبدیلی پیدا کر لیتے ہیں تو ہماری ثقافت میں تغیر رونما ہو جاتا ہے۔ ہم جیسے جیسے زیادہ شراکت مائل خاندان' کارخانے' دفاتر اور افراد وجود میں لاتے جاتے ہیں۔ ہمارے روزمرہ تعلقات پر لاگو ہونے والے اصول وضوابط بھی تبدیل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اصول پھر بعد میں مزید شراکت مائل تعلقات کی آبیاری کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنے اردگرد کے معاشی و سیاسی تعلقات پر لاگو ہونے والے اصولوں میں بھی تبدیلیاں لانا شروع کر دیتے ہیں اور یہ سب ہماری عادات فکر وعمل اور ہمارے آس پاس کے عقیدوں اور ڈھانچوں میں مزید تبدیلیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

میں اپنے تجربے کی بنیاد پر اس عمل کی تصدیق کر سکتی ہوں۔ بہت سے لوگوں کی طرح میرا بھی یہ خیال ہوا کرتا تھا کہ میں اس دنیا کو ایک بہتر جگہ بنانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ میں تو یہ بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ میں اپنی روزمرہ زندگی میں تلخی پیدا ہونے والی چیزوں میں ہی کوئی تغیر پیدا کر سکتی ہوں لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ میرا ذہن دونوں لحاظ سے غلط تھا۔

ایک دفعہ جب میں تسلطی سحر سے باہر آ گئی اور میں نے ان حکایات سے چھٹکارہ پا لیا جو مجھے نظام فطرت اور اس نظام میں ایک خاتون ہونے کے ناتے میرے فطری مقام کے رٹے رٹائے سبق مجھے پڑھاتی تھی تو مجھے لگا کہ جیسے میری توانائی اور میری زندگی ان نئی جہات میں

پرواز کرتی چلی جاتی ہے کہ جن کے بارے میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ میں خود کو بے بس اور لاچار محسوس کرنے کی بجائے خود میں ایک قوت عمل پیدا ہوتی محسوس ہوئی اور میں سماجی و سیاسی جدوجہد میں مصروف ہوگئی۔

جنسی دوہرے معیار نے میرے اور میرے جیسے لوگوں کو کیسے جکڑ رکھا ہے جب مجھے اس چیز کی سمجھ آئی تو مجھ میں گویا ایک نئی جان پیدا ہوگئی اور میں نے تبدیلی کی اس جدوجہد میں دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے میں نے 'مرد مطلوب ہیں' اور 'خواتین مطلوب ہیں' کے اخباری اشتہارات کے خاتمے کے لیے کام شروع کیا۔ ان میں تمام اچھی ملازمتیں مرد مطلب ہیں والے کالموں میں دی جاتی تھیں اور نکمی نکمی ملازمتیں 'خواتین مطلوب ہیں' والے کالموں میں لکھی ہوتی تھیں۔ میں نے لاس اینجلز ویمنز لیگل پروگرام کی بنیاد رکھی جو کہ خواتین اور قانون پر پہلا پروگرام تھا۔ اس کے تحت میں نے ان ایام میں قانونی متصور کیے جانے والے جنسی امتیاز کے خلاف لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ نیز غریب خواتین کو مفت قانونی خدمات فراہم کرنا شروع کیں۔ میں نے اپنی قانونی تربیت کو بروئے کار لاتے ہوئے امریکی عدالت عظمٰی کو ایک محضر نامہ لکھا جس میں میں نے یہ موقف اختیار کیا کہ آئین کی چودہویں ترمیم کی مساوی تحفظ والی شق کے تحت مردوں اور عورتوں کو برابر تصور کیا جائے اور جنس کی بنیاد پر امتیاز روا رکھنے والے قوانین کو خارج کیا جائے۔

متعدد دیگر خواتین و حضرات کی معاونت کے طفیل میری یہ مساعیاں رنگ لائیں۔ مذکورہ بالا اشتہارات کو ایک ہی عنوان کے تحت لکھا جانا لگا۔ غرباء کی قانونی امداد کے پروگراموں کا اجراء ہوا اور عدالتوں نے امتیازی قوانین کو یکے بعد دیگرے حذف کرنا شروع کر دیا۔

تاہم رفتہ رفتہ مجھے یہ بات سمجھ آنا شروع ہوگئی کہ گو شہری حقوق، خواتین کے حقوق' معاشی عدل اور تحفظ ماحول کے لیے قوانین میں تبدیلی ضروری ہے، یہ کافی نہیں۔ میرے دل نے مجھے کہا کہ مجھے اور گہرائی میں جانا ہوگا اور ثقافت اور نظام کی بنیادی تبدیلیوں کے لیے کام کرنا ہوگا۔

لیکن اس مرحلے پر میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ تبدیلی کس چیز کی؟ میں نے دیکھا کہ سرمایہ داریت و اشتراکیت' مذہبی ولامذہبی' دائیں و بائیں اور صنعتی و قبل یا بعدالصنعتی کے زمرے اس سوال کا مناسب جواب نہیں دیتے۔ یہ زمرے ہمارے شعور کو خانوں میں بانٹ

دیتے ہیں کیونکہ وہ بنیادی انسانی تعلقات پر غور نہیں کرتے حالانکہ یہی وہ چیز ہیں جو سب سے پہلے لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ آیا حقوق انسانی کا احترام کرنا چاہیے یا حقوق انسانی کی خلاف ورزی کو ایک معمول کی چیز سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے۔

جب میں نے اپنے بین الاثقافتی اور تاریخی تجزیے میں مردوں اور عورتوں اور والدین اور بچوں کے مابین کے تعلقات کو شامل کیا تو شراکتی نظام اور تسلطی نظام کے خدوخال ابھرنا شروع ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ یہ دونوں قسم کے نقوش ہماری فکر و عمل اور احساس کی عادات پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ خاندانوں' مذاہب' معاشیات اور سیاست کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے جیون مرن کی حکایات ان سے کیسے اثر قبول کرتی ہیں۔ مجھے یہ چیز بھی نظر آ گئی کہ اور تو اور وہ ہمارے ذہن کی نشو و نما پر بھی اثراندز ہوتے ہیں۔ (2)

مجھے اس بات کا ادراک بھی ہوا کہ تسلط و تسخیر کی اقدار کے زیراثر پروان چڑھنے والی ہائی ٹیکنالوجی ہماری اور ہمارے بچوں کی زندگیوں کے لیے ایک خطرہ ہے۔ لہٰذا میں نے ایسی مساعیوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جو ہماری اس مہلک روش میں تبدیلی پیدا کر سکے اور پھر میرے ذہن میں یہ روشنی آئی کہ یہ مساعی معاشی تشکیل نو ہی ہو سکتی ہے۔

معاشی تشکیل نو کی ضرورت:

یقیناً صرف میں ہی معاشی تشکیل جدید کی فوری ضرورت پر زور نہیں دے رہی۔ جیسا کہ ارتھ پالیسی انسٹیٹیوٹ کے بانی لیسٹر براؤن کا کہنا ہے موجودہ معاشی نظام بہت ناپائیدار ہے۔ براؤن کا بتانا ہے کہ جنگلات سکڑ رہے ہیں' صحرا پھیل رہے ہیں' پانی کی سطح نیچے جا رہی ہے' زمینیں خراب ہو رہی ہیں' ماہی گیری کی صنعت کا کباڑہ ہو رہا ہے اور قطبی سمندر کی برف پگھل رہی ہے۔ خوراک اور پانی جیسی اجناس کی مانگ میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ چینی پہلے ہی امریکہ کے مقابلے میں زیادہ اناج' گوشت اور فولاد صرف کر رہے ہیں۔ توانائی کے استعمال کے موجودہ نظام بھی ناپائیدار ہیں۔ اگر چین کی معاشی نمو میں آٹھ فیصد کی حالیہ شرح سے اضافہ جاری رہا تو اس ملک میں 2031ء تک صرف تیل کا استعمال 99 ملین بیرل روزانہ تک پہنچ سکتا ہے جو کہ پوری دنیا میں پیدا ہونے والے تیل سے 20 ملین بیرل روزانہ زیادہ بنتا

ہے۔ بھارت کی سات فیصد معاشی شرح نمو اور 2030ء تک چین سے بھی اوپر جاتی آبادی سے حالات اور بھی دگرگوں ہونے کا اندیشہ ہے۔(4)

براؤن نے خبردار کیا ہے کہ معاشی و ماحولیاتی تباہی سے بچنے کے لیے ہمیں عالمی معیشت کی تشکیل نو کرنا ہوگی، غربت کے خاتمے کے لیے ایک جامع حکمت عملی کو بروئے کار لانا ہوگا اور مجروح ماحولیاتی نظاموں کی بحالی کے لیے کام کرنا ہوگا۔ اس کا کہنا ہے کہ ہمارے لیے عادات صرف کو بدلنا' ہوائی' شمسی اور توانائی کی دیگر متبادل حرفتوں کو اختیار کرنا اور عالمی آبادی کی شرح اضافہ میں کمی لانا ازحد ضروری ہے۔(5) اس کا کہنا ہے کہ ''موجودہ ڈگر پر چلتے رہنا بیکار بلکہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے اور ہمارے لیے اس سے قبل کوئی متبادل ڈگر اختیار کر لینا اشد ضروری ہے کہ جب تیل کی جغرافیائی سیاست اور اناج اور خام مال کی قلت معاشی عدم استحکام' سیاسی تصادم اور اس سماجی نظام میں کوئی خلفشار پیدا نہ کر دے کہ جس پر ہماری معاشی ترقی کا سارا دارومدار ہے۔''(6)

براؤن کی باتوں کو غلط نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کی بیان کردہ بیشتر چیزیں ان زیادہ گہرے مسائل کی محض ظاہری علامات ہیں جو کہ تسلطی معاشی پالیسیوں اور ثقافتی اقدار کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ معاشی تشکیل نو کے وقت ہمیں صارفانہ روش میں تبدیلی' نئی حرفتوں کے استعمال اور آبادی کی شرح نمو میں تخفیف سے آگے کی سوچنا ہوگی۔ اگر ان ضروری تبدیلیاں کو موثر طریقے سے نافذ کر بھی دیا جائے...... جو کہ موجودہ اقدار وقوانین کے تحت مشکوک نظر آتا ہے......تو بھی نئے بحرانات کو رونما ہونے سے نہیں روکا جا سکتا۔ وہ رونما ہو کے رہیں گے۔

ہمیں اس سے زیادہ اساسی نوعیت کی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ معاشی نظام انسانی ذہن کی تخلیق ہیں۔ بینکوں اور کارپوریشنوں سے لے کر بیمہ بیروزگاری اور سوشل سیکیورٹی تک ہر ادارہ اور پروگرام انسانی ایجاد ہے۔ وہ معاشی قوانین جو پکے پکائے ہم تک پہنچ جاتے ہیں' انسان کے ہی وضع کردہ ہیں۔ اب یہ فیصلہ ہم پر ہے کہ ہم ان میں سے کون سے قوانین کو باقی رکھنا چاہتے ہیں حقیقی انسانی احتیاجات سے عہدبرآ ہوسکیں۔ اگر ہم سب مل کر ان نئے قوانین کا مطالبہ کریں تو ہم ایک زیادہ متوجہ معاشیات اور ایک زیادہ حساس دنیا کی سمت بڑھنے میں ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ہمیں منڈیوں کو چلانے والے معاشی قوانین میں تبدیلی کی فوری اور اشد ضرورت

ہے۔موجودہ صورتحال میں تو یہی نظر آ رہا ہے کہ بے حس کاروباری وتیروں کا بھگتان صارفین اور ٹیکس دہندگان کو بھگتنا پڑ رہا ہے اور کاروباری اداروں کو زیادہ ذمہ دارانہ اختیار کرنے پر مائل کرنے کے لیے کوئی مثبت یا منفی ترغیب والی بات بھی دکھائی نہیں پڑتی۔ سماجی و ماحولیاتی اعتبار سے ذمہ دار کاروباری اداروں کے لیے ٹیکس میں رعایت بہت زبردست فرق پیدا کرسکتی ہے۔ ماحول اور صحت عامہ کے لیے مضر وتیروں پر بھاری ٹیکس عائد کر کے تبدیلی کے لیے ضروری اہم ترغیبات مہیا کی جاسکتی ہیں اور اس طرح زیادہ حساس سرکاری پالیسیوں کے لیے رقوم بھی بہ آسانی حاصل ہوسکتی ہیں۔

حساس پالیسیوں کے پیسہ اکٹھا کرنے کا ایک اور گر بازار حصص میں لگائے جانے والے سٹے پر ٹیکس کا نفاذ ہے۔اس سے بازاری معیشت کی تشکیل نو میں بھی مدد ملے گی۔ حصص کے انتہائی قلیل المدتی لین دین پر ٹیکس کے نفاذ سے سٹے بازی کے رجحان کی حوصلہ شکنی ہوگی اور اس سے طبی سہولیات، نگہداشت اطفال، تعلیم اور دیگر رفاہی وترقیاتی کاموں کے لیے پیسہ بھی جمع ہوگا اور ایسے پروگراموں پر پیسہ صرف کرنے سے پوری دنیا میں خوشحالی کو فروغ ملے گا۔

ایسی معاشی پالیسیاں بھی وقت کی اہم ضرورت ہیں کہ جو غذا اور دیگر اشیائے ضروریہ کی مقامی پیداوار کی حوصلہ افزائی کریں۔ پانی اور اناج جیسے بنیادی وسائل کا کنٹرول کسی دور پار بیٹھے آجر کی کارپوریشن کے ہاتھ میں نہیں دیا جانا چاہیے جیسا کہ بولیویا میں اس وقت دیکھنے میں آیا تھا جب بیچٹیل نامی ایک ادارے نے پانی کی مقامی رسد کا کنٹرول سنبھال کر اس اساسی نوعیت کی جنس کی قیمتوں کو آسمان تک پہنچا دیا تھا۔(7)

لیکن جہاں میں چھوٹی اور مقامی فرموں کی حوصلہ افزائی کرنے والی معاشی پالیسیوں کی ضرورت پر زور دیتی ہوں، وہاں میں یہ بھی کہوں گی کہ ضروری نہیں کہ چھوٹی چیز بڑی نفیس اور خوبصورت بھی ہو۔ بہت سی چھوٹی کمپنیوں میں بھی ظلم اور استحصال ہوتا ہے۔

ہمیں کارکنان، صارفین اور فطرت کو مقامی، ملکی اور عالمی سطح کی کمپنیوں سے بچانے والے آفاقی معیارات کی ضرورت ہے...... خواہ یہ کمپنیاں چھوٹی ہوں یا بڑی اور تجارت کی عالمگیریت ان آفاقی معیارات کو رواج دینے کا ایک بہت نفیس موقع ہے۔

گھنٹوں میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جانے والے ذرائع نقل و حمل اور یہ سفر سیکنڈوں میں مکمل کر لینے والے ذرائع مواصلات کی موجودگی میں تجارت کی

عالمگیریت ایک ناگزیر امر ہے لیکن بے حس معاشی پالیسیاں، قوانین اور وتیرے ناگزیر نہیں۔ جیسا کہ نیچے دی گئی جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشی منہاجات کو منصفانہ اور پائیدار خطوط پر استوار کیا جا سکتا ہے اور ایسا کیا جانا بہت ضروری ہے۔

ہمیں ایسے معاشی ڈھانچوں، اصولوں، پالیسیوں اور وتیروں کی تشکیل کی ضرورت ہے جو کہ خانگی معیشت سے لے کر قدرتی معیشت تک ہر اقتصادی شعبے میں خود کی، دوسروں کی اور اشیائے فطرت کی توجہ و احساس کی حوصلہ افزائی کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں پوری دنیا میں شراکتی ثقافتوں اور ڈھانچوں کی طرف منتقلی کے سفر کو بھی تیز تر کرنا ہو گا تا کہ توجہ و نگہداشت کا مول بڑھایا جا سکے۔

سیدھی سی بات ہے کہ اگر ہم زیادہ حساس معاشی و معاشرتی پالیسیاں دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں توجہ و نگہداشت کی تنقیص قدر کے عمل کو روکنا ہو گا۔ اگر ہمیں ایک صاف اور صحت مند ماحول درکار ہے تو ہمیں اس ماحول کا خیال رکھنا ہو گا۔ اگر ہم زیادہ حساس اور بارآور کارخانوں کے خواہاں ہیں، اگر ہم اپنے بچوں کے لیے ایسی توجہ و تعلیم کے خواہش مند ہیں کہ جو انھیں ایک اچھی زندگی گزارنے کے قابل بنا سکے، اگر ہمیں محفوظ گلی کوچوں اور پرشفقت گھروں کی ضرورت ہے، اگر ہم ایک زیادہ پرامن دنیا کے خواہاں ہیں تو پھر ہمیں ہر شعبہ ہائے زندگی میں توجہ و نگہداشت کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرنا ہو گی اور اس کا مول بڑھانا ہو گا۔

معاشی نظام کی تشکیل نو	
غیر پائیدار معاشی نظام	پائیدار معاشی نظام
گھر، علاقے اور فطرت کے ممد حیات وظائف کے کردار کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔	گھر، علاقے اور فطرت کے ممد حیات وظائف کے کردار کو تسلیم کرتے ہیں۔
یہ ان تسلطی عقیدوں اور اداروں کے تحت چلتے ہیں جو کہ توجہ و نگہداشت کے دام گراتے ہیں۔	یہ ان شراکتی عقیدوں اور اداروں کے تحت چلتے ہیں جو کہ توجہ و نگہداشت کا دام بڑھاتے ہیں۔

ان میں ایسے قوانین، پالیسیاں اور وتیرے روا رکھے جاتے ہیں جو انسانی ترقی، تخلیق و اختراع، منصفانہ تعلقات، باہمی ذمہ دار فطرت اور آئندہ نسلوں کے لیے فکرمندی کے احساس کو روکتے ہیں۔	ان میں ایسے قوانین، پالیسیاں اور وتیرے روا رکھے جاتے ہیں جو انسانی ترقی، تخلیق و اختراع، منصفانہ تعلقات، باہمی ذمہ داری، فطرت اور آئندہ نسلوں کے لیے فکرمندی کے احساس کو بڑھاتے ہیں۔
حرفی استعمالات پر ضبط و تسلط کی اقدار کا رنگ غالب ہوتا ہے۔	حرفی استعمالات پر توجہ و مشارکت کی اقدار کا رنگ غالب ہوتا ہے۔
معاشی پیداواریت کی پیمائشیں لوگوں اور فطرت کو نقصان پہنچانے والی سرگرمیوں پر توجہ دیتی ہیں مگر مدحیات اور ضروری غیر بازاری سرگرمیوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتیں۔	معاشی پیداواریت کی پیمائشیں لوگوں اور فطرت کو نقصان پہنچانے والی سرگرمیوں کو شمار میں نہیں لاتیں اور مدحیات اور ضروری غیر بازاری سرگرمیوں کو شمار کرتی ہیں۔
ایسے معاشی ڈھانچے وجود میں آتے ہیں جو دولت اور طاقت کے طبقاتی مینار کے اوپری حصے میں ارتکاز کا باعث بنتے ہیں اور زیریں طبقات کے افراد کو محاسبے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا۔	شراکتی اور منصفانہ معاشی ڈھانچے وجود میں آتے ہیں جو باہمی فائدے اور محاسبے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔
انسانی ضرورتوں اور صلاحیتوں کا استعمال کیا جاتا ہے اور فطری ماحول کو غارت اور گندہ کیا جاتا ہے۔	انسانی ضرورتوں کا خیال رکھا جاتا ہے، صلاحیتوں کی افزائش کی جاتی ہے اور ہمارے قدرتی مسکن کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔
ان میں بعدالصنعتی دور میں درکار بڑھیا افرادی سرمائے کی افزائش کے لیے مناسب سرمایہ کاری نہیں کی جاتی۔	ان میں بعدالصنعتی دور میں درکار بڑھیا افرادی سرمائے کی افزائش کی سرمایہ کاری کو اولین ترجیح دی جاتی ہے۔

MashalBooks.com

یہ ایک باہم متصل و منسلک دنیا میں ٹیکنالوجی کی اس سطح پر پائیدار نہیں۔	یہ ہمیں درپیش معاشی و معاشرتی اور ماحولیاتی مسائل سے عہدبرآ ہونے میں ہماری خاطرخواہ مدد کر سکتے ہیں۔

حکومت اور کاروباری عمائدین کیا کر سکتے ہیں؟

موجودہ معاشی قوانین کے تحت لوگوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ کارکنوں اور صارفین کے طور پر منڈی کی ضروریات پوری کریں۔ مجھے یہ عجیب لگتا ہے۔ منڈی کو تو الٹا یہ چاہیے کہ منڈی ان لوگوں کی ضروریات پوری کرے جو کہ روز بروز بڑھتے ہوئے خطرات میں گھرے اس سیارے پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اس کے لیے حکومت اور کاروباری عمائدین کو معاشی قوانین میں بدلاؤ پیدا کر کے انھیں ایسی شکل دینی چاہیے کہ وہ ساختی تغیرات اور اقدار میں تبدیلیوں کی حوصلہ افزائی کریں۔ ساختیں رویے کی صورت گری میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں جس طرح ہم کسی گول کمرے میں کسی کونے میں بیٹھنے کی توقع نہیں کر سکتے عین اسی طرح تسلطی نظام کے اندر رہ کر باہمی محاسبے، فائدے اور احترام پر مبنی تعلقات کے پنپنے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ ہمیں ایسی پالیسیوں کی ضرورت ہے جو خاندانوں اور درسگاہوں سے لے کر کمپنیوں اور حکومتوں تک تمام ڈھانچوں میں تکمیلی نظام مراتب کو فروغ دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ چونکہ اقدار اور ڈھانچے ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں، ہمیں ایسی پالیسیوں کی ضرورت ہے جو توجہ و احساس کو ایک مرکزی ثقافتی قدر کے طور پر فروغ دیں۔

معاشی قوانین کو تبدیل کرنے کے ضمن میں زیادہ درست معاشی پیمائشوں کو متعارف کرانا بھی بہت ضروری ہے۔ حکومت اور کاروباری قائدین کو اس امر کو یقینی بنانے کی کوشش کرنا چاہیے کہ معاشی پیمانے خاندانی اور رضاکارانہ معیشت میں سرانجام دیے جانے والے توجہ و نگہداشت کے کام کو بھی شمار میں لائیں۔

ان پیمائشوں میں ماحولیاتی اور سماجی اعتبار سے مضرت رساں مصنوعات اور سرگرمیوں کی لاگت کو بھی پیش نظر رکھا جانا چاہیے۔ ان تبدیلیوں کے بغیر عوام کو یہ بات سمجھ نہیں آئے گی کہ غیر متوجہ پالیسیوں اور وتیروں کا بھگتان ہم سب کو بھگتنا پڑتا ہے اور پالیسی سازوں کو بھی اس

بارے میں ایک صحیح تصویر نہیں ملے گی کہ کونسی سرگرمیاں معاشی طور پر پیداواری ہیں اور کونسی نہیں۔ خوش قسمتی سے ملکی اور بین الاقوامی حساباتی طریقوں میں تبدیلیوں کی ضرورت کے بارے آگہی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اقوام متحدہ کی انسانی ترقیاتی رپورٹوں اور ری ڈیفائننگ پراگریس اور کالوٹ ہینڈرسن کوالٹی آف لائف انڈی کیٹرز جیسی نئی پیمائشیں منظرعام پر آ رہی ہیں۔ عالمی بینک اور عالمی مالیاتی ادارے کے اعداد وشمار میں تبدیلی کے لیے بھی اقدامات کیے جا رہے ہیں تا کہ ان میں اقوام کی تعلیم اور صحت عامہ جیسے شعبوں میں کی گئی سرمایہ کاری کو بھی شامل کیا جا سکے اور اسے اگلے بیس سالوں کے لیے امور ٹائز کیا جا سکے کیونکہ اتنے عرصے میں ایک بچے کو پرورش دے کر اسے ایک تندرست' تعلیم یافتہ اور نافع شہری میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔(8) لیکن ہمیں اس عمل کو تیز تر کرنے کے لیے جدوجہد کرنا ہوگی اور ہمیں اس بات کو بھی یقینی بنانا ہوگا کہ جب یہ تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں تو اس بلااجرت کام پر خصوصی توجہ دی جائے جسے خانگی معیشت میں اب بھی بنیادی طور پر خواتین ہی سرانجام دیتی ہیں۔

جیسا کہ ہم نے باب چہارم میں بھی بات کی' متعدد ممالک اس بلااجرت نگہداشتی کام کی قدر کا تعین کر چکے ہیں اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس قدر کا تعین اور اس کی تفویض بہت ضروری ہے۔ غیر سرکاری تنظیموں نے بھی نگہداشت کے خانگی کام کی معاشی قدر پر توجہ دینا شروع کر دی ہے۔ مثال کے طور پر ایک امریکی کمپنی نے یہ تخمینہ لگایا ہے کہ گھر پر رہ کر بچوں کی دیکھ بھال کرنے والے شخص کی سالانہ اجرت 134471 ڈالر بنتی ہے۔(9) ان معلومات کو ان معاشی پیمانوں سے مربوط کیا جانا چاہیے، جنھیں پالیسی ساز فیصلے کرتے وقت استعمال کرتے ہیں۔ ہم معاشیات دان ڈنکن آئرن مونگر کی تجویز کے مطابق خ گ پ اور خ ق پ کی جگہ خام معاشی پیداوار (خ م پ) کو دے کر ابتداء کر سکتے ہیں۔ یہ نیا پیمانہ دو برابر وزن کے اشاریوں پر مشتمل ہوگا۔ ایک خام بازاری پیداوار (خ ب پ) کا اشاریہ جو بازار کی طرف سے منڈی کی معیشت میں جمع کردہ قدر کو ماپتا ہے اور دوسرا خام خانگی پیداوار (خ خ پ) کا اشاریہ جو کہ بلامعاوضہ خانگی کام کی طرف سے معیشت میں شامل کردہ قدر کو ماپتا ہے۔ دونوں کا مجموعہ یعنی خ م پ ملکی و بین الاقوامی دونوں قسم کی معاشی پالیسیوں کی ایک صحیح سمت میں رہنمائی کر سکتا ہے۔(10)

لیکن نئی معاشی پیمائشیں متوجہ معاشی نظام کی محض ایک بنیاد ہے۔ حکومت اور کاروباری

عمائدین کو معاشی پالیسیوں اور وتیروں میں بھی تبدیلی لے کر آنا چاہیے تا کہ وہ توجہ ونگہداشت کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کریں۔

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ آئے ہیں' توجہ ونگہداشت جیسے بنیادی انسانی کام کی تنقیص قدر کے پیچھے وہ دوہرا معاشی معیار کارفرما ہے جو مرد اور مردانہ کو عورت اور نسوانی تصور کی جانے والی اشیاء سے برتر قرار دیتا ہے۔ تعین قدر کا یہ جنسی نظام معاشی ترجیحات پر براہ راست اثرانداز ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ بچوں کی مادی و جذباتی ضروریات کی دیکھ بھال جیسی ان سرگرمیوں کی سرپرستی کے لیے بہت کم رقوم مختص کی جاتی ہے کہ جو جو ہم سب کے بہتر معیار زندگی کی ضامن ہیں۔

بہت سی حکومتیں اسلحہ سازی اور جنگوں کے لیے بے حساب وسائل مختص کرتی ہیں مگر جب صحت' تعلیم' نگہداشت اطفال اور دیگر متوجہ سرگرمیوں کی بات آتی ہے تو حکمران جیبیں الٹ کے دکھا دیتے ہیں کہ باقی کچھ نہیں بچا۔ ہمیں ان جھوٹے دعووں کا توڑ انھیں یہ دکھا کر کرنا ہوگا کہ یہ پالیسیاں پیسے کا نہیں بلکہ اقدار کا مسئلہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق عراقی جنگ کی لاگت دو ٹریلین ڈالر تک جا سکتی ہے۔ اتنی رقم سے دنیا بھر میں تشدد و نفرت کی بجائے متوجہ تعلقات کی تعلیم دینے کے لیے مدارس قائم کیے جا سکتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ دنیا بھر سے بھوک کا خاتمہ اور سب کو علاج معالجہ فراہم کیا جا سکتا ہے۔(11)

ہمیں اس چیز کو یقینی بنانا ہوگا کہ پالیسی ساز معیاری نگہداشت اطفال پر زیادہ پیسہ خرچ کریں۔ ہم اس موقف کا کہ اس مد میں زیادہ پیسہ خرچ نہیں کیا جا سکتا، اس بارے میں اعداد وشمار دکھا کر توڑ کر سکتے ہیں کہ بچوں پر لگایا جانے والا سرمایہ کہیں نہیں جاتا بلکہ لاگت سے کہیں زیادہ مالی منافعہ لے کر آتا ہے۔ جیسا کہ باب سوم میں مذکور کینیڈین تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے آفاقی و معیاری نگہداشت اطفال پر سرمایہ کاری سے پورے 200 فیصد نفع ملتا ہے اور جو بے بہا انسانی فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ الگ ہیں۔ بچوں کی پرورش کے بارے میں تربیت' مع تنخواہ رخصت والدینی اور معیاری نگہداشت اطفال پر اٹھنے والی لاگت کو محض خرچ کے طور پر دیکھنے کی بجائے اسے مشینوں اور عمارتوں پر لگائے جانے والے سرمائے کی طرح امورٹائز کیا جانا چاہیے۔ ہمیں ارباب اختیار کو یہ دکھانا چاہیے کہ افرادی ترقی میں پیسہ لگانے کے کس قدر زبردست فوائد ہیں اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں کسی قدر زبردست خسارہ بھگتنا پڑتا ہے' علی

الخصوص جبکہ ہمارے قدم بعد الصنعتی معیشت میں داخل ہو چکے ہیں۔ زیادہ قابل، ہنرمند اور حساس کارکن معاشی پیداواریت میں اضافہ کرتے ہیں اور ان سے موصول ہونے والے ٹیکسوں سے حکومت معمر افراد کے لیے سوشل سیکیورٹی اور نگہداشت اطفال جیسے منصوبوں پر دل کھول کر پیسہ خرچ کر سکتی ہے۔ ہمیں ایک ایسی سیاسی تحریک بپا کرنی چاہیے جو پالیسی سازوں کو یہ تبدیلیاں عمل میں لانے پر آمادہ کرے...... یا پھر انھیں گھر جانے پر۔

ارباب اختیار کو معاشی پالیسی کے معاملے میں ایک نیا تناظر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر آج کے دور میں حکومتیں فوجیوں کو یہ تربیت دینے پر زور لگاتی ہیں کہ وہ قتل و غارت کیسے کریں اور پھر جزا کے طور پر انھیں پینشن بھی دیتی ہے اور اس پر بھی سرمایہ خرچ ہوتا ہے لیکن حکومت خواتین اور مردوں کو اپنے بچوں کی بہتر دیکھ بھال کے تربیت دینے اور اس دیکھ بھال کے صلے میں انھیں پینشنیں دینے پر پیسہ خرچ کرتی نظر نہیں آتی۔ سرکار کو اس رویے میں بدلاؤ پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انھیں کم از کم اس شرمناک صورتحال کا تو ضرور کچھ کرنا چاہیے کہ امریکہ جیسے متمول ملک میں معاشرے کا مفلس ترین طبقہ معمر خواتین پر مشتمل ہے۔

اس پر بھی مجھے معلوم ہے لوگ اعتراض کریں گے۔ کوئی کہے گا کہ ہم بچوں کی معیاری دیکھ بھال کے نتائج کو آنک نہیں سکتے۔ لیکن میں ایسے مہربانوں کو یہ باور کرانا چاہوں گا کہ فوجیوں کو دی جانے والی تنخواہوں اور پینشنوں کے لیے تو جنگی تربیت کے نتیجہ خیز ہونے کی کوئی شرط عائد نہیں کی جاتی اور جہاں تک ان مہربانوں کا تعلق ہے جو کہتے ہیں کہ بچوں کی اچھی دیکھ بھال کا تعین مشکل ہے، ہم انھیں منوں کے حساب سے جمع وہ سائنسی اعداد و شمار دکھا سکتے ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ کس قسم کی دیکھ بھال اچھی افرادی قوت کو فروغ دیتی ہے اور کس قسم کی نہیں۔ ہم انھیں سائنسی مطالعات و تحقیقات سے حاصل ہونے والے ایسے شواہد دکھا سکتے ہیں جو ہمیں بتلاتے ہیں کہ مار پیٹ جیسے روایتی طریقے کتنے غیر موثر ہیں اور وہ انسانی صلاحیتوں کو کس قدر نقصان پہنچاتے ہیں۔ (12)

یہاں اصل مسئلہ یہ ہے کہ طاقت کی تعریف کس طرح کی جاتی ہے اور اسے استعمال میں کیسے لایا جاتا ہے۔ آیا یہ طاقت دوسروں پر تسلط جمانے اور انھیں بے کس بنانے کے لیے بروئے کار لائی جاتی ہے یا کہ ان کی پرورش و پرداخت کرنے اور انھیں زیادہ بااختیار بنانے

کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ ہمارے پالیسی سازوں کو علی الخصوص ''مردوں'' سے منسوب تسلط وتسخیر کی نسبت علی الخصوص خواتین سے منسوب توجہ ونگہداشت کو کم دام دینے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ اب وقت اس بات کا ہے کہ اس غیر منطقی نظام اقدار کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشی و ماحولیاتی حوادث کا جائزہ لیا جائے اور اسے تقویت دینے والے قوانین اور معاشرتی ڈھانچوں کو بدلا جائے۔

سماجی کارکن کیا کر سکتے ہیں؟

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہماری بہت سی اقدار اور ڈھانچوں نے تسلطی روایات کے زیر اثر تشکیل پائی ہے۔ زرعی دور سے صنعتی دور میں آتے ہوئے ان میں سے بہت سی روایات کے خلاف اعتراضات اٹھائے گئے۔ تاہم ان سماجی تحاریک نے جو گزشتہ کئی سو سالوں سے ان روایات کے خلاف آواز اٹھاتی چلی آ رہی ہیں بنیادی طور پر تسلطی منارے کے کلس یعنی سیاست ومعاشیات کے اس نام نہاد پبلک شعبے پر توجہ دی ہے جس میں خواتین اور بچوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان بنیادوں میں کہ جن پر یہ منارہ استوار ہوتا ہے اور خود کی تعمیر نو کرتا ہے' میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی پیدا نہ کی جاسکی۔

ہماری بعد الصنعتی دور کی جانب پیش رفت میں عدم استحکام ہمیں تسلط سے مشارکت کی جانب منتقلی کے عمل کو جاری رکھنے کا ایک موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ تسلطی روایات کی بیخ کنی کے دوسرے مرحلے کا در وا کر رہا ہے یعنی ایک ایسے مرحلے کا کہ جس میں سرکاری ونجی دونوں شعبے آ جاتے ہیں۔ تسلط سے مشارکت کی طرف منتقلی کے لیے جدوجہد کرتے وقت ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ لازم نہیں کہ ہم کل کو ایک خالصتاً شراکتی معاشرے کی منزل تک رسائی حاصل کر لیں گے۔ ایک مثالی معاشرے کی آس لگانا غیر حقیقت پسندانہ بات ہو گی لیکن تسلطی نظام کی طرف حالیہ ایام میں دیکھی جانیوالی مراجعت کا رخ پلٹنے اور اس طرح کے دیگر رجعتی رجحانات کی مزید روک تھام کے لیے ہمیں ایسی بنیادیں تعمیر کرنا ہوں گی جن پر ایک زیادہ جمہوری' پرامن' معاشی طور پر منصفانہ اور ماحولیاتی اعتبار سے پائیدار دنیا استوار کی جا سکے۔ اس کے لیے ایک طاقتور ملکی اور بین الاقوامی تحریک کی ضرورت ہے تا کہ ان بنیادی روابط کو تبدیل کیا جا سکے جنھیں روایتی معاشی نظریے میں پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ ان روابط سے میری

MashalBooks.com

مراد مردوں اور عورتوں اور والدین اور بچوں کے درمیان کے بنیادی انسانی تعلقات ہیں۔اس کے لیے ضرور اس امر کی ہے کہ معاشی و معاشرتی انصاف کے لیے دنیا بھر میں مصروف عمل ہزاروں تنظیمیں ایک ایسے متحد لائحہ عمل کو سامنے رکھ کر کام کریں جو حقوق انسانی کے معاملے میں اکثریت یعنی عورتوں اور بچوں کے حقوق سے صرف نظر نہ کرے بلکہ اس پر خصوصی توجہ دے۔

خواتین کی معاشرے میں حیثیت کو بہتر بنانے والی پالیسیوں کے مطالبے کی ایک وجہ تو لامحالہ یہ ہے کہ ہماری اس دنیا کی نصف آبادی خواتین پر مشتمل ہے لیکن بات یہیں پر آ کے ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ معاشرے جن میں خواتین کو بہتر سماجی مقام دیا جاتا ہے اور انھیں حکومت میں مساوی نمائندگی دی جاتی ہے مثلاً سکنڈے نیویا ممالک کو ہی لے لیں' ان میں بلاامتیاز علاج معالجے' معیاری نگہداشت اطفال' بچوں کی بہتر دیکھ بھال کے لیے مناسب تعلیم و تربیت اور مع تنخواہ رخصت والدینی جیسی متوجہ پالیسیوں کو مالی ترجیح بھی زیادہ دی جاتی ہے۔خواتین کے بہتر سماجی مقام اور ان کے زیادہ بااختیار ہونے اور اعلیٰ معیار زندگی کی ضامن پالیسیوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

مرکز برائے مطالعات مشارکت کی 1995ء کی 89 ملکوں سے جمع کردہ معلومات پر مبنی وہ شماریاتی تحقیق جس کی بات ہم اس سے پیشتر بھی کر چکے ہیں' بھی یہی بتاتی ہے جب خواتین کو معاشرتی مرتبہ اور اختیارات زیادہ ملیں گے تو معاشرے میں عمومی معیار زندگی بھی بلند ہوگا لیکن اگر ان میں کمی آئے گی تو سب کا معیار زندگی بھی پستی کی طرف جائے گا۔(12)

ان شواہد کو جیسا کہ ہم نے باب چہارم میں بھی دیکھا 2000ء میں کیے جانے والے عالمی اقدار کے سروے سے بھی تقویت ملتی ہے۔دنیا کی 80 فیصد آبادی پر مشتمل 65 معاشروں سے جمع کردہ اعداد و شمار پر مبنی یہ سروے مرد و عورت کی برابری کی حوصلہ افزائی اور ایک زیادہ جمہوری' عادل اور خوشحال معاشرے کے درمیان ایک طاقتور تعلق کی نشاندہی کرتا ہے۔(14) ایک اور اہم چیز جو اس سروے سے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں جہاں جنسی عدل کی پذیرائی زیادہ ہوتی جاتی ہے وہاں وہاں بچوں کی جابرانہ انداز کی روایتی پرورش کا رجحان بھی کم ہوتا جاتا ہے اور بچوں اور عورتوں کے بارے میں رویوں میں ان تبدیلیوں کا باہمی اعتماد میں بہتری' بیرونی حاکمیت پر انحصار میں تخفیف' احساس خوشحالی میں اضافے اور خود اظہاری اقدار کے دیگر پہلوؤں سے بھی گہرا ربط ہے۔

2000ء میں کیا جانا والا عالمی اقدار کا یہ سروے اس تصور کو بھی تقویت دیتا ہے کہ تسلط مائل معاشرے ہمیں محرکاتی جذبے اور ترقی کی ایک نچلی سطح پر ہی جکڑے رکھتے ہیں۔ جیسا کہ انگل ہارٹ اور ان کے ساتھی لکھتے ہیں ''گزشتہ چند عشروں کے دوران دیکھی جانے والی سب سے اہم سماجی تبدیلی جنسی مناصب میں نظر آنے والا انقلاب ہے جس نے پورے ترقی یافتہ صنعتی معاشرے میں اکثریتی انسانی آبادی کی زندگیوں کو بدل کے رکھ دیا ہے۔(15)

اگر پالیسی ساز صحیح فیصلے کرنے کے لیے درکار اعداد وشمار کے خواہشمند ہیں۔ تو جیسا کہ اس جیسے مطالعات ظاہر کرتے ہیں ایک gender - specific approach اپنانا ضروری ہے۔ یہ اندازِ فکر ترقی پذیر دنیا میں دائمی بھوک اور ننگ کے خاتمے کی پالیسیوں کے لیے گہرے مضمرات کا حامل ہے جیسا کہ این کرنٹڈن نے بھی لکھا ہے افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ سے لے کر جزائر غرب الہند اور برصغیر پاک و ہند میں کام کرنے والے سب محققین کے سامنے یہ بات آئی ہے کہ ماؤں کے تعلیم یافتہ ہونے اور خاندانی آمدن پر ان کا کچھ نہ کچھ اختیار ہونے کی صورت میں ان کے بچے زیادہ تندرست ہوتے ہیں اور وہ پڑھائی میں زیادہ آگے تک جاتے ہیں۔(16) ہمارے اس سیارے کے مستقبل کے لیے درد رکھنے والے خواتین وحضرات سے وقت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ایک ایسی عالمگیر تحریک بپا کریں جس سے ایسے رسوم وقوانین کو تبدیل کیا جا سکے کہ جو افریقہ، جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ جیسے بڑے مناطق میں خواتین کو طبی سہولیات، تعلیم اور حق ملکیت سے محروم رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔(17) ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم عوام اور حکام کو خانگی معاشی تعلقات پر کیے گئے ان مطالعات سے آگاہ کریں جن کا جائزہ ہم نے باب ششم میں لیا تھا اور جو ہمیں بتاتے ہیں کہ دنیا کے بہت سے خطوں میں بچوں کی ضروریات پر مرد عورتوں کی نسبت اپنی آمدنی کا کم حصہ خرچ کرتے ہیں۔(18)

اس تحریک کا سب سے بڑا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ کاروباری پالیسیوں کی توضیع و تشکیل میں خواتین کو پوری دنیا میں مساوی کردار ادا کرنے کا موقع دیا جائے۔ جیسا کہ سکینڈے نیویا کے ممالک کی معاشرت کے جائزے سے پتہ چلتا ہے، جیسے جیسے خواتین معاشرے میں زیادہ مرتبوں پر فائز ہوتی جاتی ہیں اور ان کے ہاتھ میں زیادہ اختیارات آتے چلے جاتے ہیں ویسے ویسے توجہ و صلح جوئی جیسے بالخصوص خواتین سے منسوب اوصاف کو بھی معاشرے میں زیادہ ترجیح دی جانے لگتی ہے کیونکہ مردوں کے دل میں اب یہ اندیشہ نہیں رہتا

کہ ایسے ''غیر مردانہ'' وظائف اختیار کر کے ان کی عزت یا مرتبے پر کوئی حرف آئے گا۔ ہم اس وقت تک نمائندہ جمہوریت کی بات نہیں کر سکتے جب تلک کہ خواتین کو زیادہ سیاسی عہدے اوور اختیارات نہیں دے دیے جاتے۔(19) اور نہ ہی اس وقت تک ہم آبادی میں اضافے کو روک سکتے ہیں جب تک کہ ہم عورت کو تولیدی آزادی، تعلیم اور مساوی حقوق سے بہرہ ور نہیں کر دیتے اور اس وقت تک ہم غربت کے خاتمے کی توقع بھی نہیں کر سکتے جب تک کہ ہم اس بات پر غور نہیں کرتے کہ دنیا کے غریبوں کا اکثر حصہ عورتوں اور بچوں پر مشتمل ہے۔

میں اس بات کا ایک بار پھر اعادہ کرنا چاہوں گی کہ اس سب کا مطلب مردوں کو مورد الزام ٹھہرانا نہیں ہے۔ مردوں اور عورتوں دونوں کو تسلطی روایات کو تسلیم کرنا اور ان کا اطلاق کرنا سکھلایا گیا ہے اور میں یہ بھی کہوں گی توجہ و نگہداشت جیسے باالخصوص نسوانی اوصاف عورتوں اور مردوں دونوں میں پائے جاتے ہیں عین اسی طرح جیسے کہ باالخصوص مردانہ تصور کیے جانے والے بعض اوصاف خواتین میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں لیکن ایک زیادہ عادل اور موثر معاشی نظام کی جانب پیش رفت کے لیے پوری دنیا کے سماجی کارکنوں کو اس بات کو یقینی بنانے کے لیے جدوجہد کرنا ہو گی کہ بچوں اور عورتوں سے حقوق انسانی کے آفاقی معیارات کے مطابق برتاؤ کیا جائے۔ جیسا کہ بچوں کے مشہور شاعر رافی کا کہنا ہے ہمیں ایک ایسے معاشرے کو وجود میں لانے کے لیے کوشش کرنی چاہیے کہ جو اپنے کمزور ترین ارکان یعنی بچوں کو عزت و احترام دے۔(20) اس کا مطلب ہے کہ بچوں اور عورتوں کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے والے قوانین اور وتیروں کو اب مزید روایتی یا اخلاقی اعتبار سے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کثیر الثقافتیت، رواداری اور ثقافتی حساسیت کو خاندان اور دیگر قریبی روابط میں ظلم، زیادتی، تشدد اور ناانصافی کا جواز بنانے کے لیے استعمال نہیں کیا جانا چاہیے گرچہ فی زمانہ یہی ہو رہا ہے۔(21)

المختصر بچوں اور خواتین کے حقوق کا احترام ایک زیادہ عادل، مستحکم اور خوشحال مستقبل کے لیے شرط اولین کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا بہتر مستقبل تعمیر کر لینا ہی کافی نہیں لیکن اس کے بغیر تو ہم اس بنیاد کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ جس پر کسی مستقبل کو استوار کیا جا سکے۔

MashalBooks.com

آبادی میں اضافہ خواتین کا مقام اور متوجہ پالیسیاں:

آبادی میں اضافے کو روکنے کے لیے خواتین کو معاشرے میں بہتر مقام دینا لازمی ہے۔ اگر مردانہ تسلط میں جکڑے کسی معاشرے میں کسی عورت کے بیٹے نہیں ہیں تو اسے بیٹا ہونے تک بچے جنتے رہنا پڑتا ہے۔ لہٰذا ایسی بعض خواتین شباب میں ہی درجن درجن بچوں کی مائیں بن جاتی ہیں اور باوجود پے دَر پے زچگیوں سے صحت کا کباڑہ ہونے کہ وہ تولیدی عمل رکنے سے خائف ہوتی ہے۔

جنسی مساوات کی طرف گامزن ممالک میں شرح پیدائش نسبتاً بہت کم ہے۔ (22) بلکہ بعض کثیر آبادی والے ملکوں کے اندر بھی ہمیں ایسے علاقہ جات نظر آتے ہیں جہاں خواتین کا سماجی مقام بہتر ہونے کی وجہ سے آبادی کی شرح نمو اسی ملک کے بقیہ علاقوں سے کافی کم ہے۔ اس سلسلے میں ہم بھارت جس کی قومی شرح پیدائش کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کی ریاست کیرالہ کی مثال پیش کر سکتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بچوں کی دیکھ بھال کی تعلیم، رخصت والدینی اور نگہداشت جیسی متوجہ پالیسیوں سے خصوصاً ایک ایسے وقت میں کہ جب زیادہ افرادی قوت کی بھی ضرورت نہیں رہی آبادی میں بے تحاشا اضافہ ہوگا لیکن ارضی حقیقت یہ ہے کہ ایسی پالیسیوں سے کسی بھی جگہ شرح پیدائش میں اضافہ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس سامنے آنے والی بات یہ ہے کہ بچوں کی نگہداشت کی تربیت اور جنسی تعلیم سے کم عمر کی زچگیوں میں کمی واقع ہوتی ہے۔ بہت سے غریب اور کثرت آبادی کا شکار ملکوں میں بلند شرح پیدائش کے پیچھے جو اصل عوامل کارفرما ہیں وہ خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں علم کی کمی، مانع حمل ادویہ کی عدم دستیابی اور عورتوں کی محکومیت ہیں۔

تبدیلی کی حرکیات:

ایک ایسی دنیا کا تصور کریں کہ جہاں معاشی نظام ایسے ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہیے۔ میرا مطلب ہے کہ جہاں وہ انسانی ضرورتوں اور امنگوں کو پورا کرنے کے وسیلوں کا کام دیتے ہوں لورالی ایلبن جن کا شمار انٹرایکٹو ڈیزائن کے شعبے کو شروع کرنے والوں میں ہوتا ہے، کا کہنا ہے کہ ڈیزائن کا پہلا اصول مطلوبہ نتائج کا تخیل ہے اور جب آپ مطلوبہ عزائم و روابط کو ڈیزائن کے قالب میں لانے کی کوشش کرتے ہیں تو بہت گہری تبدیلیاں بھی ممکن ہو جاتی ہیں۔ (23)

ایلبن ان تبدیلیوں کو پانی کی سطح پر پیدا ہونے والے دائروں سے تشبیہ دیتی ہیں۔ ایک مرتبہ جب ان آبی دائروں کی ابتداء ہو جائے تو پھر یہ بیرونی جانب پھیلتے چلے جاتے ہیں اور لہروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جب یہ لہریں جمع ہوتی ہیں تو بڑی امواج کی شکل میں ڈھل جاتی ہیں اور جب ان امواج کا زور بڑھتا ہے تو نتیجے کے طور پر سارے نظام میں تبدیلی رونما ہونے لگتی ہے۔

متوجہ انقلاب کی مثال بھی اس بحری تغیر جیسی ہے۔ یہ انقلاب اہم ترین انسانی کام یعنی توجہ ونگہداشت کو قدر و قعت دینے سے پیدا ہونے والے حلقوں کے مجموعی اثر سے واقع ہوگا۔

جب اندرون خانہ توجہ ونگہداشت کی معاشی اہمیت کو وقعت دی جائے گی تو لچک دار اوقات کار اور اشتراک ملازمت (Job Sharing) جیسے دفتری ضوابط اور دیگر شراکتی معاشی ایجادات کو بھی رواج ملے گا۔ جب اس نوع کے کام کی قدر بڑھے گی تو زیادہ مرد اس کی طرف راغب ہوں گے اور مرد اور عورتیں رسمی افرادی قوت میں زیادہ مساوی بنیادوں پر شریک ہوں گے اور اندرون خانہ بھی انھیں ایک جیسے مواقع اور ذمہ داریاں ملیں گی۔ مدارس بہتر پرورش کی تعلیم دیں گے اور حساس ذاتی تعلقات سکھلائیں گے، حکومتیں بلاتفریق ہر کسی کے لیے علاج معالجۂ معیاری نگہداشت اطفال اور ماں اور باپ دونوں کے لیے رخصت والدینی کے لیے مالی امداد مہیا کریں گی تاکہ وہ اپنی اور اپنے گھربار کی بہتر دیکھ بھال کر سکیں۔ ان اقدامات کے نتیجے میں لوگ باگ گھروں میں بھی خوش باش اور مسرور و مطمئن نظر آئیں گے اور کارخانوں اور دفاتر میں بھی۔ یہ سب بچوں کی بہتر نگہداشت کو فروغ دے گا اور ایک صحت مند اور منصفانہ معیشت کے لیے درکار بڑھیا افرادی سرمائے کی پیدائش میں مدد دے گا۔

جیسے افرادی سرمائے کے عمومی معیار میں بہتری آتی ہے، زیادہ قابل ہنرمند اور متوجہ کارکن ایک زیادہ پیداواری معیشت میں اپنا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ زیادہ پیداواری معیشت پھر توجہ ونگہداشت کی حوصلہ افزائی کرنے والی حکومتی اور کاروباری پالیسیوں کے لیے زیادہ پیسہ مہیا کرتی ہے اور اس سے سب کے معیار زندگی میں بہتری آتی چلی جاتی ہے۔ مناسب مالی پینشنوں کے طفیل معمر افراد کی دیکھ بھال بہتر ہوتی ہے۔ اس بہتر دیکھ بھال میں وہ سرکاری وکاروباری پالیسیاں بھی اپنا کردار ادا کرتی ہیں جو ان کی دیکھ بھال کرنے والوں کی مناسب سرپرستی کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں بچوں کی دیکھ بھال پر عمریں صرف کرنے والی خواتین کو

بھی بڑھاپے میں جا کر فلاکت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ رضا کارانہ معیشت میں کارکنوں کو نقل وحمل کے سلسلے میں مالی امداد فراہم کی جاتی ہے اور بلا معاوضہ خدمات سرانجام دینے کے صلے میں انعام واکرام سے بھی نوازا جاتا ہے۔

ادلے بدلے کے نظام (Barter Systems) تبادلہ خدمات میں نگہداشتی کام کو زیادہ مول دیتے ہیں۔ جب نگہداشتی کام کو زیادہ قدر ملتی ہے تو انسانی تعلقات میں بھی ہر سطح پر بہتری آنے لگتی ہے۔ معاشی ومعاشرتی عدل کے لیے جدوجہد کرنے والے کارکنوں کو سبکی اور باتیں سننے کی بجائے انعام واکرام اور احترام حاصل ہونے لگتا ہے۔

بازاری معیشت میں رفتہ رفتہ تبدیلی آنے لگتی ہے۔ کاروباری ادارے متوجہ رویوں کو نوازنے لگتے ہیں۔ انھیں اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ جب ملازمین کو یہ احساس ملے کہ ان کا خیال رکھا جاتا ہے تو ان کی پیداواریت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اگر گاہکوں کا خیال رکھا جائے تو پھر وہ اور کہیں نہیں جاتے۔ منڈی کے اصول وضوابط اجارہ داریوں کی روک تھام کرتے ہیں اور کاروباری اداروں کو اس چیز کا پابند بناتے ہیں کہ وہ بے حس پالیسیوں کا خمیازہ خود بھگتیں اور اس کا بھگتان سماج کو نہ بھگتنا پڑے۔ یہ اصول وضوابط اداروں کو ملازمین' حصص خریدنے والوں' خاندانوں' اہالیان علاقہ اور اس سیارے کے لیے ایک زیادہ حساس اور متوجہ رویہ اختیار کرنے پر بھی ابھارتے ہیں۔

جب توجہ ونگہداشت کی سرپرستی کو صحیح اور ضروری سرمایہ کاری کے طور پر تسلیم کر لیا جاتا ہے تو سرکاری پالیسیاں بھی تبدیلی ہو جاتی ہیں۔ وہ مسائل جو کہ لاینحل محسوس ہو رہے ہوتے ہیں چھٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ توجہ ونگہداشت کی سرپرستی میں اضافہ ہوتا ہے تو بھوک اور ننگ کے مسائل بھی رفو ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ مالی وظائف اور توجہ ونگہداشت کے لیے دیگر انعامات کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ خواتین کا مقام بہتر ہوتا ہے اور اس کے ساتھ عمومی معیار زندگی میں بھی بہتری آنے لگتی ہے۔

یہ دائرے ہر معاشی شعبے کو متاثر کرتے ہیں جب توجہ ونگہداشت کا دام چڑھتا ہے تو غیر قانونی معیشت سکڑنے لگتی ہے۔ جب ہماری مادی' جذباتی اور روحانی ضروریات پوری ہونے لگتی ہیں تو منشیات' ناجائز اسلحے' جنسی غلامی اور عصمت فروشی اور دیگر مجرمانہ معاشی سرگرمیوں کا بازار مندا پڑنے لگتا ہے۔ اس سے پھر آگے کئی اور طرح کے معاشی ومعاشرتی فوائد بھی حاصل ہونے لگتے ہیں۔

دیوانی وفوجداری عدالتوں اور جیل خانہ جات کی کمی سے ہونے والی بچت سے مالی روانی میں اضافہ ہوتا ہے اور بے حس پالیسیوں اور وتیروں کے طفیل ہونے والی تعلیمی کمتری، دفتری غیر حاضری، دہشت گردی اور جنگ وجدل جیسی چیزوں پر اٹھنے والے سماجی اخراجات میں کمی آ جاتی ہے۔

جب اندرون خانہ ممد حیات وظائف کی قدرافزائی ہوتی ہے تو فطرت کے ممد حیات وظائف کی قدر بھی بلند ہو جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ اس سیارے پر زندگی بسر کرنے والی دوسری مخلوقات کی توقیر میں اضافہ ہوتا ہے اور انواع کے پے در پے نابود ہونے کا سلسلہ رک جاتا ہے۔ گھر صاف رکھنے کے عمل کو کوئی بھی حقارت سے ''زنانہ'' کام کہہ کر نہیں پکارتا لہٰذا قدرتی ماحول کو صاف اور پاکیزہ رکھنے کے رجحان کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ لوگ مادرارض کی نگہداشت کو مالی خسارے سے تعبیر کرنا بند کر دیتے ہیں اور اسے معاشی صحت اور طویل المیعادی استحکام کے لیے ضروری سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔

جب خاندانی، تعلیمی، کاروباری اور حکومتی ڈھانچے تسلطی درجہ بندیوں سے تکمیلی درجہ بندیوں کی طرف آتے ہیں تو پھر جمہوریت بھی لفظوں سے نکل کر حقیقت کا روپ دھارنے لگتی ہے۔ اعتماد، وقار اور تخلیق واختراع کو فروغ ملتا ہے۔ ہمارے حیات افروز نظاموں کو آلودہ اور پامال کرنے والی حرفتوں کی جگہ نئی حرفتیں آنے لگتی ہیں۔ جب خواتین کو تولیدی آزادی، تعلیم اور مساوی حقوق ملتے ہیں تو آبادی کی شرح نمو بھی تھم جاتی ہے۔ مایہ داروں اور بے مایہ لوگوں کے مابین فاصلے کم ہونے لگتے ہیں ایسے کنگال کہ جنھیں دو وقت کی روٹی، تن ڈھانپنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو چھت بھی میسر نہ ہو نظر آنا بند ہو جاتے ہیں اور ایسے قارونوں کی تعداد بھی کم ہو جاتی ہے جو اپنی انصاف ومعنویت اور متوجہ تعلقات کی کمی پوری کرنے کے لیے زراندوزی پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں اور شب و روز اپنی تجوریاں بھرنے میں لگے رہتے ہیں، بجائے ایسی حرفتوں میں وسائل جھونکنے کے کہ جو زندگی لیتی ہیں، معاشرے ایسی حرفتوں پر پیسہ لگانے لگتے ہیں کہ جو زندگی کو تقویت اور جلا بخشتے ہیں۔

الغرض حلقہ بہ حلقہ ایک ایسی متوجہ معاشیات کی نمود ہونے لگتی ہے کہ جس سے انسانی احتیاجات کی تکمیل ہوتی ہے اور زیادہ سے زیادہ انسانی ترقی کے عمل کو فروغ ملتا ہے۔ افراد اور خاندان ایک دوسرے کے لیے اور ہمارے اس قدرتی ماحول کے لیے زیادہ حساس اور ذمہ

دارانہ رویوں کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔معاشی پالیسیاں سماجی پالیسیوں سے ہمقدم ہو کر سارے معاشرے میں صحت منداور منصفانہ تعلقات کوفروغ دینی لگتی ہیں۔

اخلاقیات جبر وتسلط کا آلہ کار بننے کے شفقت واحساس کا وسیلہ بن جاتی ہے۔روحانیت ایک جابر معاشرت میں مضمر دکھ اور کرب سے فرار کی راہ بننے کے بجائے اسی دنیا میں ایک بہتر زندگی کوفروغ دینے کی ایک عملی صورت بن جاتی ہے۔محبت ایک ایسی دنیا کی تخلیق کے عزم کی شکل اختیار کر لیتی ہے کہ جہاں ہر بچے میں پوشیدہ حسن اور تحیر کولباس حقیقت دیا جا سکے۔

میں مانتی ہوں ان تبدیلیوں کوعمل میں لانا آسان نہیں اور نہ ہی پلک جھپکنے میں یہ سب کچھ ہو جائے گا لیکن ہم میں سے ہر شخص، ہر مرد و زن ان حلقوں کی سلسلہ جنبانی تو کر سکتا ہے کہ جن کا زور کل کو جمع ہو کر ایک متوجہ انقلاب میں ڈھلے گا۔ایک ایسے انقلاب میں کہ جس سے ہماری زندگیوں میں بدلاؤ آئے گا اور ہماری اس دنیا کی کایا کلپ ہو سکے گی۔

ہم کیا کر سکتے ہیں؟

سیدھی سی بات ہے کہ ہمیں سب سے پہلے اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگوں کی اس انقلاب کے لیے حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ہم متوجہ اقدار کی پشت پناہی کرنے والے سیاسی قائدین کومنتخب کر کے سیاسی منظرنامہ تبدیل کر سکتے ہیں اور ہمیں یہ تبدیلی لانے کے لیے پورے دل و جان سے کوشش کرنی چاہیے۔ہم یہ کام مذکورہ اوصاف کے حامل سیاسی قائدین کے حق میں ووٹ ڈال کر،ان کی مالی معاونت کر کے اور ان کی انتخابی مہم میں حصہ لے کر کر سکتے ہیں۔ہم خود بھی متوجہ پالیسیوں کے علمبردار بن کر انتخابات لڑ سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں ہمیں ملکی و بین الاقوامی قائدین کومتوجہ پالیسیوں کے فوائد سے آگاہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ان قائدین سے جو کہ پہلے ہی اقتدار کی مسند پر متمکن ہیں زیادہ متوجہ معاشی اقدار کے نفاذ کی فرمائش کرنی چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا ہماری سیاسی جماعت متوجہ معاشی نظام کو اپنے منشور میں جگہ دیتی ہے یا کہ نہیں۔

مگر ہمیں اپنے ملکی و بین الاقوامی لیڈران کے انتظار میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔ہم میں سے ہر ایک اپنے تخیل کو استعمال کر کے اور انسانی شعور، وتیروں اور پالیسیوں میں تبدیلی کے لیے جدوجہد کر کے خود بھی ایک لیڈر بن سکتا ہے۔ہم اس انقلاب کو

معاشی انصاف، ماحولیاتی تحفظ اور حقوق انسانی کے لیے عالمی سطح پر آواز بلند کر کے ہی شرمندہ تعبیر کر سکتے ہیں۔

ہم اس سعی کی ابتداء ایک بہت سادہ اور معمولی کام یعنی معاشیات کے بارے میں گفتگو تبدیلی لا کر کر سکتے ہیں۔ تمام جدید شراکتی تحاریک نے معیاراتی آدرش تبدیل معاشرتی مبحث کی مصطلحات میں تبدیلی پیدا کر کے کیے ہیں۔ عین اس طرح کہ جیسے ''آزادی'' اور ''جمہوریت'' جیسے الفاظ نے جدید سیاسی سانچوں کو متعارف کرانے میں مدد دی، ہم معاشی لغت میں تبدیلی لا کے جدید معاشی سانچے متعارف کرانے میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

معاشیاتی بحث میں توسیع کے ضمن میں ہم پہلا قدم جو لے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس میں ''احساس'' کا لفظ بھی شامل کر لیں۔ دیکھنے میں لگتی یہ بہت چھوٹی سی بات ہے لیکن یہ اس جدید معاشی نظام کی جانب بہت اہم قدم ہو گا کہ جو ہمیں حقیقی معانوں میں خوش وخرم اور صحت مند بنانے اور رکھنے والی چیز کو قدر ومنزلت دیتا ہے اور ہمیں اقتصادی فراوانی اور ماحولیاتی سلامتی کی طرف لے جاتا ہے۔ (24)

ہم میں سے ہر شخص خواہ وہ کسی بھی عہدے یا مرتبے پر ہے کم از کم اتنا تو کر سکتا ہے کہ وہ گھر، بازار، دفتر، چوپال، سکول، دانش گاہ یا کسی میلے یا ٹھیلے میں لوگوں سے ملتے وقت توجہ و احساس کے محاورے کو بھی اپنی بات چیت میں شامل کر لے۔ مثلاً اساتذہ ووالدین کے اجلاس میں یا ہم کسی اور ایسی جگہ اکٹھے ہوتے ہیں تو ہم وہاں حساس پالیسیوں کی بات چھیڑ سکتے ہیں اور انھیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ خاندانوں اور پوری معیشت کے لیے کسی قدر منافعہ بخش اور فیض رساں ہیں۔ اس طرح ہم دیگر علمی وسماجی مواقع پر بھی دوستوں اور ملنے والوں سے یہ بات کر سکتے ہیں کہ متوجہ معاشیات کی ہماری اقتصاد، ہمارے قدرتی ماحول اور ہماری زندگیوں کے لیے کیا اہمیت ہے۔ ہم اخبارات و جرائد میں اس بابت خطوط لکھ سکتے ہیں اور انٹرنیٹ پر ویب سائٹیں اور بلاک بنا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم مختلف مذاکروں اور مجلسوں میں لوگوں کو جانکاری دینے کے لیے متوجہ معاشیات پر لیکچر بھی دے سکتے ہیں۔

معاشیات کیا ہے اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں مبحث کو بدلنے کے لیے تجارتی و معاشی درس گاہیں بہترین جگہیں ہیں۔ (25) یہی وجہ ہے کہ میں مرکز برائے مطالعات مشارکت کے ذریعے متوجہ معاشیات کے لیے ایک ایسی انجمن تشکیل دینی کی کوشش کر رہی

ہوں کہ جو جدید معاشی ایجادات کی تخلیق ونفاذ کے لیے مذاکرے، کانفرنسیں اور قیادتی تربیتی پروگرام منعقد کرے۔(26)

معاشیات کے متعلق گفتگو کو تبدیل کرتے وقت ہم باب سوم میں دیے گئے اس مواد سے اکتساب کر سکتے ہیں جو ظاہر کرتا ہے کہ متوجہ پالیسیوں پر عمل پیرا کاروباری ادارے عام فرموں کی نسبت بہت زیادہ کامیابی سے کام کر رہے ہیں۔ ہم کاروباری ناظمین کو وہاں درج اعداد وشمار بھی دکھا سکتے ہیں۔ ہم میں سے جو افراد ناظمین ہیں ایسے وظائف کے لیے ترغیبات پیش کر سکتے ہیں کہ جن سے لوگوں اور فطرت کی دیکھ بھال کے رجحان میں اضافہ ہو۔ اس سے ایک قدم اور آگے جا کر ہم یہ تجویز بھی پیش کر سکتے ہیں کہ کاروباری اداروں کے دساتیر العمل میں متوجہ پالیسیوں اور رویوں کے معیارات بھی شامل کیے جائیں۔ ہم یہ تجویز بھی پیش کر سکتے ہیں کہ چیمبر آف کامرس اور دیگر تجارتی اداروں کی رکنیت کو ان معیارات کی تعمیل سے مشروط کیا جائے۔

خاندان دوست سیاسی ومعاشی پالیسیوں کے فروغ کے لیے وسائل:

ایک صحت مند، منصفانہ اور پیداواری معاشرے کے لیے درکار عائلی پالیسیوں اور وتیروں کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کو چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

☆ 'قومی شراکت برائے خواتین و خاندان' 35 برس سے خاندان دوست قوانین متعارف اور ان کی منظوری کے لیے کوششیں کرتی چلی آ رہی ہے۔ ان میں ان قوانین سے لے کر کہ جو بڑے کاروباری اداروں کو اس بات کا پابند کرتے ہیں کہ وہ بعض عائلی اور طبی رخصت کی سہولت مہیا کریں، حمل کی وجہ سے روا رکھے جانے والے امتیاز کی ممانعت کے قوانین تک شامل ہیں۔

دیکھیے:- www.nationalpartenership.org/

☆ کام اور عائلی حقوق کے قانون جس میں بچوں اور معمر افراد کی معیاری اور رعایتی نگہداشت، کل وقت اور جز وقتی ملازمین کے لیے مع مشاہرہ سالانہ عائلی رخصت، سب کے لیے مناسب بیمہ صحت اور کم از کم اجرت بھی آ جاتی ہے، کے لیے دیکھیے:

www.takecarenet.org/WorkFamilyBOR.aspx.

☆ MOTHERS Economic Empowerment Agenda میں اہل

وعیال کی دیکھ بھال کرنے والے کسی بھی شخص کے لیے ٹیبر یزافنیسی ایلو کا تجویز کردہ قابل واپسی caregiver Tax Credit ماؤں اور کنبے کی بلامعاوضہ دیکھ بھال کرنے والے دیگر افراد کے لیے Secial Security Credit اندرون خانہ بلااجرت کی جانے والی محنت کی خ ق پ میں شمولیت، تنخواہ دار نگہداشتی کارکنوں اور چھوٹے بچوں کے معلمین کی قابل گزارہ اجرتیں اور بہتر پیشہ وارانہ تربیت شامل ہے۔ دیکھیے:

www.motherssoughttohaveequzlrights.org/cando/meea.html.

☆ Mom's Rising کا تیارکردہ Motherhood Manifesto بھی اسی نوع کے اقدامات تجویز کرتا ہے۔ دیکھیے:

www.momsrising.org/-

☆ Institute for Women's Policy Research نے خاندان دوست پالیسیوں کے فوائد پر خواتین اور سماجی انصاف پر خاص توجہ دیتے ہوئے تحقیق کی ہے۔ دیکھیے: www.iwpr.org/index.cfm.

☆ مرکز برائے مطالعات مشارکت کے عائلی پالیسی کے ایجنڈے میں مرقومہ بالا بہت سی تجاویز شامل ہیں۔ دیکھیے: ww.partnershipway.org۔ اس ایجنڈے میں درج ذیل چیزیں شامل ہیں:

حقوق اطفال کا بل جس میں نگہداشت، رہائش، غذا، تعلیم، علاج، تشدد سے نجات اور صاف ماحول شامل ہے۔

مشارکت پر مبنی متوجہ عائلی اقدار، احترام باہمی، عدم تشدد اور توجہ و نگہداشت کی قدرافزائی۔

صحت مند اور خوشحال خاندانوں اور ایک صحت مند، خوشحال بعدالصنعتی معیشت کے لیے درکار خاندان دوست حکومتیں اور کارخانے۔

☆ روحانی اتحاد برائے انسداد تشدد قرابت داروں نامی تنظیم نے خود کو خاندان اور دیگر قریبی تعلقات میں قوت کے استعمال کو روکنے کے لیے وقف کیا ہے۔ دیکھیے: www.saiv.net

☆ بچوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والے بین الاقوامی شہرت کے حامل شاعر رافی نے احترام اطفال سے متعلق ایک معاہدے کی تجویز پیش کی ہے۔ دیکھیے: www.raffinews.com/node/17

ان موضوعات پر تحریر کیے جانے والے بعض اخباری مضامین اور کتابیں درج ذیل ہیں:

MashalBooks.com

ہم یہ دکھا سکتے ہیں کہ مروجہ معاشی پیمانے حقیقت کو کس طرح مسخ کرتے ہیں اور ان متبادلات کی نشاندہی بھی کر سکتے ہیں کہ جو متوجہ پالیسیوں اور وتیروں کے فوائد کی صحیح عکاسی کرتے ہیں اور بے حس پالیسیوں اور وتیروں کے نتیجے میں ہمیں پہنچنے والے نقصان کا صحیح جائزہ پیش کرتے ہیں۔ ہم لوگوں سے ملازمتوں کی کم اجرتی ممالک کو برآمد اور خودکار آلات سے پیدا ہونے والی بیروزگاری کے بارے میں بات کر سکتے ہیں اور انھیں باور کرا سکتے ہیں کہ ان دونوں عوامل کی وجہ سے متوجہ معاشیات کی طرف رخ کرنے کی ضرورت میں اور بھی زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔

ہمیں ان کمپنیوں کی مصنوعات خریدنے کو ترجیح دینی چاہیے جن کی پالیسیوں میں ہمیں ماحول' صارف اور ملازمین کے بارے میں کوئی احساس نام کی چیز نظر آتی ہے اور ان سیاسی امیدواروں کے حق میں ووٹ دینا چاہیے جو ایسی پالیسیوں کو آگے بڑھانے والے قوانین کی حمایت کرتے ہوں اور اگر ہم خود حکومت کا حصہ ہیں تو ایسی متوجہ پالیسیاں ہم خود بھی متعارف کرا سکتے ہیں۔ جو خواتین و حضرات امریکہ میں مقیم ہیں وہ لوگوں کو اس امر سے آگاہ کر سکتے ہیں کہ دیگر اقوام کیا کر رہی ہیں اور صحت عامہ' نگہداشت اطفال' مع مشاہرہ رخصت والدینی اور دیگر متوجہ معاشی ایجادات پر پیسہ صرف کرنے سے کس قدر بڑھیا افرادی سرمایہ پیدا ہوتا ہے اور اس سے عام زندگی کے سکون و مسرت میں کتنا اضافہ ہوتی ہے۔ ہم لوگوں کو یہ بھی سمجھا سکتے ہیں کہ وہ لوگوں پر سرمایہ کاری کے سرکاری پروگراموں کو محض خیرات تصور نہ کریں بلکہ اس طرح کے پروگرام ہم سب کے لیے ایک زیادہ محفوظ' پرآہنگ اور خوشحال دنیا کی بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ ہم ملازمین اور ان کے کنبوں کے حقوق کے متعلق پیش کیے گئے منصوبے کے سلسلے میں مرکز برائے مطالعات مشارکت کی اعانت کر سکتے ہیں۔

ہم اپنے دوستوں اور ملنے والوں کو اس بات سے آگاہ کر سکتے ہیں کہ عوامی تشہیری مہمیں ہمیں کسی طرح غلط سمت میں ڈالتی ہیں اور ہمارے ذہن میں یہ بات ڈالنے کی کوشش کرتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ مادی اشیاء جمع کر لینا ہی حقیقی خوشی اور اطمینان کی ضمانت ہے اور ہم انھیں بتا سکتے ہیں کہ اس نوع کی غلط ذہنیتیں تسلطی معاشیات کی پیدا کردہ ہیں۔ ہم انھیں بتا سکتے ہیں کہ وسائل کی غلط تقسیم' افرادی سرمائے پر پیسہ نہ لگانے اور دیگر تسلطی معاشی وتیروں سے نہ صرف یہ کہ معاشی قلت پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ جذباتی و روحانی قلت کا بھی باعث بنتے ہیں۔

ہم خود کو اور دوسروں کو اس بات کی یاد دھانی کرا سکتے ہیں کہ چونکہ جائز اور ناجائز کا سبق لوگ اپنے بچپن میں سیکھتے ہیں' ہمیں جمہوری و منصفانہ تعلقات کو خاندان کی سطح پر فروغ دینا ہو گا۔ (27) ہم بچوں اور عورتوں پر تشدد کی روایات کے خاتمے کے لیے کام کر سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس جدوجہد میں شرکت کی دعوت دے سکتے ہیں۔ ہمیں یہ سب ان لاکھوں انسانوں کی خاطر کرنا ہو گا کہ جو جبر و تشدد کے بھاری بوجھ تلے دبے شدت کرب سے کراہ رہے ہیں۔ صرف ان کی خاطر ہی نہیں بلکہ ہم سبکی خاطر کیونکہ اگر خاندان میں تشدد کا دور دورہ ہو تو اس سے بچوں کو یہ تربیت ملتی ہے کہ وہ آگے جا کر سب تعلقات میں اپنی مرضی مسلط کرنے کے لیے تشدد سے کام لیں۔ (28) ہمیں یہ سب چیزیں ضرور کرنی ہیں اور ہم یہ سب کرنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔

ہمیں یہ نگہداشتی گن لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو سکھلانے چاہئیں اور فقط گھروں میں ہی نہیں بلکہ مدارس میں بھی ان کی تربیت دی جانی چاہیے اور میں ایک بار پھر کہوں گی کہ یہ کام کرنے کا ہے اور ہم یہ کر بھی سکتے ہیں۔ (29) ایک ایسے وقت میں کہ جب بیشتر ٹی وی پروگرام' فلمیں' جدید گانے اور وڈیو گیمز بچوں کو یہ ذہنیت پروان چڑھا رہے ہیں کہ بے حس' سفاک اور متشدد رویے بڑے مزے کی چیز ہیں' ہمیں ان کے اذہان کو یہ تعلیم دینا ہو گی کہ توجہ و احساس کی انسانی معاشرے کے لیے اور ان کے اپنے لیے کیا اہمیت اور قدر و قیمت ہے۔ یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ ہم ان کے سامنے خود کو بھی توجہ و خدمت کی مثال بنا کر پیش کریں اور اپنے عمل سے اپنے آدرشوں کی وضاحت کریں۔

ہماری ثقافت جبر و ناانصافی کو انسانی فطرت کا ایک جزو لاینفک بنا کر دکھاتی ہے لہٰذا یہ بات بھی بہت ضروری ہے کہ ہم بچوں اور بڑوں کے سامنے انسانی فطرت اور انسانی امکانات کی ایک مکمل اور زیادہ حقیقی حکایت پیش کریں تا کہ ان کا ذہن کسی غلط فہمی میں نہ رہے۔ اس کی وجہ بڑی سادہ اور غیر مبہم ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگ کسی چیز کے لیے تبھی کوشش کرتے ہیں کہ جب انھیں یہ باور آتا ہے کہ یہ ممکن ہے اور اگر ان کا ذہن کسی چیز کے بارے میں یہ ٹھان لے کہ یہ ممکن ہی نہیں تو وہ کچھ کرنا تو درکنار کچھ کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔

معاشیات اور انسانی ارتقاء:

ہم اپنی ثقافتوں کو اہم ترین انسانی تخلیقات قرار دے سکتے ہیں۔ ہم جو ثقافتیں تخلیق کرتے ہیں' وہی اس بات کا تعین کرتی ہیں کہ آیا ہم ایک دوسرے کو برچھیاں ماریں اور اپنے قدرتی ماحول کو تباہ کریں یا پھر پیار و محبت کو ترویج دیں اور ایک ایسی دنیا بنا کر اس میں رہیں کہ جس میں امن وسکون اور فراوانی ہو اور جو کل کو ہماری آئندہ نسلوں کے لیے بھی محفوظ رہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ وہ معاشی نظام جن کا تذکرہ ہم گزشتہ اوراق میں کرتے چلے آ رہے ہیں، ان ثقافتوں میں بہت کلیدی کردار سرانجام دیتے ہیں۔

میں نے زیرنظر تصنیف میں یہ موقف اختیار کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمیں ایک ایسی حساس معاشیات کی ضرورت ہے جو زیادہ آگہی وتخلیق اور توجہ واحساس کی سمت ہماری ارتقائی پیش رفت سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہو۔ میں جانتی ہوں کہ آج کے دور میں کسی ارتقائی سمت کی بات کرنا ایک بدعت کے مترادف ہے۔ آج کے دور میں تو زیادہ سے زیادہ یہ بات بامعنی مانی جاسکتی ہے کہ اگر ہم کہیں کہ ارتقاء مزید پیچیدگی اور تغیر پذیری کی طرف گامزن ہے مگر جیسا کہ ڈارون نے خود بھی لکھا ہے ارتقائی رو مزید پیچیدگی اور تغیر پذیری سے آگے گزشتہ انواع حیات میں موجود قسم سے ایک مختلف قسم کی حاجات' محرکات' امکانات اور صلاحیتوں کے ظہور تک بھی جاسکتی ہے۔(30)

توجہ واحساس کی تربیت:

توجہ کو کوئی قدر دی جانی چاہیے یا نہیں' یہ بنیادی سبق ہم زندگی کی بہت ابتداء میں سیکھتے ہیں۔جیسا کہ میں نے اپنی کتاب ''مستقبل کے بچے: 21ویں صدی میں شراکتی تعلیم کا خاکہ'' میں بھی یہ تجویز پیش کی ہے زندگی کے احساس...... یعنی اپنے' دوسروں کے اور اس مادرارض کے احساس...... کی تعلیم کو سکول سے لے کر کالج تک نصاب کا حصہ بنایا جانا چاہیے۔ اگر ٹی وی کی خبروں اور ویڈیو گیمز جیسی ان ''تفریحات'' سے پھیلائی جانے والی گندگی اور درندگی کے تناظر میں دیکھیں جن میں قتل و غارت اور عصمت دری کے مناظر ہر گھر میں ہر روز پہنچائے جاتے ہیں تو اس تعلیم کی ضرورت اور بھی شدت اختیار کر جاتی ہے۔(31)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ چونکہ نوع بشر سب سے آخر میں ظہور میں آئی ہے تو یہ ارتقاء کی معراج ہے اور اسے بقیہ تمام انواع ومخلوقات پر حکمرانی کا اختیار حاصل ہو گیا ہے اور نہ ہی اس کا یہ مطلب بنتا ہے کہ کائنات میں کوئی الوہی منصوبہ یا ذی عقل ارادہ کارفرما ہے۔ ہمارے پاس ایسا کوئی وسیلہ نہیں ہے جس سے ہم یہ جان سکیں کہ ارتقائی عمل کے پس پشت کیا ہے اور یہ صورتحال ایسے ہی رہے گی خواہ ہم سوچیں کہ ارتقاء کس خاص سمت میں گامزن ہے' خواہ ہم سوچیں کہ اس کی کوئی سمت نہیں تاہم ایک بات واضح طور پر دکھائی دیتی ہے اور وہ یہ کہ اس کرہ ارض پر زندگی نے جوں جوں اپنا ارتقائی سفر طے کیا توں توں اس میں آگہی' تخلیق' منصوبہ بندی اور انتخاب کی صلاحیت بڑھتی چلی گئی اور اگرچہ فقط ہم ہی ان اوصاف سے متصف نہیں، یہ اوصاف ہماری نوع میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل میں موجود ہیں۔

تاہم آیا یہ صلاحیتیں اظہار پاتی ہیں یا کہ نہیں، اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہم کس قسم کے معاشی و معاشرتی نظام تشکیل دیتے ہیں اور یہ چیز واقعی ہمیں ہمارے ارتقاء کے خالق کے مرتبے پر فائز کر دیتی ہے۔

لاریب ہم اپنے مستقبل کے متعلق ہر چیز کا تعین خود سے نہیں کر سکتے لیکن ہم سب باہم مل کر ایسے معاشی ومعاشرتی حالات ضرور پیدا کر سکتے ہیں جو منفی کی بجائے ہمارے مثبت جینیاتی اوصاف کے اظہار کو فروغ دیں۔ فی الاصل ان بے مثل حیاتیاتی اوصاف سے متصف ہونے کا مطلب ہے کہ یہ ہماری ارتقائی ذمہ داری ہے کہ ہم ان عطیات کو منفی کی بجائے مثبت طریقوں سے استعمال میں لائیں۔

امیبا اور پلانکٹن سے لے کر ہاتھیوں اور وھیلوں تک چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی تمام انواع حیات نے ہمارے اس سیارے میں کچھ نہ کچھ تبدیلی پیدا کی ہے۔ بعض تو محض اس ارتقائی منظرنامے میں ظہور پذیر ہو کر اس تبدیلی کا باعث بنیں اور دیگر ظہور پذیر ہو کر مزید نئی چیزوں کو ظہور میں لائیں مثلاً پرندے گھونسلے بناتے ہیں اور لدھر پشتے تعمیر کرتے ہیں لیکن ہم انسانوں نے جو تخلیق کر دیا ہے دیگر کوئی نوع اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتی۔

ہم نے اپنے تخیل اور اپنے تصورات کو حقیقت میں ڈھالنے کی صلاحیت کے استعمال سے ایک بالکل نیا، انسان ساختہ جہان تخلیق کر کے رکھ دیا ہے۔ ہماری بعض تخلیقات تو بہت ہی محیر العقول اور غیر معمولی ہیں۔ ایسی بلند وبالا عمارات کہ پہاڑ بھی انھیں دیکھ کر شرمانے لگیں'

ایسے ایسے ہوائی جہاز کہ کوئی پکھیرو بھی ان کی پرواز کو نہ پہنچ سکے اور حرفتیں ایسی کے جو ذرے کے دل میں چھپے راز بھی فاش کر ڈالیں' فضا و خلا کو کھنگال ڈالیں اور دماغ کی بھول بھلیوں میں چھپے رازوں کو بھی بے نقاب کر ڈالیں۔ ان میں سے بعض چیزیں تو بہت خوبصورت ہیں مثلاً موسیقی' شاعری اور مصوری لیکن ان میں سے بعض بہت گھناؤنی اور وحشت انگیز ہیں مثلاً گیس چیمبر' عقوبت خانے' ایٹم بم اور لمحوں میں وسیع پیمانے پر ہلاکت پھیلانے والے غیر مرئی حیاتیاتی ہتھیار۔

صاحبو آج ہم اس کرۂ ارض پر اپنی انسانی ایڈونچر کے ایک ارتقائی دوراہے پر کھڑے ہیں۔ ہم اس دنیا کو اس کے حال پر بھی چھوڑ سکتے ہیں کہ جو ہوتا ہے جیسے ہوتا ہے ہوتا رہے...... گرچہ سائنس اور ہماری ذکاوت فطری ہمیں بتائے دیتی ہے کہ ہائی ٹیکنالوجی اور تسلط و تسخیر کی اقدار کا یہ آمیزہ ہمیں ہمارے ارتقائی انجام تک پہنچا سکتا ہے یا پھر ہم ارتقاء کے ودیعت کرہ عظیم عطیات کو کام میں لاتے ہوئے ایک نئی معاشی حکایت اور حقیقت بھی تخلیق کر سکتے ہیں...... یعنی ایک ایسی متوجہ معاشیات بھی استوار کر سکتے ہیں کہ جو انسانی بقاء کی ضامن ہو اور انسانی نشوونما کو بھی فروغ دے۔ ایک ایسی دنیا کا تصور کرنا ہمارے اختیار میں ہے کہ جس کی ہم اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے آرزو کرتے ہیں ہم میں سے اکثر افراد کے لیے یہ ایک ایسی دنیا ہے جہاں روٹی' کپڑے' مکان اور تحفظ کی ہماری بنیادی ضروریات نیز ہماری محبت و شفقت' امن و عدل اور اس احساس کی آرزوئیں پوری ہو سکیں کہ ہم جو کرتے ہیں وہ بامعنی ہے اور اس سے دوسروں کا اور ہمارا اپنا بھلا ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ ایک ایسی دنیا ہے جہاں ہمارے بچے خوشی سے جی سکیں اور پھل پھول سکیں۔

اب یہ ہم پر ہے کہ ہم ایسے حالات پیدا کریں کہ جس سے یہ خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے۔ ہمیں قدرت نے ایک حیرت انگیز دماغ' محبت کی فراوان صلاحیت' زبردست تخلیقی قوت اور سیکھنے' بولنے' بڑھنے اور تدبیر کرنے کی بے مثل صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اگر ہم عمل کا عزم کر لیں تو ہم ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایسے معاشی و معاشرتی نظام تخلیق کر سکتے ہیں جن سے ہم ارتقاء سے ملنے والے عظیم عطیات کی آبیاری کر سکیں۔

حرف تشکر

یہ کتاب درحقیقت ایک اجتماعی کوشش کا ثمر ہے اور میں ان تمام دوستوں کی تہہ دل سے ممنون ہوں جنھوں نے اس کی تکمیل میں مجھے اپنی مدد اور تعاون سے نوازا۔

سب سے پہلے میں بیرٹ کوہلر کے باکمال لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ میرا اس کتاب کے مدیر سٹیو پیئر سانتی کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ بہت خوشگوار رہا۔ ان کا یقین و اعتماد اس پراجیکٹ میں بہت کام آیا اور ان کے اچھوتے خیالات نے اس تصنیف میں وزن اور دلکشی پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ جیون سبرانیم صاحب کی محبت اور دل جوئی کو میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ اس تصنیف کی تزئین و آرائش کے سلسلے میں ڈائن پلیٹر کی تخلیقی کاوشیں بھی قابل ستائش ہیں۔ اس کے علاوہ میں لنڈا جیوپیٹر، جیمز میکس ویل اور نومی شف کے اس کتاب کے ڈیزائن، کیرن کے سرورق اور سانڈرا بیرس کے تدوین کاری ہیزی بین سسن کے پروف ریڈنگ اور میڈیا مینک کے اشاریے کے سلسلے میں سرانجام دیے گئے تخلیقی کام کو بھی سراہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں اس فرم کے شعبہ مارکیٹنگ کے عملے کے معزز اراکین ماریا جیسس آرگلو آئن باخ، مارینہ کک، مائیکل کراوَلے، رابن ڈونووان، کرسٹن فرانٹز، ٹفنی لی، کیتھرین لینگرون اور کین لپوف کی بھی ازحد مشکور ہوں۔

علاوہ ازیں میں اپنی ادبی ایجنٹ ایلن لیوائن اور اس کی معاون الانہ ریمائرز نیز کلئر رابرٹس اور ٹرائیڈنٹ میڈیا میں کام کرنے والے دیگر خواتین و حضرات کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنھوں نے اس کتاب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے انتہائی لگن اور جانفشانی سے کام کیا۔

MashalBooks.com

میرے میاں ڈیوڈ لوئے نے بھی ہمیشہ کی طرح میری بڑی مدد کی۔ ان سے مجھے بڑی زبردست معلومات ملیں اور ادارت کے سلسلے میں بھی انھوں نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا۔ میری بچی اینڈ ویا آ ئزلر کو قدرت نے بہت طباعی اور تخلیقی قوتوں سے نوازا ہے۔ اس نے بھی ادارتی مشیر کے طور پر بہت خوب ساتھ نبھایا۔ میری دوسری بیٹی لورین ایلیس نے بھی بڑے اچھے مشورے اور صلاحیں دیں۔ یہاں میں اپنی معاون خاص لیہہ گاوَران کا ذکر بھی خاص طور پر کرنا چاہوں گی۔ ان کا تعاون میرے اور ڈیوڈ کے ہر کام میں ہمارے ساتھ ساتھ ہوتا ہے اور یہ محض ان کی شفقتوں کی بدولت ہی ہے کہ ہم اپنی زندگی اور اپنے گھر کی فکروں سے آزاد ہو کر اپنے تخلیقی کاموں پر توجہ مرکوز کر پاتے ہیں۔

میں جوش بلائیونز' ہیلن نوڈ' ڈیوڈ کورٹن' جیف کولک' پیٹر میسَر ڈوم' جولی نیلسن' نیل ناڈنگز' پیٹرک اوہیفر نان' باربراسٹین برج اور مال وارک کی بھی بہت شکرگزار ہوں جنھوں نے پورے مسودے کو ورق بہ ورق انتہائی غور سے پڑھا اور پھر مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ میں ان دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنھوں نے اس کتاب کو پڑھا اور پھر مجھے اپنے خیالات اور تجاویز سے مستفید کیا۔ ان میں یہ افراد شامل ہیں: لورالی ایلبن' چندرا الیگزینڈر' ڈاوَگ اوٹن ریتھ' چارلن بیلزؤ ماریانہ بوزسان' ہلاری بریڈ بیری' سینڈی برڈ' ایڈگر کان' سوزن کارٹر' نینسی فولبر' باب گراہم' کرسٹن گرے' ہیڈی ہارٹمین' ہیذل ہینڈرسن' میٹ ہڈسن' سلویا جانس' مارا کیلر' میتھیو کنگ' مارسی کوبلینز' ریکیو لالینج مین' ٹریسی لیٹن' ایلکس لوب' ڈیبرہ نیلسن' گینا اوگڈن' جوزف چلتن پیئرس' رسل پریشکس' مارٹن راچ' ایلن روزن بلتھ' باربرا شیفر اور سونا یمانز۔

مزید برآں تحقیق کے دوران میری مدد کرنے پر میں سٹوارٹ سلورسٹون کی بھی بہت ممنون ہوں۔ اس تحقیق کے سلسلے میں دیگر لائبریرینز مثلاً وکٹر ہنری' ڈاگ ہولزمین' جو جانسن' انگالیبون' جون مے برج مکونل' سٹیو پارکر' ڈیبی ریگن' جینس راڈمین نے بھی بہت تعاون کیا۔

آخر میں میں کیلی اوپیا فاوَنڈیشن کے بورڈ اور عملے کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جن کی فراخدلانہ مالی معاونت نے اس تحقیق اور تحریر کو ممکن بنایا۔

مصنفہ کا تعارف

ریان آئسلر ایک ممتاز ماہر عمرانیات، وکیل اور سماجی کارکن ہیں۔ انھوں نے زیادہ نام اپنی بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے والی کتاب ''کاسہ اور برچھی: ہماری تاریخ، ہمارا مستقبل'' سے کمایا جسے پرنسٹن یونیورسٹی کے معروف ماہر بشریات ایشلے مونٹاگ نے ڈارون کی ''ابتدائے انواع'' کے بعد اہم ترین کتاب قرار دیا ہے جبکہ ناول نگار آئزابیل آئینڈے اس کے بارے میں کہتی ہیں کہ ''یہ ان شاندار اور اہم کتب میں سے ہے جو ہماری کایا کلپ کرنے کی صلاحیت کی حامل ہیں۔'' یہ 30 ہزار سالہ طویل عرصے پر پھیلی انسانی ثقافتوں پر علمی تحقیقات کے نتائج پر مبنی آئزلر کی پہلی تصنیف تھی۔ اس کتاب کا اب تک دنیا کی بائیس زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ جن میں یورپ کی بیشتر زبانیں نیز عربی، چینی، روسی، کوری، عبرانی اور جاپانی شامل ہیں۔

آئسلر ویانا میں پیدا ہوئی جہاں سے اسے نازیوں کے خوف سے اپنے والدین کے ساتھ فرار ہو کر کیوبا آنا پڑا۔ بعدازاں اس نے امریکہ منتقل ہو کر وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ انھوں نے کیلیفورنیا یونیورسٹی سے عمرانیات اور قانون میں ڈگریاں حاصل کیں اور بعد میں UCLA میں 'عورت اور قانون' کی افتتاحیہ کلاسوں میں تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ وہ تنظیم برائے ارتقائے نامہ اور اتحاد برائے متوجہ معاشیات کی بانی رکن، عالمی اکادمی برائے سائنس وفنون اور عالمی اکادمی برائے تجارت کی فیلو ہیں۔ نیز انھیں آرچ بشپ ڈیسمنڈ ٹوٹو، دلائی لامہ اور دیگر ایسی مذہبی و روحانی ہستیوں کے ساتھ عالمی کمیشن برائے شعور و روحانیت کی کمشنر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ وہ روحانی اتحاد برائے انسداد تشدد قرابت داراں کے بانیوں میں شامل ہیں اور اس کے علاوہ وہ مرکز برائے مطالعات مشارکت کی صدر نشین ہیں جس نے تعلیم و تحقیق کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے۔

MashalBooks.com

آئسلر کو اب تک بہت سے اعزازات مل چکے ہیں۔ ایک ثقافتی مورخ اور ارتقائی اصول دان کے طور پر ان کے کام کی دُور رَس اہمیت کے اعتراف میں انھیں دنیا کے ان بائیس عظیم مفکرین میں شامل کیا گیا ہے جنھیں Macrohistory and Macrohistorians میں شامل کرنے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ وہ ان بائیس ستاروں کی کہکشاں میں شامل واحد خاتون مفکر ہیں۔ بقیہ اکیس مفکرین میں ہیگل، ایڈم سمتھ، مارکس اور ٹوائن بی جیسی ہستیاں شامل ہیں۔

آئسلر کی تصنیفات میں انعام یافتہ ''شراکت کی قوت'' اور ''مستقبل کے بچے'' شامل ہے۔ ان کی ایک دوسری تصنیف ''مقدس مسرت'' میں جنسیت اور روحانیت کا بڑے جرات مندانہ طریقے سے ازسرنو جائزہ لیا گیا ہے۔ ''خواتین و حضرات اور عالمی معیار زندگی'' میں شماریاتی منہاج کو استعمال کرتے ہوئے کسی قوم کے عام معیار زندگی میں خواتین کے معاشرتی مرتبہ و حیثیت کے کلیدی کردار کی بابت بحث کی گئی ہے۔ علاوہ بریں وہ ''اطواری سائنس'' ''مستقبلات'' ''سیاسی نفسیات'' اور ''یونیسکو کوریئر'' سے لے کر ذہن و دماغ ''ہاں!'' ''سہ ماہی حقوق انسانی'' ''عالمی جریدہ برائے مطالعات نسواں'' اور ''عالمی دائرہ معارف برائے امن'' تک جیسے جیسے جرائد و اشاعات میں دوسو سے زائد مضامین و مقالات تحریر کر چکی ہیں۔

آئسلر کو دنیا بھر میں اہم نوعیت کی کانفرنسوں اور مذاکروں میں مدعو کیا جاتا ہے اور وہ اپنی تحاریر میں متعارف کردہ شراکتی نظام کے اطلاق کے سلسلے میں حکومتی اور تجارتی اداروں کی مشاورت کی خدمات بھی سرانجام دیتی ہیں۔ وہ جرمن پارلیمان کی صدر پروفیسر ریٹا سوئس متھ اور ولکس ویگن انٹرنیشنل کے سربراہ ڈینیئل گوودورت کی دعوت پر جرمنی کا' یونانی خاتون اول مارگریٹا پاپا ندریو کی دعوت پر یونان کا' یوگوٹا کے میئر کی دعوت پر کولمبیا کا اور صدر واکلاف ہیول کی دعوت پر عوامی جمہوریہ چیک کا دورہ کر چکی ہیں۔ ان کی طرف سے حقوق انسانی کے سلسلے میں کی گئی جدوجہد نے بین لاقوامی تنظیموں کے حیطہ نظر میں وسعت پیدا کر کے اس میں بچوں اور عورتوں کے حقوق سے متعلقہ معاملات کو بھی شامل کیا ہے۔ اقتصادیات سے متعلقہ ان کی تحاریر و تحقیقات نے حکومتی اور کاروباری دنیا میں ایک جدید اور ہمہ گیر سانچے کو متعارف کرایا ہے۔ ان کی تحقیق نے عمرانیات' تاریخ' تعلیم و تربیت اور ارتقائی سائنس کے بشمول بہت سے

علمی شعبوں کو متاثر کیا ہے اور ان کی کتب بہت سی دانش گاہوں کے نصاب میں شامل ہیں۔

ریان آئسلر ایک اہل نظر نتائجیت پسند کے طور پر پورے عالم میں معروف ہیں۔ انھوں نے اپنی تحاریر و تقاریر اور سیادت و قیادت سے دنیا بھر کے لوگوں کے قلوب و اذہان پر اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان کی تازہ ترین تصنیف ''اصل دولت اقوام: حساس معاشیات کی تخلیق'' میں ایک ایسے جدید معاشی نظام کے تصور کو متعارف کرایا گیا ہے جو انسانوں اور کرہ ارض پر توجہ و نگہداشت کے اہم ترین انسانی کام کی قدر افزائی کرتا ہے۔

ریان آئزلر سے Centre@partenershipway.org یا www.realwealthbook.net کے ذریعے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

MashalBooks.com

مرکز برائے مطالعات مشارکت

مرکز برائے مطالعات مشارکت امریکہ میں قائم عوامی خدمت کا ایک ادارہ ہے جو خاندان اور درسگاہ سے لے کر معاشیات سے سیاست تک تمام شعبہ ہائے حیات میں تسلط سے مشارکت کی جانب سفر کی حوصلہ افزائی کے لیے ہر طرح کی علمی' معلوماتی اور نظریاتی معاونت فراہم کرتا ہے۔ 1987ء میں اپنے قیام سے لے کر اب تک یہ ادارہ افرادی اور تنظیمی سطح پر شعوری انقلاب پیدا کرنے' مثبت شخص عمل کو فروغ دینے' سماجی جدوجہد کی حوصلہ افزائی کرنے اور سرکاری و کاروباری پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کے سلسلے میں حتیٰ المقدور مساعیاں سرانجام دیتا چلا آ رہا ہے۔ اس کے بہت سے منصوبہ جات کا مرکز و محور عورتوں اور مردوں کے مابین مساوی مشارکت کی ترویج ہے جسے اس کے اراکین شراکتی نظام کا ایک کلیدی جزو تصور کرتے ہیں اور اس کے تمام منصوبے فطرت کے ساتھ ہم آہنگی' عدم تشدد اور جنسی و نسلی اور معاشی عدل پر مبنی طرز زندگی کے پرچارک ہیں۔ مرکز کے چند حالیہ منصوبے مرقوم الذیل ہیں:

روحانی اتحاد برائے انسداد تشدد قرابت داروں:

اس تنظیم کا مقصد خواتین اور بچوں پر تشدد کے خاتمے کو سماجی' مذہبی اور سیاسی ترجیح اولیٰ کی حیثیت دلوانا ہے۔ اس تنظیم کی مجلس ناظمہ میں نوبل انعام یافتہ آرچ بشپ ٹوٹو اور بیٹی ولیمز اردن کی ملکہ نور اور شہزادہ حسن بن طلال' ایلا گاندھی' جین گڈال' دیپک چوپڑہ' رابرٹ ملر اور دیگر عالمی زعماء و عمائدین شامل ہیں۔ یہ ادارہ افریقہ' ایشیا' لاطینی امریکہ اور مشرق وسطیٰ میں کام کرنے والی تنظیموں کو مالی امداد فراہم کرتا ہے اور اپنی سی ڈی اور ویب سائٹ (www.saiv.net) کے ذریعے انسداد تشدد سے متعلقہ وسائل کی اشاعت کرتا ہے۔

ایجنڈا برائے متوجہ عائلی پالیسی:

یہ ذیلی تنظیم درج ذیل پالیسیوں کی محرک ہے:

حقوق اطفال کا مسودہ قانون جس میں شفقت، دیکھ بھال، تغذیہ، تعلیم، علاج، تشدد سے تحفظ اور صاف ستھرے ماحول کا حق شامل ہے۔

مشارکت، احترام باہمی، عدم تشدد اور توجہ و نگہداشت کی قدر افزائی پر مبنی متوجہ عائلی اقدار۔

صحت مند و خوشحال کنبوں اور صحت مند و خوشحال بعد الصنعتی معیشت کے لیے درکار ''خاندان دوست حکومتیں، دفاتر اور کارخانے۔''

انجمن برائے متوجہ معاشیات:

اس ذیلی تنظیم کا مقصد ارباب اختیار کو مشارکتی معاشیات کی طرف راغب کرنا ہے جو توجہ و نگہداشت کو مناسب قدر و جزا تفویض کرے اور سب سے پہلے معاشی پیداواری مقیاسات کو تبدیل کر کے ان میں متذکرہ اہم سماجی وظیفے کو شامل کرنے پر توجہ دے۔

مرکز برائے مطالعات مشارکت کے متعلق مزید معلومات مرکز سے شائع شدہ مضامین و مقالات اور وسائل کے مطالعے اور یہ جاننے کے لیے کہ آپ اس ادارے کی معاونت کیسے کر سکتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

www.partenershipfway.org

اگر آپ کوئی مشارکتی مباحثی حلقہ یا اپنے علاقے میں کوئی مشارکتی مرکز تشکیل دینا چاہتے ہیں یا مرکز کے مقررین میں سے کسی سے رابطہ کرنا چاہتے ہیں تو وہ بھی آپ اسی ویب سائٹ کی وساطت کہہ سکتے ہیں۔

. . .

MashalBooks.com

End of Page No.344

پہلا پروف، فائل چیک ہو چکی ہے۔حافظ محمد ناصر رشید۔25دسمبر2008ء
دوسرا پروف، فائل چیک ہو چکی ہے۔عاصم۔21جنوری2009ء

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com